زندہ کتابیں سلسلہ نمبر-109
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company
فضل احمد کریم فضلی
خون جگر ہونے تک
پیشکش و اہتمام: راشد اشرف

زندہ کتابیں۔ سلسلہ نمبر: 109

خون جگر ہونے تک

(ناول)

فضل احمد کریم فضلی

ساقی ادب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

اہتمام و پیشکش
راشد اشرف

جملہ حقوق محفوظ

Engineer Rashid Ashraf
Gulshan-e-Iqbal, Karachi
www.kitaabistan.com

کتاب : خون جگر ہونے تک

اشاعت : جنوری 2021

قیمت : 1500 روپے

تقسیم کار

اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی۔ دنیا بھر میں ترسیل کے لیے 021-32581720/0300-2472238

فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی 0335-3252374/021-32629724

کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور 042-37239884/0300-9404174

ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی 021-32639581/32633151

فرید پبلشرز، اردو بازار کراچی 0313-2800052/0345-2360378

گفتگو پبلی کیشنز، اسلام آباد/ راول پنڈی 0300-4988123

فکشن ہاؤس، لاہور 0333-2886597

کتاب نگر، ملتان کینٹ 0336-0657291

فضلی سنز، اردو بازار کراچی

0305 6406067
PDF Book Company

انتساب منجانب مرتب

والد صاحب (محمد سلیم اشرف مرحوم) اور
والدہ صاحبہ (رابعہ سلیم)
کے نام

☆☆☆

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

مصنف کے فرزند جناب رحمت کریم فضلی کے نام جن کا
تعاون اور حوصلہ افزائی شاملِ حال رہی

خصوصی شکریہ:

زیرِ نظر کتابوں کے مختلف اشاعتی مراحل کے دوران راقم کو جن قابلِ احترام شخصیات نے اپنے علمی تعاون اور مشوروں سے نوازا، ان کے نام یہاں درج کیے جاتے ہیں:

- جناب رحمت کریم فضلی، کراچی
- ذنوبیہ الیاس، کراچی
- سمیر وہاج (مصنف کے نواسے)
- ڈاکٹر پرویز حیدر، لاہور
- جناب وسیم رضا، نیوجرسی
- جناب امین ترمذی

☆=☆

چند باتیں

زندہ کتابیں سلسلے کی یہ 109 ویں کتاب ہے۔

☆÷☆

میں یہاں جناب عزیز ابن الحسن کا لکھا ایک تعارف ان کی اجازت سے نقل کر رہا ہوں۔اس میں میرے مربی ڈاکٹر خورشید عبداللہ کا تذکرہ بھی ہے۔''خون جگر ہونے تک'' کے لیے علاحدہ سے کچھ لکھنا اس لیے ضروری نہیں سمجھتا کہ درج ذیل تبصرہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔

عزیز صاحب رقم طراز ہیں:

دل کا کیا رنگ کروں

محترم ڈاکٹر خورشید عبداللہ نے ہفتے بھر تک کوئی ایک کتاب منتخب کر کے اس کا سرورق پیش کرنے کا جو نہایت دلچسپ سلسلہ شروع کیا ہے اس کی ایک افادیت یہ ہے کہ وہ بھولی بسری کتابیں جنہوں نے ایک زمانے میں بیحد متاثر کیا تھا پھر سے سامنے آجاتی جا رہی ہیں اور ان کے ساتھ وابستہ بہت سی باتیں اور دلچسپ واقعات ذہن میں تازہ ہو رہے ہیں۔میں اپنی کتابوں کی بعض ایسی الماریوں میں تا دیر سرگرداں رہا جن کی طرف لوٹنے کا موقع اب کافی عرصے سے کم نکلتا ہے۔ان کتابوں کی گرد جھاڑتا رہا جو مدت سے نہیں دیکھیں تھی مگر اپنے اپنے وقت میں جنہوں نے کئی کئی دنوں تک اسیر کیے رکھا تھا۔میں کسی صاف ستھری کتاب کی تلاش میں تھا کہ جس کے سرورق کی تصویر لگا سکوں اور ایسی بہت سی کتابیں سامنے آئیں بھی مگر ہر پھر کر نظر ایک پرانی بوسیدہ سی کتاب پر رک جاتی جو لاہور میں پرانی کتابوں کے قدم رستے سے خریدی تھی۔کتاب کا سرورق خریدتے وقت ہی سے غائب تھا مگر کتاب ایسی تھی کہ اُسی روز پڑھنا شروع کر دی اور ختم کیے بنا ہاتھ سے رکھی ہی نہیں گئی تھی۔

''خونِ جگر ہونے تک'' کے مصنف فضل احمد کریم فضلی 1906 میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔1926ء میں ایونگ کرسچین کالج الہ آباد سے انٹر اور پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند

حاصل کی۔ 1930ء میں کلکٹری اور آئی سی ایس کے امتحانات دیے۔ آئی سی ایس کے امتحان میں وہ تیسرے نمبر پر رہے۔ اس کے بعد تربیت کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی بھیج دیے گئے۔ وہاں انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے The Original Development of Persian Ghazal پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

لندن سے واپسی پر بنگال میں ان کی تعیناتی ہوئی جہاں وہ بیس سال رہے۔ انہوں نے بنگالی زبان بھی سیکھی۔ وہ سیکریٹری محکمہ تعلیمات مشرقی پاکستان رہے۔ کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر خورشید عبداللہ نے فضلی کی اپنی آواز میں ان کے حالاتِ زندگی اور کچھ غزلیں فیس بک پر پیش کی تھیں۔

فضلی نے شاعری بھی کی فلمیں بھی بنائیں دو تین ناول بھی لکھے لیکن ان کا زیادہ نام ان کے ناول ''خونِ جگر ہونے تک'' سے ہوا۔ لیکن پھر بھی معلوم نہیں کیوں یہ ناول جس توجہ کا مستحق تھا اردو فکشن کی تاریخ اور نقادوں کی نظر میں اسے وہ مقام ملا نہیں۔ میں نے یہ ناول ۲۸ برس پہلے پڑھا تھا مگر اس کے بعض مناظر کی ہولناکی آج بھی لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ قحطِ بنگال کے آنکھوں دیکھے سچے واقعات کو مصنف نے چند حقیقی کرداروں اور اصل مقامات و سانحات کی جزیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آج ۲۸ برس بعد بھی انہیں پڑھنے کے دوران والی اپنی اُس حالت کو یاد کرتا ہوں تو آج بھی جھرجھری سی آجاتی ہے۔

ہندوستان میں پڑنے والے بڑے بڑے قحطوں میں خطۂ بنگال کے قحط جہاں ایک طرف نظامِ قدرت پر مجھ ایسے کمزور انسان کے ایمان کے لیے آزمائش بنتے ہیں وہاں اس وقت کی سب سے بڑی روشن خیال ترقی یافتہ اور انسانی حقوق کی علمبردار قوم کی سفاک سیاست گردی کو بھی ہمارے سامنے بے نقاب کرتے ہیں۔ بنگال میں لاکھوں لوگ قحط سے مر رہے تھے اور عین ان بھوکے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے سے انگریز ہندوستان سے گندم اور غلے کے جہاز بھر بھر کر انگلستان کے گوداموں میں لے جا رہے تھے تاکہ اگلے ایک آدھ سال میں کسی دوسرے ملک سے ممکنہ جنگ کی صورت میں اس کے سپاہیوں کے لیے راشن وافر مقدار میں دستیاب رہے۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ناول نگار نے اپنے ناول میں یہ سب بھی لکھا ہے مگر جس زمانے کے قحط کے انسانی المیے کی داستان اس ناول میں بیان ہوء ہے وہ انگریز کی عملداری کا وہی دور ہے جب

بنگال کے قحط میں مرنے والے انسانوں کا ذکر چرچل کے سامنے کیا گیا تو اس نے نہایت قساوت سے کہا تھا کہ اگر مہاتما گاندھی نہیں مرا تو میں کیسے مان لوں کہ ہندوستان میں قحط پڑا ہے۔

فضل احمد کریم فضلی نے بنگال میں اپنی تعیناتی کے دوران تاریخ کے بدترین قحط میں مرگ انبوہ جشنے دارد کے بہت سے مناظر دیکھے۔ عورتوں مردوں اور بچوں کو موت کے منہ میں جاتے اور اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر اپنے جیسے ہی دوسرے انسانوں سے خوراک چھینتے اور انہیں مارنے کے جو واقعات دیکھے اور ناول میں سے کچھ کو اپنے عمومی رومانوی انداز کے برعکس ایک حقیقت نگار قلم سے ''خونِ جگر ہونے تک'' میں لکھا ہے۔

قحط کے دوران زندگی کی گرانی اور موت کی فراوانی میں ایک مقام وہ آتا ہے جب زندگی امکانی اور موت یقینی نظر آنے لگتی ہے۔ تب انسان کے پاس صرف آسان موت ہی ایک آخری خواہش رہ جاتی ہے۔

ایک مقام پر بھوک کے ہاتھوں پریشان لوگ غلے کے گودام پر صرف اس لیے حملہ کرنے کا پروگرام بناتے ہیں کہ ان کے خیال میں بھوک سے سسکتے ہوئے مرنے کا بجائے گودام کے محافظوں کی گولیوں سے مرنا آسان ہوگا۔ لیکن جب گولیوں کی باڑھ سے اپنے ساتھیوں کی بھوکی لاشیں گرتے دیکھتے ہیں تو واپس بھاگ پڑتے ہیں کہ نہیں...... نہیں... یہ موت زیادہ مشکل ہے اس طرح مرنے کی نسبت بھوک سے مرجانا زیادہ بہتر ہے...... یوں آسان موت کی آرزو میں بھٹکتے دیہاتی زندہ رہنے کی جبلت کے مجبور ہو کر دوبارہ بھوکی موت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔

سسک سسک کر مرنے کے انتظار میں پڑے انسانوں کا ایک ایسا ہی دہلا دینے والے منظر دیکھے۔ جس میں کچھ شرارتی لونڈے ہلڑ مچاتے بھوک سے مرتے ہوئے بوڑھے اور اس کے بچے کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کے زندہ یا مردہ ہونے کا اندازہ لگا رہے ہیں:

> چند آٹھ دس برس کے لونڈے آئے، کچھ خود قحط زدہ تھے، ہاتھوں میں برتن لیے کھچڑی لانے جا رہے تھے، کچھ محض تماشہ دیکھنے نکلے تھے، جمعدار صاحب کو دیکھ کے بولے ''بڈھا مر گیا''۔ ایک لونڈے نے بانس کی پتلی چھڑی سے جمعدار صاحب کو گودا۔

پھول محمد کے کچھ ہونٹ ہلے جیسے کہہ رہا ہے ''اے کیا کر رہے ہو۔ جانتے نہیں چاچا ہیں...... جمعدار صاحب''۔ ایک لونڈا پاس بیٹھ کے جمعدار صاحب کی کھلی ہوئی آنکھوں میں تنکا گھسیڑنے لگا۔ جمعدار صاحب کی پلک ذرا سی جھپکی اور کچھ قطرے ٹپک گئے۔ لونڈا اچلایا ''ارے بڈھا ابھی تک مرا نہیں۔''

دوسرے نے کہا ''نہیں مر گیا۔''

پہلا بولا ''نہیں مرا، یہ دیکھونا۔''

دوسرے لونڈے نے بھی آنکھ میں تنکا گھسیڑا، پلکیں پھر ہلیں، قطرے پھر ٹپکے۔

پہلے لونڈے نے تالی بجائی ''دیکھا کہیں بڈھا مرا ہے؟ ہم کہتے تھے نا؟''

ایک لونڈے نے کہا ''آؤ بڈھے کے مرنے کا تماشہ دیکھیں۔''

دوسرے چلائے...... ''ہاں جی ہاں۔''

ایک لونڈے کی آواز آئی: ''ارے یہ دیکھو یہ لونڈا کیسا بیٹھا ہوا ہے، پیڑ میں ٹیک لگائے، کچھ بولتا نہیں، بس دیکھے جا رہا ہے۔''

کچھ لونڈے اُدھر گئے، لونڈوں کی رائے ہوئی پھول محمد کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر ڈولی ڈولی کھیلیں۔ ہاتھ پاؤں پکڑنے ہی کو تھے کہ لانچ کے چنگھاڑنے کی آواز آئی، لونڈے ''نالچ نالچ، موزید شاب جندہ باد۔'' چیختے ہوئے لانچ کی طرف دوڑے، پھول محمد کے ہونٹ ہلے، جیسے وہ بھی ''نالچ نالچ'' کہہ رہا ہو۔

☆

میرے پاس اس ناول کا پہلا ایڈیشن ہے جو 1957 میں لندن سے کسی محمد شفیع خوشنویس کی انتہائی نفیس کتابت میں شائع ہوا تھا۔ ناول کے آخر پانچ صفحات پر مصنف کے اپنے انتہائی خوبصورت خط میں ناول کے لکھے جانے کا پس منظر بیان ہوا ہے۔

کتاب کے آخری صفحے پر یہ انگریزی فقرہ درج ہے:

Printed in Great Britain by Lowe and
Brydone(printers) Limited, London, N. W. 10

فضل احمد کریم فضلی کا انتقال ۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ء کو ہوا۔

میں مصنف کے فرزند جناب رحمت کریم فضلی کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے ''زندہ کتابیں'' کے تحت اس کتاب کی اشاعت کی تحریری اجازت دی۔ فضلی سنز کے ساجد فضلی صاحب کی خاص توجہ بھی اس ناول کی اشاعت پر مرکوز رہی۔ اس اہم ناول کو شائع کرنے کی تجویز ساجد صاحب ہی نے پیش کی تھی۔

زیرِ نظر ناول میں یونس ہمدم صاحب کا ایک معلوماتی اور بے حد دلچسپ کالم ''طلسمی دنیا کے فضلی برادران'' خصوصی طور پر شامل کیا گیا ہے۔ امید ہے آپ اس سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔

انجینئر راشد اشرف، کراچی۔ جنوری ۲۰۲۱ء

zest70pk@gmail.com/ zest70pk@yahoo.com

طلسمی دنیا کے فضلی برادران

یونس ہمدم

برصغیر ہندوستان اور پاکستان میں بہت سے ایسے مسلم برادران منظر عام پر آئے تھے جن کا فن اور جن کی بے پناہ صلاحیتیں ان کی شخصیت کو سنوارنے کا باعث بنیں پھر وہ شخصیات بام عروج کو پہنچیں۔

زندگی کے ہر شعبے میں ان برادران نے بڑا نام کمایا، جیسے کہ فن پہلوانی میں بھولو برادران، فن سارنگی نوازی میں بندو خان برادران، فن قوالی میں صابری برادران، کرکٹ کے کھیل میں حنیف برادران، اسکواش میں خان برادران، ادب میں قاسمی برادران، اداکاری میں سنتوش کمار برادران، کلاسیکی گائیکی میں نزاکت سلامت برادران، غزل کی گائیکی میں اسد امانت برادران، فلمی موسیقی میں طافو برادران، فلمی شاعری میں فاضلی برادران اور فلم سازی و ہدایت کاری میں فضلی برادران جنھوں نے فلم انڈسٹری میں چاہے وہ انڈیا کی ہو یا پاکستان کی بڑا نام کمایا اور فلم انڈسٹری میں ایک تاریخ رقم کی۔

آج میرے کالم کی شخصیت فضلی برادران ہیں پہلے میں سبطین فضلی اور حسنین فضلی کی شخصیت پر روشنی ڈالوں گا یہ فضلی برادران غیر منقسم ہندوستان اور پھر پاکستان فلم انڈسٹری کا ایک روشن باب رہے ہیں، فضلی برادران الٰہ آباد کے علاقے اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام سید فضل رب تھا اور یہ خان بہادر کہلاتے تھے اور یہ شعر و ادب کے بھی بڑے شیدائی تھے۔ سبطین فضلی اور حسنین فضلی جب شعور کی عمر کو پہنچے تو انھیں بھی شعر و ادب سے دلچسپی پیدا ہوتی گئی دونوں بھائی اپنے والد کے نام فضل کی مناسبت فضلی ہوتے چلے گئے اور پھر دونوں بھائیوں کے ساتھ فضلی ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ دونوں بھائیوں میں فنون لطیفہ میں کچھ کر دکھانے کے جذبے نے جنم لیا اور پھر یہ اعظم

گڑھ سے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر کلکتہ کی فلم انڈسٹری کی طرف نکل گئے۔

ان دنوں کلکتہ اور بمبئی دونوں فلم انڈسٹری کا مرکز تھے، دونوں بھائی انتہائی ذہین اور بڑے محنتی تھے دیکھتے ہی دیکھتے کلکتہ کی فلم انڈسٹری میں اپنی چھاپ قائم کرتے چلے گئے۔ فضلی برادران کے نام سے فلمسازی اور ہدایت کاری کے میدان میں اترے اور پہلے کلکتہ کی فلم انڈسٹری اور پھر بمبئی کی فلم انڈسٹری میں فضلی برادران کے نام کے ڈنکے بجنے لگے۔ دونوں بھائیوں نے مل کر مسلم سوشل فلموں میں اپنی شخصیت منوائی اور فضلی برادران کے بینر پر بہت سی فلمیں پروڈیوس کیں جنھیں کامیابی نصیب ہوئی اور سارے ہندوستان میں ان کی مسلم سوشل فلموں نے ایک دھوم مچادی تھی۔

1940ء سے لے کر 1950ء تک ان کی فلمیں مقبولیت حاصل کرتی رہیں اس دوران کی بنائی ہوئی فلموں میں معصوم، مہندی، قیدی، شمع، دل، دنیا اور عصمت نے فلم بینوں کے دلوں پر بڑے گہرے نقوش چھوڑے تھے پھر جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا، ہندوستان اور پاکستان دو ملکوں میں بٹ گئے تو ہندوستان میں مسلم سوشل فلموں کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں اور مسلمان فنکاروں کو تعصب کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ یہ صورت بمبئی فلم انڈسٹری کے مسلمان فنکاروں کے لیے ناقابلِ برداشت تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہندوستان سے بڑے نامی گرامی، آرٹسٹوں، شاعروں، موسیقاروں کے ساتھ ساتھ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی اور مستقبل کے تحفظ کی خاطر ہندوستان کو خیر باد کہہ کر پاکستان چلے جائیں پھر بہت سے اور مسلم فنکاروں کی ہجرت کے بعد فضلی برادران بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے۔

فضلی برادران نے لاہور میں سکونت اختیار کی، بمبئی کی شہرت لاہور کی فلم انڈسٹری میں بڑی کام آئی اور یہاں کی فلم انڈسٹری نے فضلی برادران کی راہوں میں آنکھیں بچھادی تھیں جب کہ لاہور فلم انڈسٹری کو فضلی برادران جیسے منجھے ہوئے فلم ساز و ہدایت کاروں کی اشد ضرورت بھی تھی۔ فضلی برادران 1952ء میں اپنی فلمی سرگرمیوں کے ساتھ پھر سے متحرک ہو گئے تھے۔ ہدایت کار سبطین فضلی نے شریک فلمساز اسلم لودھی کے ساتھ فلم "دوپٹہ" کا آغاز کیا۔ اس دور کے نامور رائٹر حکیم احمد شجاع سے فلم دوپٹہ کا اسکرپٹ لکھوایا۔ فلم کی ہیروئن عظیم گلوکارہ و اداکارہ نور جہاں تھی اور فلم کے مرکزی

کرداروں میں اجے کمار، سدھیر، یاسمین، زرینہ، غلام محمد اور آزاد تھے۔

دوپٹہ کے گیت نگار مشیر کاظمی اور موسیقار فیروز نظامی تھے یہ وہی فیروز نظامی تھے جنھوں نے 1947ء میں بنائی گئی فلم جگنو کی موسیقی دی تھی، جس میں نور جہاں اور دلیپ کمار مرکزی کرداروں میں تھے۔ فلم ''جگنو'' میں نور جہاں کی آواز کے حسن اور فیروز نظامی کی دل کش موسیقی تنویر نقوی کے خوبصورت گیتوں نے فلم ''جگنو'' کو بے مثال کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ فلم ''دوپٹہ'' میں فیروز نظامی کا ساتھ شاعر مشیر کاظمی دے رہے تھے اور یہ فلم مشیر کاظمی کے لیے بھی ایک چیلنج کا درجہ رکھتی تھی۔ مشیر کاظمی نے پھر فلم کے جتنے بھی گیت لکھے وہ اپنی مثال آپ اور لاجواب تھے۔ فلم کا ہر گیت فلم بینوں کے دلوں میں اترتا چلا گیا تھا اور چند گیت تو ایسے تھے کہ اگر آج بھی سنو تو وہ دل کو چھو لیتے ہیں جیسے کہ مندرجہ ذیل گیت:

چاندنی راتیں... او چاندنی راتیں
سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں، چاندنی راتیں
تکتے تکتے ٹوٹی جائے آس پیا نہ آئے

......

تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے
آنکھوں میں انتظار کی دنیا بسا گئے

......

باتوں ہی بات میں چاندنی رات میں
جیا میرا کھو گیا ہائے کسی کا ہو گیا

......

جگر کی آگ سے اس دل کو جلتا دیکھتے جاؤ
مٹی جاتی ہے ارمانوں کی دنیا دیکھتے جاؤ

......

میں بن پتنگ اڑ جاؤں گی

ہوا کے سنگ لہراؤں گی لہراؤں گی

فلم دوپٹہ کی لازوال کامیابی نے لاہور کی فلم انڈسٹری کے قدم بھی بڑے مضبوط کیے تھے پھر اداکار سدھیر نے سبطین فاضلی کو اپنی ٹیم کا حصہ بنایا اور فلم "آنکھ کا نشہ" کا آغاز کیا۔ آنکھ کا نشہ کی کہانی آغا حشر کاشمیری کی تھی جس کے مکالمے منشی ظہیر نے لکھے تھے، اس بار ہدایت کار سبطین فضلی نے موسیقار بدل دیا تھا، اس فلم کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے جب کہ گیت نگاروں میں قتیل شفائی، سیف الدین سیف اور طفیل ہوشیار پوری تھے اپنے دور کی یہ بھی ایک اچھی فلم تھی اور اس کے بھی چند گیتوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ خاص طور پر گلوکارہ اقبال بانو کے گائے ہوئے ان گیتوں کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی تھی:

☆اک پل بھی نہیں آرام یہاں

☆دکھ درد کے لاکھ بہانے ہیں

ماسٹر عنایت حسین کی موسیقی میں نیم کلاسیکل انداز میں ترتیب دیے گئے اس گیت کو بھی بڑا پسند کیا گیا تھا۔ "آنکھ کا نشہ" کے بعد فضلی برادران نے اپنی ذاتی فلم "دو تصویریں" بنائی مگر کمزور کہانی اس فلم کو لے ڈوبی جس کی وجہ سے فضلی برادران بھی بڑے دل برداشتہ ہوئے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ اردو فلموں کو ناکامی کے دور سے دوچار ہونا پڑا تھا اور آہستہ آہستہ پنجابی فلموں نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا، ہیر رانجھا، ماہی منڈا، یکے والی اور دلا بھٹی جیسی کامیاب فلموں نے اردو فلموں کو اپنے سامنے ٹکنے ہی نہیں دیا۔ فضلی برادران بھی پنجابی فلموں کی یلغار کی وجہ سے فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے گئے اور پھر یوں ہوا کہ وہ گوشہ گمنامی میں جا بیٹھے پھر کافی عرصے کے بعد کراچی سے ایک اور فضلی برادر، فضل احمد کریم فضلی نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ فضلی احمد کریم فضلی، سبطین فضلی اور حسنین فضلی کے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے جب بی۔اے کی ڈگری لی تو ان کے والد نے ان کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلینڈ بھیج دیا تھا جب یہ انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے واپس انڈیا آئے تو وہاں پھر آئی۔سی۔ایس کا امتحان پاس کیا اور پھر بنگال میں سرکاری

ملازمت اختیار کی اور ایک طویل عرصے تک بنگال ہی میں قیام کیا اور جب پاکستان وجود میں آیا تو فضل احمد کریم فضلی مشرقی پاکستان کی حکومت سے وابستہ ہو گئے تھے۔

فضل احمد کریم فضلی اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب پر بھی بڑی دسترس رکھتے تھے۔ یہ فلمی دنیا میں بہت بعد میں آئے اور کراچی سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ کراچی آنے سے پہلے یہ کلکتہ، پھر مشرقی پاکستان میں رہے۔ یہاں ایک طویل عرصہ گزارا اور بنگالی ادب سے بھی روشناس ہوئے۔

جب یہ ہندوستان میں تھے تو ان کے گھرانے کا ادب میں بڑا نام تھا۔ اس دور کے عظیم شاعروں کا ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ مشاعروں کی محفلیں بھی خوب ہوتی تھیں۔ علامہ صفی لکھنوی، ظریف لکھنوی اور جگر مراد آبادی جیسے شاعروں کی ان کو رفاقت حاصل رہی تھی۔ کراچی میں جب انھوں نے سکونت اختیار کی تو اپنے گھر کا نام بیت الغزل رکھا اور پھر شعر وادب کی آبیاری میں لگے رہے۔

فضل احمد کریم فضلی کلکتہ، مشرقی پاکستان میں بھی ایک ادب دوست شخصیت کی حیثیت سے مشہور تھے اور کراچی میں انھوں نے اپنا یہی انداز برقرار رکھا تھا۔ جب جگر مراد آبادی ہندوستان سے مشاعروں کی غرض سے پاکستان آئے تھے تو کراچی میں فضل کریم فضلی ہی کے گھر میں قیام کرتے تھے، جس طرح ڈھاکا میں ان کے تعاون سے بڑے پیمانے پر مشاعرے منعقد ہوتے تھے، اسی طرح کراچی میں بھی ان کے گھر مشاعروں کا اہتمام خاص انداز سے کیا جاتا تھا۔

کریم فضلی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب اور ناول نگار بھی تھے۔ انھوں نے مشرقی پاکستان کے پس منظر میں دو ضخیم ناول بھی لکھے جو ''خون جگر ہونے تک'' اور ''سحر ہونے تک'' کے ناموں سے منظر عام پر آئے اور پسندیدگی کی سند بنے۔ جب فلم سازی کے میدان میں قدم رکھا تو ''چراغ جلتا رہا'' کے نام سے پہلی فلم کا ایسٹرن اسٹوڈیو کراچی میں آغاز کیا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اپنی پہلی فلم میں تمام نئے آرٹسٹوں کو کاسٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔

ان کے چند قریبی دوستوں نے کہا فضلی صاحب! تمام نئے آرٹسٹوں سے فلم بنانا گھاٹے کا

سوداہوگا،توفضلی صاحب نے کہا تھا ہر سودے میں گھاٹا بھی ہوتا ہے اور فائدہ بھی۔ میری خواہش ہے کہ میری فلم میں کام کرنے والا ہر چہرہ نیا ہو، جسے میں پتھر کی طرح تراشوں اور اسے ہیرا بنا کر پیش کروں، میں فلم کی دنیا میں ایک نیا کام کرنا چاہتا ہوں اور پھر ہوا بھی کچھ یہی کہ ان کی فلم کے نئے چہرے ہیرے کی سی تراش خراش لے کر بعد میں پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے ایک جگمگاتی کہکشاں کا روپ دھار گئے۔

فلم ''چراغ جلتا رہا'' کے آرٹسٹ محمد علی، زیبا، دیبا اور کمال ایرانی فلمی دنیا کی تاریخ کا حصہ بنے اور ان نئے آرٹسٹوں کو لے کر فضل احمد کریم فضلی نے فلم دنیا میں ایک تاریخ رقم کی تھی۔ ان کے فلم ساز ادارے دبستان لمیٹڈ کی پہلی فلم نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے اور پھر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ فلم کی موسیقی کے لیے بھی ریڈیو پاکستان کے ایک موسیقار نہال عبد؟ کو اپنی فلم کے لیے موسیقار منتخب کیا تھا، جن کی یہ پہلی فلم تھی۔

فلم کے لیے جن شہرۂ آفاق شاعروں کے کلام کا انتخاب کیا گیا ان میں حضرت امیر خسرو، مرزا غالب، میر تقی میر، جگر مراد آبادی اور مولانا ماہر القادری کے نام شامل تھے۔ یہ جرا? ت وہی شخص کرسکتا ہے جو خود ادب کا دیوانہ ہو اور ادب کی اہمیت سمجھتا ہو۔ اب میں آتا ہوں اس کلام کی طرف جو فلم کی زینت بنایا گیا۔ حضرت امیر خسرو کے لکھے ہوئے مشہور گیت: کاہے کو بیاہی بدلیس۔ مرزا غالب کی غزل، جس کا مطلع تھا

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

گلوکار طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ ہوا جو ان دنوں کراچی آئے تھے اور پھر شہرہ آفاق شاعر میر تقی میر کی ایک غزل ملکہ ترنم نور جہاں کی آواز میں ریکارڈ کی گئی، جس کا مطلع تھا۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

پھر اپنے بزرگ دوست اور استاد شاعر جگر مراد آبادی کی ایک غزل بھی اپنی فلم کی زینت

بنائی جس کا مطلع تھا۔

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

اس غزل کو بھی ریڈیو پاکستان کے سنگر ایم کلیم سے گوایا گیا تھا۔ فلم ''چراغ جلتا رہا'' میں مولانا ماہر القادری کا مشہور سلام بھی شامل کیا گیا تھا جس کے بول تھے۔

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی

ان کی فلم میں دوسری فلموں کی نسبت گیت کچھ زیادہ تعداد میں تھے۔ فضلی صاحب کی اپنی دو غزلیں بھی فلم کی زینت بنی تھی جنھیں طلعت محمود کی آواز ملی تھی۔ ان غزلوں کے بول تھے:

☆ کچھ ہوا حاصل نہیں اب تک کوشش ناکام سے

☆ مشکل نکلا دل کا سنبھلنا

ان کی ایک غزل میڈم نور جہاں نے بھی گائی تھی، جس کے بول تھے

پڑا ہے مجھے کن بلاؤں سے پالا

فلم ''چراغ جلتا رہا'' کو ایک بڑا اعزاز یہ بھی حاصل ہوا تھا کہ اس فلم کا افتتاح مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح نے کیا تھا۔ یہ فلم 9 مارچ 1962 میں کراچی کے نشاط سینما میں ریلیز ہوئی تھی اور اس دور میں کسی ایک سینما پر فلم کی سلور جوبلی ایک بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔ دبستان لمیٹڈ کی دوسری فلم تھی ''ایسا بھی ہوتا ہے'' اس فلم میں فضلی صاحب نے اداکارہ زیبا کے ساتھ اداکار کمال کو ہیرو کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم کے موسیقار نثار بزمی تھے جو ان دنوں نئے نئے ہندوستان سے پاکستان آئے تھے۔

مذکورہ فلم میں تقریباً تمام گیت فضلی صاحب نے خود ہی لکھے تھے، جب کہ اپنی دونوں فلموں کے مصنف بھی یہ خود تھے۔ فلم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' ایک ہلکی پھلکی دلچسپ فلم تھی، جو بڑی پسند کی گئی تھی، اس فلم میں بھی میڈم نور جہاں کے ساتھ احمد رشدی کی آوازوں میں گیت ریکارڈ کیے گئے تھے اور چند گیت تو اس زمانے میں ریڈیو سے روزانہ ہی دن میں کئی بار بار نشر ہوتے تھے، جن کے بول تھے:

☆ محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

☆ ہو تمنا اور کیا؟ جانِ تمنا آپ ہیں

☆ ٹکڑا وہ چاند کا رخ زیبا کہیں جسے

☆ بہار کے دن آئے سنگھار کے دن آئے

فضلی صاحب نے ہندوستان پاکستان کے درمیان ہونے والی ستمبر 1965 کی جنگ کے پس منظر میں بھی ''وقت کی پکار'' کے نام سے ایک فلم بنائی تھی مگر وہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکی تھی، کیونکہ جنگ ختم ہونے کی وجہ سے فلم کو بہت زیادہ کاٹ چھانٹ کے بعد پاس کیا گیا تھا، اس طرح فلم کافی سے زیادہ متاثر ہوئی تھی اور یہی چیز اس کی ناکامی کا باعث بنی تھی، لیکن فضلی ہمت ہارنے والی شخصیت نہیں تھے۔ انھوں نے جلد ہی پھر ''دور بھی نزدیک بھی'' کے نام سے اپنی چوتھی فلم کا آغاز کیا، ابھی فلم کے اسکرپٹ کا کام ختم ہوا تھا کہ وہ اچانک بیمار ہوگئے، جب کہ وہ مستقبل میں اپنا ذاتی فلم اسٹوڈیو بھی بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے ایک بڑا قطعہ اراضی بھی خرید لیا تھا، مگر قدرت کو شاید یہ منظور نہ تھا۔

فضلی صاحب کی بیماری بڑھتی چلی گئی اور ان کی زندگی ان کے ساتھ وفا نہ کرسکی۔ وہ 18 دسمبر 1981 کو دل کا شدید دورہ پڑنے کے باعث انتقال کرگئے۔ انھیں کراچی کے مقامی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا اور اس طرح فلم انڈسٹری ایک روشن دماغ اور تاریخ ساز نامور فلم ساز و ہدایت کار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔ ان کی مغفرت کرے اور اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین)

اس مکتبِ ادب کے نام

جو

مشرقی پاکستان میں زیرِ تشکیل ہے

پہلا باب

شروع جولائی ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے۔ صبح کا سہانا وقت تھا اور وہ بھی مشرقی بنگال کی صبح کا، دنیا سبز رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھان کے کھیتوں کا دھانی سمندر موجیں مار رہا تھا۔ کنارے پر چھالیا کے سبک سبک بلند و بالا درخت سب درختوں سے اوپر سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کہیں ناریل اور کھجور کے درختوں کی بدولت فضا میں سینکڑوں ہزاروں مانگیں نکلی ہوئی تھیں، آڑی، ترچھی، سیدھی۔ کہیں بانس کے گھنے جھنڈوں میں ایک مبہم سی پراسرار کیفیت تھی۔ جمعدار ذلیل الدی اپنے مکان کے ٹیلے سے حسب معمول اتر رہے تھے۔ مولوی صاحب نے تو ان کا نام جلیل الدین رکھا تھا، لیکن گاؤں والوں نے اسے زبردستی ذلیل الدی بنا دیا تھا۔ وہ لاکھ صحیح تلفظ بتانے کی کوشش کرتے، مگر کون سنتا تھا۔ گاؤں والے جب کہیں تو ''ذلیل الدی''، ''ذلیل میاں''، ''ذلیل چاچا''، ''ذلیل بھیا''، لیکن جب سے انھوں نے جمعدار صاحب کا لقب اختیار کیا تھا، انھیں اس ذلت سے ایک حد تک نجات مل گئی اور اب وہ ''زمان دار شاب'' ہو گئے تھے۔ یہ ٹیلہ پاس کی مٹی کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک پنتھ دو کاج۔ مکان بنانے کے لیے اونچی زمین کا بھی انتظام ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک اچھا خاصا تالاب بھی مل گیا۔ تالاب کا پانی کھانے پینے نہانے اور تیرنے کے کام آتا۔ مچھلیاں الگ مل جاتیں۔ ہر سال ہزار دو ہزار مچھلیوں کے بچے خرید کر ڈال دیے جاتے، گھر کے بھی کام آتے اور بیچنے کے بھی۔ تالاب کے کنارے کیلے، پپیتے، ناریل، چھالیا کے درخت لگائے جاتے۔ کچھ فصل کی ترکاریاں بھی ہو جاتیں۔ جمعدار صاحب کے ٹیلے پر ان کے مکان کے علاوہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے مکان بھی تھے، بھائی بندوں کے، غریب مزدوروں کے۔ ''گھوڑا مارا'' کا گاؤں اس طرح کے متعدد ٹیلوں پر آباد تھا جو ایک دوسرے سے سو سو دو دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ شاید یہاں کسی نے کسی زمانے میں کوئی گھوڑا مارا تھا یا کسی گھوڑے نے غیر فانی انداز میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی تھی، وجہ تو کسی کو معلوم نہ تھی، لیکن گاؤں والے فخر سے اپنے گاؤں کو گھوڑا مارا ہی کہتے تھے۔

برسات میں ہر ٹیلہ جزیرہ بن جاتا۔ ایک ٹیلے سے دوسرے ٹیلے تک کشتی میں آنا جانا ہوتا۔ کھیتوں میں دھان کے پودوں پر سے کشتی چلتی۔ ابھی برسات کو شروع ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے، کچھ کھیت جو اونچی جگہ پر واقع تھے اب تک پانی کی سطح سے اوپر تھے۔ دھان کے بالوں میں شبنم کے موتی پروئے ہوئے تھے۔ پُھل سنگھیاں ان آبی موتیوں کو اپنی ننھی ننھی چونچوں سے چن رہی تھیں۔ چنتی تھیں، چہکتی تھیں اور پُھر سے اُڑ کر دوسرے بال کے موتی چننے لگتی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا دامن ان بالوں سے رگڑ کھاتا ہوا اُڑ رہا تھا۔ کھیتوں میں ایک لطیف سرسراہٹ تھی۔ سازِ فطرت مدھم سروں میں بج رہا تھا۔ کائنات غزل سرا معلوم ہوتی تھی۔ جمعدار صاحب بھی غزل سرا ہو گئے۔ وہی چیز جو ایسے موقعوں پر وہ ہزاروں دفعہ پہلے بھی گا چکے تھے پھر ہونٹوں پر آ گئی "بلبل کا چیں چیں میں آواز مرحبا ہے"۔ یہ خود انھیں کی تصنیف تھی۔ اردو پڑھنے لکھنے کا کچھ تو انھیں واقعی شوق بھی تھا اور کچھ یہ بات بھی تھی کہ اس سے گاؤں والوں پر رعب پڑتا تھا۔ جمعدار صاحب ان باقیات الصالحات میں سے تھے جو عربی فارسی اردو سے شغف ظاہر کرنا باعث فضیلت و افتخار سمجھتے تھے۔ وہ وقت بے وقت غزلیں اور قصیدے بھی تصنیف فرما لیا کرتے تھے۔ "بلبل کا چیں چیں" والا غزل نما قصیدہ انھیں خاص طور سے پسند تھا اور اسے گاتے گاتے وہ اپنا منہ سرخ کر لیتے۔

جمعدار صاحب رفع حاجت کے لیے حسب معمول پودوں کی آڑ میں ایک مناسب جگہ پر بیٹھ گئے اور آس پاس کی گھاس کے شبنمی موتیوں کو اپنی بھدی انگلیوں سے چور چور کرنے لگے تھے۔ تھوڑی تھوڑی گنگناہٹ اب تک جاری تھی، قریب ہی ایک چوہیا اپنے بل سے جھانک رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے برآمد ہوئی۔ جمعدار صاحب کے منہ کی طرف برابر دیکھتی جاتی تھی۔ ان کی شانِ بے نیازی دیکھ کے اس کی کچھ ہمت بندھی اور وہ چپکے سے دھان کے ایک پودے پر چڑھ کر اس کے بالوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں سے جلدی جلدی کترنے لگی۔ دھان چرا چرا کر منہ بھر لیا اور جھٹ سے اتر کر بل میں جا چھپی۔ پھر تو بل سے دھان کی بالوں تک آنے جانے کا تانتا بندھ گیا۔ جمعدار صاحب فراغت کے بعد جب اٹھنے لگے تو ان کی نظر چوہیا پر پڑی۔ اس وقت وہ پودے پر چڑھی دھان چرا رہی تھی۔ جمعدار صاحب نے نشانہ لگا کر لوٹا اس کے سر پر دے مارا۔ کچ سے ایک آواز آئی

جس میں چوہیا کی چک دب گئی۔ پودے کی کچھ ڈالیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اس کا جمعدار صاحب کو بہت افسوس ہوا، لیکن جب انھوں نے لوٹا اٹھاتے وقت دیکھا کہ چوہیا اس کے نیچے دبی پڑی ہے اس کی ننھی سی زبان نکلی ہوئی ہے، منہ مین جو دھان بھرے تھے وہ باہر نکل آئے ہیں اور اس کا چھوٹا سا بھیجا چھنکا پڑا ہے تو انھیں اس خیال سے بڑی خوشی ہوئی کہ ان کا نشانہ کتنا ٹھیک بیٹھا تھا۔ چوہیا کا خون لوٹے میں لگ گیا تھا۔ انھوں نے کہا، ''لاحول ولاقوہ۔ حرام زادی نے لوٹا بھی نجس کر دیا۔'' نشانے کی کامیابی نے ان کے دل کے سرور کو اور بڑھا دیا اور وہ اب پھر ''بلبل کا چیں چیں'' الاپنے لگے۔ پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بدستور چلتی رہی۔ پھل سنگیاں بھی بدستور شبنم کے موتی چننے میں مگن رہیں، اور چوہیا اسی طرح پڑی رہی۔ مری ہوئی زبان نکلی ہوئی، بھیجا چھنکا ہوا۔

۲

جمعدار صاحب کی الاپ اس وقت ایک حرکتِ اضطراری تھی۔ وہ درحقیقت اس گزرے ہوئے زمانے میں جا پہنچے تھے جب ۱۸-۱۹۱۴ء کی جنگ میں بھرتی ہو کر وہ لڑائی پر گئے تھے اور چاند ماری کی مشق میں مشکل سے ان کی گولی نشانے پر لگتی تھی۔ انھیں خیال آ رہا تھا کہ اگر نشانے پر بجائے ایک بے جان سیاہ داغ کے جاندار چوہیا ہوتی تو شاید ان کا نشانہ خطا نہ ہوا کرتا۔ انھیں اس زمانے کی بہت سی باتیں پھر یاد آ رہی تھیں۔ وہ ان باتوں کو اکثر فخریہ سنا سنا کر گاؤں والوں پر اپنا رعب جمایا کرتے تھے۔ اس وقت ان کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھر قصہ کہیں اور لوگ بیٹھے سنیں۔ دل کی پتیلی میں قصے کی بھاپ جوش مار رہی تھی اور ہونٹ کے ڈھکنے اُٹھ اُٹھ کر گر گر پڑتے تھے۔ گھر میں جا کر جلدی جلدی وضو کرنے لگے۔ فجر کی نماز عموماً قضا ہو جاتی تھی، مگر وہ پڑھتے ضرور تھے۔ سوچ رہے تھے کہ نماز سے جلد فارغ ہو جاؤں تو قصہ خوانی کے لیے باہر نکلوں، ہونٹ بدستور ہل رہے تھے جیسے بدبدائے جا رہے ہوں۔ 'بی بی جان' نے دیکھا تو سمجھیں کچھ ورد کر رہے ہیں۔ یکا یک جمعدار صاحب کے منہ سے آواز نکلی ''دھائیں''۔ بی بی جان چونک پڑی۔ جمعدار صاحب بھی کچھ جھینپ سے گئے۔ ''لاحول ولاقوہ'' کہہ کے بات ٹال دی، نماز میں بھی میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے۔ ان کے رکوع و سجود میں حملہ کرنے

کی شان تھی۔ یہ تماشا دیکھ دیکھ کے بی بی جان کے دل میں ایک گھٹا ٹوپ کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ اُدھر انھوں نے سلام پھیرا اور ادھر یہ برس پڑیں، ''تمھیں آج ہوا کیا ہے پھر کسی فرنگن کے خیال میں پڑے ہو کیا؟'' جمعدار صاحب اب تک میدانِ جنگ میں معرکہ آرا تھے۔ بی بی جان کے سوال نے انھیں دنیائے حسن و عشق میں پہنچا دیا اور اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ بی بی جان کو اور طیش آیا۔ فرمایا، ''تمھیں آنے ہی کی کون سی ایسی ضرورت تھی۔ انھیں میموں میں پڑے اپنا منہ کالا کیا کرتے۔'' فرمایا، ''ارے عزیزہ اہلیہ تم تو زبردستی بگڑتی ہو۔ اس وقت وہ میمیں کہاں ہیں۔''

''تمھارے دل میں۔'' یہ کہہ کے ''عزیزہ اہلیہ'' روبندھی ہو گئیں۔ جمعدار صاحب نے فرمایا، ''اب تمھیں کون سمجھائے'' اور باہر چلے گئے۔ دل میں کہتے تھے جاتے تھے، کیا عورت ہے۔ خیالی لطف اٹھانا بھی مشکل کر دیا ہے۔

۳

جمعدار صاحب کے انتظار میں ان کی گائے، موتی کھڑی بیں بیں کر رہی تھی۔ وہ خود روز سویرے اسے کھلایا کرتے تھے۔ انھوں نے اسے جا کے تھپتھپایا۔ پاس تھوڑی سی پوال پڑی تھی اٹھا کے دی اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد گرجے ''او قیص قیص، قیص، کمبخت کے بچے۔ حرام زاد کو توپ دم کردے۔'' قیص محمد بارہ تیرہ برس کا لڑکا تھا جسے جمعدار صاحب نے صرف کھانے اور سالانہ دو جوڑے پرانے کپڑے پر نوکر رکھا تھا۔ وہ ڈرا سہما دوڑ کے آیا اور کچھ پوال اپنے سر پر ڈھو کے لایا۔ تھوڑی دیر تک جمعدار صاحب موتی کا دلار کرتے رہے، وہ ان کے گھر کی بچھیا تھی۔ وقت بے وقت ہل چلانے کے کام بھی آتی اور اڑوس پڑوس کی دودھاری گایوں میں بھی اس کا شمار تھا، یعنی سیر دو سیر دودھ بھی دے دیتی تھی۔ اس دودھ کا زیادہ حصہ ان کا نورِ نظر پیتا اور بقیہ وہ خود۔ ''عزیزہ اہلیہ'' کو دودھ پسند نہ تھا۔ کم سے کم وہ کہتی یہی تھیں اور باوجود جمعدار صاحب کے اصرار کے کہ ''گھر کی بچھیا کا دودھ ہے، پی لو، فائدے کرے گا''... وہ نہ پیتیں۔

یہ لڑکا ان کے بڑھاپے کی اولاد تھی، اور انھیں بہت محبوب۔ بڑے بڑے مولوی مولاناؤں سے پوچھ کے اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر کے انھوں نے اس کا نام رکھا تھا ابوالبرکات تاج الاسلام محمد ذوالقرنین شانِ خدا۔ وہ خود تو عموماً بہت شین قاف درست کر کے اس کا نام لینے کی کوشش کرتے اور بڑے مزے میں ابوالبرکات کہہ کے شروع کرتے۔ دلار میں بھی ''میرا شان میرا جان' مگر لوگوں نے شانو بھی نہیں، بلکہ چھانو بنا دیا تھا۔ عزیزہ اہلیہ بھی چھانو کہتیں۔ جمعدار صاحب کی زبان سے خود بعض وقت بے خیالی میں چھانو نکل جاتا جس کا انھیں افسوس ہوتا۔ چھانو چار پانچ برس کا تھا، مگر پھر بھی ان کے کندھے پر چڑھا رہتا اور بعض وقت شوخی میں ان کے سر پر طبلہ بجاتا۔ ابھی قیمص دودھ دوہ رہا تھا کہ چھانو زنان خانے سے آنکھیں ملتا ہوا برآمد ہوا اور جمعدار صاحب کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ انھوں نے جھٹ سے گود میں اٹھا لیا۔ وہ سر سے اتر پڑا اور موتی سے کھیلنے لگا۔ موتی اسے چاٹنے لگی، اپنے بچّے کی طرح۔ جمعدار صاحب ایک ہاتھ چھانو کے سر پر پھیرتے رہے دوسرا موتی کی پشت پر اور پھر فرطِ جذبات سے ''مرحبا مرحبا'' گنگنانے لگے۔

۴

تھوڑی دیر بعد گیدو کی ماں ایک چھوٹی ٹوکری میں چیوڑا اور گڑ بیچنے لائی۔ وہ بیوہ تھی اور پڑوس میں رہتی تھی۔ عمر ساٹھ برس کے قریب ہوگی۔ گیدو کو مرے ایک مدت ہوگئی تھی اور وہ چھانو کو اس کی جگہ سمجھتی تھی، چھانو بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ آج بھی اسے دیکھ کے دوڑا اور اس نے حسبِ معمول کچھ گڑ اور چیوڑا دیا۔ جمعدار صاحب سے وہ ڈرتی تھی، مگر ان کی ''عزیزہ اہلیہ'' سے اس کی قدرے بے تکلفی تھی۔ وہ انھیں 'بی بی شاب' (بی بی صاحب) کہتی اور 'بی بی شاب' اس سے گھر کی باتیں کرتیں۔ آج جب گیدو کی ماں آئی تو دیکھا کہ بی بی شاب غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔ گیدو کی ماں کے سوالیہ نظر کے نشتر سے 'بی بی شاب' کے دل کا پکا پھوڑا پھوٹ بہا۔ کہنے لگیں، ''ارے گیدو کی ماں، اب میں کیا کہوں۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ میاں شاب کے دل میں اب بھی وہی چڑیل میمیں بسی ہوئی

ہیں۔ انھیں کے خیال میں مگن رہتے ہیں۔'' گیدو کی ماں نے پہلے تو وہی معمولی تسلی کی باتیں کیں۔ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ گیدو کا باپ بھی ویسا ہی تھا۔ رات کو جب دیکھو بچھونے سے غائب۔ پیشاب کا بہانہ، جب رونے دھونے لڑائی جھگڑے سے کچھ نہ ہوا اور پیشاب کا مرض بڑھتا ہی گیا تو وہ صبر کر کے چپ ہو رہی۔ پھر تو کچھ دن کے بعد ایسا رنگ بدلا کہ جب پیشاب لگتا تو اسے جگاتا اور وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے باہر لے جاتی اور پھر واپس لاتی۔ ''بی بی شاب'' نے بگڑ کے کہا، ''یہ بڑھاپے کی بات ہوگی۔'' گیدو کی ماں سٹپٹا سی گئی، لیکن جہاں دیدہ عورت تھی، جھٹ بولی، ''میاں شائبو تو بڑھائے رہے ہیں۔'' بی بی شاب نے فرمایا، ''نہیں ان کا دل تو جوان ہے۔''

گیدو کی ماں نے 'بی بی شاب'' کا رنگ دیکھ کے بات کا رخ پلٹ دیا۔ عورتوں کی مظلومی اور مردوں کے مظالم کا رونا رویا جانے لگا اور دونوں تھوڑی دیر خوب روئیں۔ اس کے بعد 'بی بی شاب' نے ایک ٹوکری میں کچھ چاول لا کے دیے جیسے اس کی ہمدردی اور آنسوؤں کے دام دے رہی ہوں۔ گیدو کی ماں نے حسب معمول بغیر کچھ کہے سنے اسے قبول کر لیا اور آنسو پونچھتی ہوئی چلی گئی۔

۵

جمعدار صاحب بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے کہ کیسے دن چڑھے لوگ آئیں اور ان کی قصہ خوانی شروع ہو، ان کے دل میں بچوں کی سی بے چینی تھی۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ سورج آسمان کے زینے پر بچوں کی طرح جلد جلد چڑھ جائے، مگر وہ آج ایک سفید ریش بڈھے کی طرح ہر زینے پر رُک رُک کر دم لیتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گاؤں میں ابھی تک آمد و رفت شروع نہ ہوئی تھی۔ کوئی اور نہیں تو پھول محمد ہی آ جاتا۔ وہ لونڈا ہے تو شریر اور جمعدار صاحب کی کہانیوں پر الٹے سیدھے بے تکے سوالات بھی کیا کرتا ہے، لیکن خیر وہی سہی، وہ شیطان بھی آج ابھی تک نہ آیا تھا۔ آخر جمعدار صاحب نے ٹھانی کہ وہ خود ہی گاؤں کا چکر لگا آئیں۔ انھوں نے اپنی ڈونگی درخت سے کھولی، وہی ڈونگی جسے خود انھوں نے اپنی نگرانی میں تاڑ کے تنے میں خول کرا کے تیار کرایا تھا۔ ویسے تو جمعدار صاحب کے

پاس ایک اور بھی معمولی قسم کی کشتی تھی، مگر وہ جب اپنے دل میں کوئی خاص توانائی محسوس کرتے تو اس وقت وہ ڈونگی ہی کو بانس سے کھیتے ہوئے نکلتے گویا تاڑ کے درخت کے تنے میں کھڑے بہے چلے جارہے ہیں۔ ایسی حالت میں جمعدار صاحب اکثر کوئی چیز گنگناتے بھی جاتے۔ آج بھی گنگنارہے تھے۔ جمعدار صاحب بستی کے ٹیلوں کے پاس سے گزرے۔ کچھ لوگ نظر بھی آئے۔ علیک سلیک بھی ہوئی، مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ کی کہ جمعدار صاحب سے باتیں کرتا۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آرہے تھے، اور یہ بات انھیں ناگوار گزر رہی تھی۔ آخر جمعدار صاحب نے گاؤں کے سب سے بڑے ٹیلے کا رخ کیا۔ یہ ان کے مکان سے کچھ دور تھا اور یہاں ہر صبح چھوٹا سا بازار لگتا۔ مچھلی، دودھ، دہی، ترکاریاں تھوڑی تھوڑی مقدار میں بکنے آتیں۔ دو ایک مستقل دُکانیں بھی تھیں۔ جمعدار صاحب ٹیلے کے کنارے ڈونگی سے ابھی اتر ہی رہے تھے کہ جلودھر چیٹر جی سے ملاقات ہوگئی۔ جلودھر پچیس تیس برس کا جوان تھا۔ پہلے کالج میں پڑھتا تھا پھر پڑھائی چھوڑ کر کسی سرکاری دفتر میں نوکر ہوگیا تھا اور اب حال میں یہیں گاؤں میں آ کے رہنے لگا تھا۔ کوئی کہتا نکالا گیا ہے، کوئی کہتا قومی کام کے لیے خود نوکری پر لات ماردی۔ جمعدار صاحب نے کئی برس پہلے اسے دیکھا تھا۔ انھیں اس کی وضع قطع میں بڑا فرق نظر آیا۔ موٹا سا چشمہ لگا تھا۔ بغل میں دو تین کتابیں دبی تھیں۔ سر کے بال جتنے بڑھے تھے اس سے زیادہ الجھے، چہرے کے در و دیوار پر سبزہ بڑی بے تکلفی سے اُگ رہا تھا۔ جمعدار صاحب کچھ جھجکے پھر بڑے تپاک سے بولے، ''او جلودھر بابو! بہت دن بعد آئے۔ کہو کیسے رہے۔'' جلودھر نے بتایا کہ اب وہ گھر ہی پر رہے گا اور گاؤں والوں کی خدمت میں زندگی صرف کردے گا۔ جمعدار صاحب گرگ باراں دیدہ تھے۔ شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ دونوں بازار کی طرف بڑھے۔ راستے میں جلودھر نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ وہ کمیونسٹ ہوگیا ہے، اور کمیونزم کیا ہے، مگر جمعدار صاحب نے جو اپنے خیالات میں مگن تھے، مطلق دھیان نہ دیا۔ بازار آ گیا۔ ابھی لوگ زیادہ نہ آئے تھے، مگر پھر بھی کچھ اللہ کے بندے نظر آ ہی گئے۔ سب گاؤں کے بھائی بھتیجے۔ ''بھیا سب خیریت تو ہے؟''، ''چاچا آج اتنے سویرے کیسے آنا ہوا؟'' وغیرہ وغیرہ کے سوالات نے ان کا خیر مقدم کیا، وہ

مسکرائے جس کے معنی تھے ابھی بتاتا ہوں۔ ’’بھیا دنیا کی کچھ خبر سناؤ۔‘‘ جمعدار صاحب نے اپنے سینے میں کشادگی محسوس کی۔ جلودھر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ جمعدار صاحب بول اُٹھے، ’’جرمن پھر شرارت پر کمر باندھ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پھر منہ توڑ آؤں۔‘‘

’’چاچا آپ تو لام سے آکے کہہ رہے تھے جرمن کو ایسی مار مارا ہے کہ اب سر نہ اُٹھا سکے گا۔‘‘

’’مگر چاچا....‘‘ پھول محمد کی آواز آئی۔ چاچا نے پلٹ کے دیکھا تو پھول محمد کھڑا تھا۔ اس کے آنے کی انھیں خبر نہ ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح بے سان وگمان آجایا کرتا تھا۔ مسکراتی ہوئی نگاہیں ملیں اور پلک مارنے سے پہلے ہی ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ گئیں۔ شکوہ، شکایت، عذر معذرت، صفائی۔ ’’مگر چاچا....‘‘ پھول محمد نے نگاہوں کی گفتگو کے ساتھ ساتھ زبانی گفتگو بھی شروع کر دی۔ ’’جرمن سے چاچا کب لڑے تھے۔ چاچا تو ترکوں سے لڑے تھے۔‘‘ چاچا بمکے، ’’چاچا سب سے لڑے تھے۔ یہ زخم (ہاتھ کا نشان دکھاتے ہوئے) جرمن ہی سے لڑنے میں لگا تھا۔‘‘ پھول محمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آرہی تھی، مگر اس نے اپنے ہونٹ چبا کر کہا، ’’یہ قصہ تو آپ نے کبھی نہیں سنایا۔‘‘ جمعدار صاحب، ’’اچھا نہیں سنایا؟ نہ خیال آیا ہوگا۔‘‘ یہ کہہ کے چپ ہو گئے۔ اب کوئی اصرار کرے تو کہیں۔

پھول محمد، ’’چاچا سنایئے نا پھر۔‘‘

’’اب کیا سنائیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے چاچا ایک سوکھے ہوئے کھجور کے تنے پر جو پاس ہی پڑا تھا، اکڑوں بیٹھ گئے۔ قریب ہی سرت ساہا اپنی دکان کھول رہا تھا۔ دکان کی دیواریں اور چھت ٹین کی تھیں جو خوش حالی کی دلیل تھی۔ گاؤں میں یہ سب سے بڑی دکان تھی اور یہاں گاؤں کی ضرورت کی قریب قریب سب ہی چیزیں مل جاتی تھیں۔ دال، چاول، نمک، مرچ، ملون تیل، ملون گھی، مٹی کا تیل، لالٹین کی چمنی، موم بتی، بیپرمنٹ سگریٹ، بیڑی، دیا سلائی وغیرہ وغیرہ۔ سرت نے جمعدار صاحب کو کھجور کے تنے پر بیٹھتے دیکھ کے کہا، ’’کاکا وہاں کیا بیٹھے ہو یہاں آکے بیٹھو نا، تمھاری دکان ہے۔‘‘ جمعدار صاحب، ’’خیر، سنو‘‘ کہہ کے قصہ شروع کر چکے تھے۔ اب وہ کہاں اٹھ کے جاتے، انھوں نے مکھی اڑانے کے انداز میں جواب دیا، ’’ٹھیک ہے‘‘ اور قصہ سنانے میں لگ گئے۔ ’’جرمن

سپاہی ارے باپ رے باپ، آدمی نہیں جنات۔"

"گوروں سے بڑھ کے؟" پھول محمد نے پوچھا۔

"ارے گورے کیا کھا کے لڑیں گے۔ گورے ہی لڑ پاتے تو ہم لوگ کاہے کو جاتے۔"

قصے کی رو میں جمعدار صاحب بہنے لگے، ان کے دستے نے ایک چوکی پر حملہ کیا۔ بڑی گھسان کی لڑائی ہوئی، ان کے کئی بہادر کام آئے۔ آخر چوکی سے گولہ باری بند ہوگئی۔ سمجھے، دشمنوں کے سب سپاہی مارے گئے۔ چوکی میں گھسے تو کوئی اندہ نہ بندہ، صرف ایک سپاہی زمین پر لہولہان پڑا تھا۔ اس ایک نے اتنی آفت ڈھائی تھی۔ جمعدار صاحب اس کے پاس سے گزرے تو ایک دم سے زخمی شیر کی طرح جھپٹ پڑا۔ یہ پہلے تو لڑکھڑا گئے، مگر پھر فوراً قدم جما کے گتھ گئے۔ ایک گھنٹے تک گتھم گتھا رہی۔ انھوں نے اس کے گلے میں اپنی لوہے جیسی انگلیاں دھنسانی شروع کیں۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، مگر مردود نے مرتے مرتے بھی (ہاتھ میں ایک نشان دکھاتے ہوئے) ان کے ہاتھ میں اس زور سے دانت کاٹا کہ ان کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

پھول محمد سے نہ رہا گیا۔ وہ ہنس پڑا۔ اور بولا "مگر چاچا یہ نشان تو پھوڑے کا ہے۔"

"پھوڑا کب نکلا تھا، جھوٹا کہیں کا۔"

پھول محمد نے تفصیل بتائی۔ جمعدار صاحب نے مزید انکار مناسب نہ سمجھا، کیونکہ انھیں یاد آ گیا کہ پھول محمد ہی تو اس وقت ہسپتال سے دوا لایا کرتا تھا۔ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولے، "او، وہ پھوڑا۔ میں بھول ہی گیا تھا۔ ہاں ان دانتوں کا زہر اب تک باقی رہ گیا ہے۔ تھوڑے تھوڑے دن پر یہاں پھوڑا نکل آتا ہے۔" جمعدار صاحب صاف بات بنا گئے اور پھول محمد منہ دیکھتا رہ گیا۔

"تو بھیا جرمن ترکن سے بھی بڑھ گئے؟" ایک نے سوال کیا۔

جمعدار صاحب کو دوسرے دھارے میں بہہ نکلنے کا اچھا موقع ملا۔ اب ترکوں کا ذکر شروع ہوگیا، وہ ان کا چوڑا چکلا سینہ، بلند و بالا قد، فولاد جیسی کلائیاں۔ ایک گھونسا ماردیں تو بھیجا چھٹک جائے۔ ایک ترک دس دس انگریزوں پر بھاری، صورت دیکھتے ہی دل دہل جائے۔ ایک گورے کا

اتفاق سے ایک ترکی سپاہی سے آمنا سامنا ہوگیا۔ بے چارے کو اسی وقت کھڑے کھڑے ہیضہ ہوگیا۔ اب بازار میں سودا سلف لینے والوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی تھی۔ جمعدار صاحب کے محلے کی مسجد کے مؤذن صاحب مولوی نورالانوار بھی آ کھڑے ہو گئے تھے۔ انھیں جمعدار صاحب نے دو پیسے دیے کہ اس کا پان لے کے ان کے گھر پہنچادیں اور یہ کہہ دیں کہ جمعدار صاحب ذرا ضروری کام میں لگے ہیں اور ان کے آنے میں ابھی دیر ہے۔ مؤذن صاحب اس قسم کے حکم اکثر فوراً بجالاتے تھے۔ درحقیقت مسجد میں اذان دینے اور نماز پڑھانے کے علاوہ ان کا بڑا کام سودا سلف لانا تھا، مگر اس وقت ترکوں کا ذکر ہورہا تھا۔ اس لیے ان کا دل چاہتا تھا کہ اس کو ذرا سن لیں تو جائیں۔ جمعدار صاحب ترکوں کی عظمت کا ذکر کر کے حسب معمول ذرا رک سے گئے۔ پھول محمد نے مطلب بھانپ لیا اور کہا، ''چاچا! اپنا وہ قصہ تو سنایئے ترکوں سے چوکی چھیننے والا۔'' جمعدار صاحب یہ قصہ تھوڑے تھوڑے اختلافات کے ساتھ کئی دفعہ پہلے بھی سنا چکے تھے۔ اب پھر سلسلہ شروع ہوگیا۔ جمعدار صاحب کے دستے نے بغداد کے قریب ترکوں کی چوکی پر حملہ کیا۔ دستے کے کچھ سپاہی مارے گئے۔ باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ جمعدار صاحب تن تنہا بڑھتے گئے۔ بڑھتے گئے۔ گولیاں ان کے سر پر سے زن زن نکل رہی تھیں۔ گولے ان کے پاؤں کے پاس دَن دَن پھٹ رہے تھے۔ وہ دھادھم جست کرتے جارہے تھے۔ بالآخر چوکی میں گھس ہی گئے۔ ترک ان پر سنگین لے کر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے وہی سنگین چھین چھین کے ترکوں کے سینوں کے پار کردی اور اس طرح ایک دو نہیں سات ترکوں کا خاتمہ کردیا۔ مولوی نورالانوار کو عموماً جمعدار صاحب کی بہادری کے قصوں سے خوشی ہوا کرتی تھی، مگر آج انھوں نے ترکوں کی شکست کا حال سنا تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ سنگین ترکوں کے نہیں، بلکہ ان کے سینے کے پار ہورہی ہیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا، کاش یہ بات غلط ہوتی۔ اب ان سے وہاں زیادہ دیر تک ٹھہرتے نہ بنا اور وہ سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ اپنے سے بیزار ساری دنیا سے بیزار۔ اُن کے جانے پر کسی نے توجہ نہ کی۔ قصہ جاری رہا۔ اس معرکے میں جمعدار صاحب کو پورے اکیس زخم لگے، مگر انھوں نے جب تک چوکی پر وہ جھنڈا نصب نہ کرلیا جسے وہ اپنے دانتوں میں دبائے ہوئے تھے، اُس وقت تک انھوں نے دم نہ لیا۔ جنرل صاحب نے آ کے دیکھا تو بڑی شاباشی دی اور کہا،

''ول منشی صاحب، ایسا بہادری کا کام تو ہم آج تک نہیں دیکھا'' اسی وقت اس نے جمعدار بنا دیا۔ پھول محمد نے پھر ٹانگ اڑائی اور یاد دلایا کہ پہلے تو انھوں نے بتایا تھا کہ ایک ڈوبتی ہوئی میم کی جان بچانے کے صلے میں جمعدار بنے تھے۔ جمعدار صاحب ذرا جھجکے پھر فوراً ہی تسلیم کر لیا کہ وہ وجہ بھی تھی۔ درحقیقت جمعداری آسانی سے نہیں ملا کرتی۔

نگن بابو وہاں کے زمیندار کے کارندے بھی سننے والوں کے مجمعے میں شریک ہو گئے تھے۔لوگ کچھ تو کہانی سننے اور کچھ کاہلی میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ ان کے آنے کا کسی کو پتا نہ چلا۔ ان کا ایک ہاتھ سر کے چٹیل میدان میں تفریح کر رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ پھولے ہوئے پیٹ کے احساس امیری سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور وہ اس تجمل سے جمعدار صاحب کی داستان سرائی سے محظوظ ہو رہے تھے۔کئی دفعہ انھوں نے بولنا چاہا تھا، مگر بول نہ سکے تھے۔اب انھیں موقع ملا۔ جوش میں آ کے اردو میں بولے،''ایسا بڑا بڑا بات پر تو جھکٹو ریا کراس ملنا درکار تھا'' ان کی آواز سنتے ہی جو شخص ان کے سامنے کھڑا تھا، احتراماً ہٹ گیا۔ جمعدار صاحب نے پہلو بدل کر دونوں ہاتھوں سے نمسکار کیا اور فرمایا،''ملا تھا بابو صاحب، وہ تو ہم رزائن دیتے وقت واپس کر دیا۔'' پھر انھوں نے تفصیل بتائی کہ کس طرح جب وہ اپنے سب تمغے لگاتے تو سینے پر جگہ باقی نہ رہ جاتی وغیرہ وغیرہ۔ جلودھر کو یہ سب باتیں بکواس معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ کھسیا رہا تھا، مگر مجبوراً سن رہا تھا۔اب اس سے نہ رہا گیا۔ غصے کی بات تھی، اس لیے اُردو میں کی گئی، بول اٹھا،''رزائن دیا تھا یا نکالا گیا۔''

جمعدار صاحب گرجے،''چوپ۔'' مگر اس ''چوپ'' کا جلودھر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جیسے بطخ کے پروں پر سے پانی پھسل جائے۔

اس نے کہا،''آپ بتاؤ آپ کے بٹیلین کا نام کیا تھا؟''

جمعدار صاحب نے غصے اور حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

''آپ نہیں بولے گا تو کیا، سب جانتا ہے کہ آپ کا بٹیلین ڈرپوکی کے کارن توڑ دیا گیا تھا۔آپ سارا بات جھوٹ بولتا ہے۔''

جمعدار صاحب کے غصے کا بم پھٹا،''تم جھوٹا تمھارا باپ جھوٹا، تم خود نوکری سے نکالا گیا اور

اب یہاں گاؤں میں آ کے بدمعاشی کرتا ہے۔" فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور چلنے لگے۔

سرت ساہا نے کہا،" کا کا جانے دو، جانے دو۔ ارے کچھ گھر کے لیے تو لیے جاؤ۔"

جمعدار صاحب،" نہیں جھوٹا کہیں کا۔ نہیں، اس وقت پیسا نہیں ہے۔"

سرت نے کہا،" کا کا پیسے کا کیا ہے پھر دے دینا۔ ساری دکان تمھاری ہے، لیو نیا نیا لیمن چوس آیا ہے۔ تھوڑا سا لیے جاؤ چھانو میاں کے لیے۔"

لیمن چوس اور چھانو کے ذکر پر جمعدار صاحب پسیج گئے۔ جب وہ لیمن چوس لے کر جائیں گے تو وہ کس طرح دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ جائے گا۔ وہ اس کو گود میں اٹھا کے لیمن چوس دیں گے، اور وہ بجائے چوسنے کے اسے لے کر کھا جائے گا۔ اس خیال سے اُن کا غصہ ہوا ہو گیا، اور وہ کچھ لیمن چوس اور "عزیزہ اہلیہ" کے لیے ناریل کا تیل لے کر چل پڑے۔ جاتے وقت انھوں نے جلو دھر کو اس طرح دیکھا جیسے نظروں ہی سے کچا کھا جائیں گے۔

جلو دھر نے جو لوگ باقی رہ گئے تھے، ان سے مخاطب ہو کر کہا،" ہم سب خبر لیا ہے۔ یہ جمعدار کبھی نہیں بنا۔ تھوڑا دن سپاہی رہا پھر پلٹن ٹوٹ گیا۔"

نگن بابو بولے،" ہاں جھوٹ تو جرور بولتا ہے۔ اس دن بولتا تھا، ہم ریزائن دھرم کے کارن دیا۔ ترکوں پر گولی چلانے کو بولا گیا، یہ بولا ترک ہمارا دھرم کا بھائی ہے، ہم ان پر گولی نہیں چلانے سکتا، آج بولتا ہے سات ترک مارا۔"

پھول محمد کو جمعدار صاحب پر اعتراض کرنے میں خود تو مزہ ضرور آتا تھا، مگر کسی اور کا اعتراض کرنا اور وہ بھی ان کے پیٹھ پیچھے اسے نہ بھایا اور وہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قدم بڑھا کر جمعدار صاحب کے پاس جا پہنچا اور ان سے کہا،" لاؤ چاچا میں پہنچا دوں۔" جمعدار صاحب نے "نہیں رہنے دو" کہتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تیل کی بوتل دے دی، مگر "لیمن چوس" کی پڑیا اپنی مٹھی میں دبائے رکھی۔

☯......☯......☯

دوسرا باب

تیسری ستمبر ۱۹۳۹ء کی صبح کو گھوڑا مارا بازار میں لوگ معمول سے زیادہ نظر آرہے تھے، سودا سلف کم، باتیں زیادہ۔ جگہ جگہ ٹولیوں میں کھڑے باتیں کررہے تھے۔ جمعدار صاحب بھی ایک جگہ آفتاب بنے ہوئے اپنے سیاروں کے جھرمٹ میں جلوہ فرما تھے۔ پھول محمد کہہ رہا تھا، ''چاچا اب کیا ہوگا؟''

چاچا بولے، ''ہوگا کیا، بس دیکھتے جاؤ۔'' مؤذن صاحب نے آہستہ سے کہا، ''خدا کا قہر نازل ہورہا ہے، اور کیا۔''

کچھ فاصلے پر بھیڑ زیادہ نظر آرہی تھی۔ جمعدار صاحب کے پاس جو لوگ کھڑے تھے، ایک ایک کرکے ادھر جارہے تھے۔ بالآخر پھول محمد اور مؤذن صاحب ہی رہ گئے۔ جمعدار صاحب ذرا کھسیائے، پھول محمد بھانپ گیا۔ بولا، ''چاچا وہ بیٹا جلودھر لوگوں سے، معلوم کیا کیا کہہ رہا ہے۔ چاچا چلیں تو بیٹا کو پتا چلے۔''

چاچا نے فرمایا، ''جاؤ بلا لاؤ۔ کہو جمعدار صاحب بلا رہے ہیں۔''

پھول محمد سمجھا جلودھر بلانے سے تو آئے گا نہیں، فضول جمعدار صاحب کی سبکی ہوگی، مگر یہ بات کہے کیسے، بات بنا کر بولا، ''نہیں چاچا چل کے ایک ڈانٹ بتائیں تو بیٹا بھاگے۔''

چاچا نے کہا، ''ہم تو بیٹا کو بلا کے رہتے، مگر اب تم کہہ رہے ہو تو خیر چلو۔''

پھول محمد خوش خوش آگے آگے اور جمعدار صاحب اکڑتے ہوئے ذرا پیچھے چلے۔ وہاں پہنچے تو جلودھر کہہ رہا تھا، ''سن رہے ہو نا بھائیو، جرمن انگریز پھر لڑے رہے ہیں تو لڑیں، دونوں اپنا اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں، ہم کا ہے کو الو بنیں۔''

جمعدار صاحب گرجے، ''تم تو خود الو ہو۔ موٹا موٹا چشمہ لگی ہوئی اپنی الو جیسی آنکھیں تو دیکھو۔''

جلودھر نے ایسا معلوم ہوا کہ سنا ہی نہیں، کچھ لوگ تھوڑا بہت ہنس دیے، مگر بات ان کے مطلب کی ہو رہی تھی۔ اس لیے پھر سننے لگے۔

سرت ساہا نے کہا، ''بھیا یہ بتاؤ پہلی والی جرمن کی لڑائی کی طرح بازار پھر تیز ہوگا کہ نہیں۔ ہم سے لڑائی سسری سے اور کچھ مطلب نہیں۔''

جلودھر، ''بازار کی بات نہ پوچھو۔''

سرت، ''تم تو بھیا پڑھے لکھے ہو بتاؤ نا۔''

جمعدار صاحب، ''ارے ہم سے پوچھو، چلو بیٹھ کے دکان میں بات کریں، بیٹا جلودھر بھاگو یہاں سے۔'' جلودھر نے سنی ان سنی کر دی۔ جمعدار صاحب بولے، ''بھیج دو بیٹا کولام پر لفٹ رائٹ کرتے کرتے مزاج درست ہو جائے گا۔''

جلودھر نے ذرا مسکراتے ہوئے کہا، ''زمادار شاب تو خود ہی جانتے ہیں لڑائی کتنی بری چیز ہے۔''

پھول محمد بول اٹھا، ''جلودھر بابو نے بھی آخر چاچا کو زمادار شاب کہا۔ واہ رے زمادار شاب۔''

جلودھر نے کہا، ''زمادار شاب آپ بتایئے نا... لام پر کتنی تکلیف ہوتی ہے۔'' جمعدار صاحب کی منہ مانگی مراد بر آئی۔ اب وہ جلودھر کے مجمعے پر چھا جائیں گے۔ ہر شخص انھیں کو دیکھے گا۔ انھیں کی بات سنے گا۔ وہی وہ ہوں گے، مسکرا کر فرمانے لگے، ''بھائیو بات تو ٹھیک ہے۔ لڑائی! ارے باپ رے باپ، بس یہ سمجھ لو ہمارے ایسا آدمی بھی گھبرا اٹھا۔ جس وقت گولے پھٹتے ہیں کچھ نہ پوچھو بڑے بڑے صاحب لوگوں کے پتلون خراب ہو جاتے ہیں، ہمارے پاس ایک بڑا جانڈیل سپاہی کھڑا تھا۔ ایک دم گر کے مر گیا۔ دیکھا تو کہیں زخم نہیں۔ خالی ڈر سے مر گیا تھا۔ ہم خود ایک دفعہ گر پڑے تھے۔''

پھول محمد کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی اور اُس نے بڑے معصومانہ انداز میں پوچھا، ''تو پھر آپ مرے کہ بچے؟'' جمعدار صاحب نے سوال کی نوعیت پر غور کیے بغیر جواب دیا، ''ارے مرتے کیا، ہم گولی کھا کے تو مرے نہیں، ہمارا مرنا بھلا ایسا آسان ہے۔''

سرت سا ہا بولا، ''مر گئے ہوتے تو یہاں کھڑے ہوتے، تم بھی بڑے بیوقوف ہو۔''

پھول محمد نے کہا، ''ہم تم سے نہیں پوچھ رہے ہیں، اپنے چاچا سے پوچھ رہے ہیں۔''

چاچا گرجے، ''ٹھیک تو، تم کون ہوتے ہو بولنے والے، ہاں بیٹا پوچھو۔''

پھول محمد، ''تو پھر کیا ہوا چاچا آپ گر پڑے، پھر؟''

جمعدار صاحب، ''پھر بھیا ہم چپ سادھے پڑے رہے۔ ہم نے کہا کون سسر مفت جان دے۔''

جلودھر، ''زمادار شاب بہت عقل مند آدمی ہیں۔''

پھول محمد، ''چاچا مفت نہیں تو کیا آپ دام لے کے جان دیتے؟''

جمعدار صاحب، ''ارے بیٹا خدا رسول کے لیے لڑنے مرنے کی اور بات ہے پھر غازی یا شہید، انگریزوں کے لیے چار پیسوں میں کون جان دے۔ کتنا صاحب لوگوں نے کہا، جمعدار صاحب آپ کاہے کو جاتا ہے۔ آپ بہت اچھا لڑا ہے، مگر ہم ایک نہیں سنا۔''

جلودھر، ''تو یہ لڑائی بھی کیا خدا رسول کے لیے ہے۔ یہ بھی تو انگریزوں کے لیے۔''

جمعدار صاحب، ''تو ہم کب جا رہے ہیں چٹھی تو ضرور آئے گی، مگر ہم کہہ دیں گے نہیں آتے۔ جلودھر بابو آپ ابھی سے لکھ دیجیے کہ جمعدار صاحب اس لڑائی میں نہیں آئیں گے، تم لوگ خود کٹو مرو۔''

پھول محمد، ''چاچا تو پھر جرمنوں کا منہ کون توڑے گا۔''

جلودھر، ''زمادار شاب سے کیا پوچھ کر لڑے ہیں کہ زمادار شاب مدد کو جائیں گے۔''

جمعدار صاحب، ''اور کیا، ہم سے مطلب؟ جلودھر بابو کہہ تو دیا ہم اب مدد نہیں کریں گے۔

چٹھی میں یہ بھی لکھ دیجیے کہ جمعدار صاحب سے پوچھ کے تو تم لڑے نہیں۔ اب وہ کاہے کو لڑیں۔"

جلودھر کو اپنی اس کامیابی پر بڑی خوشی ہوئی اور اُس نے جمعدار صاحب کی پیٹھ ٹھونکی، جمعدار صاحب کو اس چھوکرے کا ان کی پیٹھ ٹھوکنا ناگوار تو گزرا، مگر اس میں اپنی تعریف نکلتی تھی۔ اس لیے چپ ہو رہے۔

۲

جمعدار صاحب اکڑتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی فرمایا، "ارے سنا بی بی جان جرمن کی لڑائی پھر شروع ہوگئی۔"

"تو تم پھر جاؤ گے کیا؟ میں تو سمجھ ہی رہی تھی۔"

"نہیں ہم نہیں جائیں گے۔ تمھاری خاطر، جاتے تو کتنے جرمنوں کو مارتے، ہاتھ کھجلا رہا ہے، مگر اب کون جائے۔ تم برا مانتی ہو۔ ہم نے جلودھر بابو سے کہہ دیا ہے کہ ابھی سے لکھ دیں کہ جمعدار صاحب نہیں جائیں گے۔"

بی بی جان نے خوش ہو کے پوچھا، "سچ؟ کھاؤ چھانو کی قسم۔"

"اتنی ذرا سی بات پر اتنی بڑی قسم نہ لو۔ بس سمجھ لو نہیں جائیں گے۔ تمھیں یقین نہیں آتا۔ تو ہم وہ چٹھی پڑھ کے سنا دیں گے جو جلودھر بابو لکھ رہے ہیں۔"

"یہ جلودھر بابو کون ہیں؟"

"ارے بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بہت پبلک کا کام کرتے ہیں۔ ہم کو بہت مانتے ہیں۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔"

"تم سے بھی زیادہ؟"

"ارے ہم سے زیادہ کیا، بس ہمارے بعد سمجھو۔"

چھانو دوڑتا ہوا باہر سے آیا اور "ابا لیمن چوس لائے؟" کہہ کے ان کے پاؤں سے لپٹ

گیا۔

''ارے بیٹا بھول ہی گئے۔لڑائی کی بات میں ایسا لگ گئے کہ بس،کل ضرور لا دیں گے۔''

''نہیں آج۔''

جمعدار صاحب،''اچھا بیٹا'' کہہ کے باہر جانے لگے۔ بی بی جان بولیں،''ابھی تو آئے ہو،اب رہنے دوکل لا دینا۔''

جمعدار صاحب،''نہیں ابوالبرکات کا جی چھوٹا ہوگا۔ ابھی لے آتا ہوں۔ آؤ بیٹا چھانو......ارے توبہ شان خدا۔''

بی بی جان،''بچے کو دھوپ میں اتنی دور لے جاؤ گے؟''

جمعدار صاحب،''مرد کا بچہ ہے ضرور جائے گا۔''

بی بی جان،''ابھی میں اس دن تالاب میں اپنے ساتھ تیرا رہی تھی تم تو منع کر رہے تھے کہ سردی لگ جائے گی۔''

جمعدار صاحب،''بحث نہ کیا کرو،سردی اور دھوپ ایک ہے؟''

بی بی جان طنزاً بولیں،''نہیں بڑا فرق ہے۔''

جمعدار صاحب،''ہئی ہے....آؤ بیٹا۔ میرا شان۔ میرا جان۔''

''میرا شان میرا جان'' نے ان کی انگلی پکڑی اور ان کے ساتھ باہر چلا گیا۔

۳

''ابے او قیص۔کمیچ کے بچے،کمیچ کی دم،کہاں مر گیا۔موتی کو اب تک نہیں کھلایا۔'' جمعدار صاحب گھر سے باہر نکل کر چیخ رہے تھے۔قیص غائب تھا۔''کیا بتایا جائے۔ہم لڑائی کے چکر میں رہ گئے۔یہاں ہماری موتی بے چاری بھوکی رہ گئی۔کہاں ہے بے کمیچو! کمیچ کمیچ۔'' قیص دور سے دوڑتا ہوا نظر آیا۔ جمعدار صاحب ڈپٹے،''ادھر آ۔'' بے چارا سہا ہوا آیا۔''کہاں مر گیا تھا۔'' چپ۔''بولتا

کیوں نہیں؟'' چپ (گوشمالی فرماتے ہوئے)، ''ابے بول۔''

قمیص نے کچھ منمنا کے کہا صرف ''جرمن'' اور ''لڑائی'' کے الفاظ سمجھ میں آ سکے۔

جمعدار صاحب، ''ابے تیرا باپ بھی کبھی لڑائی میں گیا تھا کہ تو ہی لڑائی کی باتیں سننے چلا ہے؟ تجھ سے ان باتوں سے مطلب؟ چل کھلا موتی کو، کیا بتایا جائے۔ نہ باپ نہ دادے، یہ بیٹا کمبخت بھی لڑائی کی باتیں سننے چلے۔ عجیب زمانہ لگا ہے۔''

قمیص پوال کے ایک انبار میں ڈھکا ہوا اس طرح چلا آ رہا تھا جیسے پوال کی ڈھیری میں جان پڑ گئی ہو اور وہ لڑھکتی چلی آ رہی ہو۔ جمعدار صاحب گرجے، ''بیٹا اگر اب لڑائی کی باتیں سننے گئے تو ٹانگ توڑ دوں گا۔ کھلا ٹھیک سے موتی کو۔'' بڑھ کے موتی کو تھپتھپانے لگے۔

چھانو، ''لیمن چوس۔''

جمعدار صاحب، ''یہ حرام زادے کمبخت کی وجہ سے بھول گئے۔ چلو بیٹا۔''

پھول محمد شورسن کے آ گیا تھا اور کھڑا مسکرا رہا تھا، ''لاؤ چاچا، لا دوں۔''

جمعدار صاحب نے دیکھا دھوپ واقعی تیز ہے۔ پھر چھانو کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہا، ''اچھا لے آؤ۔''

پھول محمد پیسے لے کر بڑھا، تیز تیز جا رہا تھا، جمعدار صاحب نے پکار کر کہا، ''جلدی آنا اور ہاں۔ کہیں کھا نہ جانا۔''

پھول محمد نے چلا کر کہا، ''چاچا ایک لیمن چوس، بس ایک۔''

جمعدار صاحب سوچنے لگے، لونڈا بڑا شریر ہے۔

⊙......⊙......⊙

تیسرا باب

وقت گزرتا گیا، لڑائی زور پکڑتی گئی۔ قیمتیں ایک کی دس ہونے لگیں۔ بازار میں چیزیں دس کی جگہ ایک نظر آنے لگیں۔ جیبیں بھرنے لگیں۔ پیٹ خالی ہونے لگے، لڑائی میں لوگوں کی بھرتی روز بروز بڑھنے لگی۔ کم سے کم وہاں پیٹ بھر کے کھانے کو تو ملے گا۔ لاکھ نگن بابو نے کانگریس کی طرف سے اور جلو دھر نے کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے منع کیا، مگر لوگ نہ مانے۔ آنریری ریکروٹنگ افسر بھی مقرر کیے جانے لگے۔

گھوڑا مارا کے ایک وکیل صاحب تھے جو ضلع کے صدر مقام میں وکالت کرتے تھے۔ نام نامی مولوی نیر الاسلام تھا، مگر لوگ 'پونیر میاں' کہتے تھے۔ وہ بھی اس قسم کے ایک افسر ہو گئے۔ پونیر میاں گاؤں کے ہر قومی کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ کچھ دنوں سے ایک ہائی اسکول قائم کرنے کا خیال ان کے دماغ میں چکر کھا رہا تھا۔ جب لوہا گاڑا میں، جو صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا، ایک ہائی اسکول چل سکتا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ گھوڑا مارا میں نہ چل سکے۔ آخر گھوڑا مارا کے لڑکے ایک میل چل کے دوسرے گاؤں میں پڑھنے کیوں جائیں۔ پڑھانے کے لیے پینتیس پینتیس چالیس چالیس روپے میں دو ایک گریجویٹ اور پچیس پچیس تیس تیس روپے میں پانچ چھ میٹرک مل ہی جائیں گے۔ 'پنیر میاں' کا داماد سلطان احمد جس نے حال ہی میں بی اے پاس کیا تھا، ہیڈ ماسٹری کا کام چلا لے گا، اور کیا چاہیے۔ جہاں تک خرچ کا سوال ہے ستر پچھتر لڑکے تو مل ہی جائیں گے۔ کچھ فیس کی آمد ہوگی۔ کچھ چندے کی، گورنمنٹ سے بھی 'پونیر میاں' شاید کچھ وصول کر ہی لیں۔ کام چلانے کو کافی ہے، اگر بعد میں لڑکے زیادہ ہو گئے تو اسکول سے کچھ آمدنی ہی ہو جایا کرے گی۔ یہ سوچ ساچ کر ''پونیر میاں'' نے ایک جلسہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جلسے سے پہلے ''پونیر میاں'' نے مناسب سمجھا کہ

جلودھر بابو کو اس نیک کام میں شریک کرلیں۔ انھیں اسکول میں ماسٹر بنانے کی امید دلائی، بلکہ وعدہ ہی کرلیا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ جلودھر نے پرجوش تائید کی۔ اس کی رائے تھی کہ جمعدار صاحب کو بھی اس کام میں شریک کرلیا جائے۔ ''پونیر میاں'' کو یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ جمعدار صاحب کا اثر بڑھے، بعد میں شاید وہ ان کے مدمقابل بن جائیں، اور الیکشن وغیرہ میں دشواری ہو۔ انھوں نے کہا، ''وہ جاہل آدمی ہے فضول گڑبڑ پیدا کرے گا، اور کچھ نہیں، اسکول وغیرہ سے اسے کیا واسطہ؟'' الغرض جلسہ ہوا اور جمعدار صاحب نہیں بلائے گئے۔ گاؤں والوں کی زندگی کے پرسکون دریا میں میلوں، ٹھیلوں یا جلسوں ہی سے لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی قسم کا بھی جلسہ ہو لوگوں کی بھیڑ ضرور ہو جاتی ہے، شرط یہ ہے کل جلسہ ایسے دن کیا جائے کہ وہ بازار کا دن نہ ہو اور ایسے زمانے میں کہ فصل کی بوائی کٹائی نہ ہو رہی ہو۔ جلسے کی تقریروں سے لوگوں کو چنداں مطلب نہیں ہوا، جو قراردادیں ان جلسوں میں منظور ہوتی ہیں، ان سے بھی انھیں زیادہ واقفیت نہیں ہوتی۔ آپس میں مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ قصہ ختم، یہی حال اس جلسے کا بھی ہوا۔ جلودھر بابو نے پہلے تقریر کی، اس کے بعد پونیر میاں کی آواز کامل ایک گھنٹے تک زمین سے آسمان تک گونجتی رہی اور سامعین کے کانوں کے پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر فضا میں تحلیل ہوتی رہی، تقریر میں انھوں نے بہت کچھ کہا۔ لوہا گاڑا اور گھوڑا مارا کا تفصیلی ذکر کیا، اور اپنے گاؤں کی برتری ثابت کی۔ اس کے بعد دنیا کی سیر شروع ہوگئی۔ انگلستان، جرمنی، روس تمام گھوم آئے، محض یہ بتانے کے لیے کہ کہاں کہاں لوگوں نے کیسی کیسی قربانیاں کی ہیں۔ کیا گھوڑا مارا والے اپنے گاؤں کو لوہا گاڑا کے مقابلے میں ذلیل ہونے دیں گے۔ انگریز مصنفین کے اقوال سنائے، پہلے انگریزی میں اس کے بعد ترجمہ، ایک حدیث شریف کی طرف بھی اشارہ کیا، وہی چین تک جا کے علم حاصل کرنے والی۔ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ پنیر میاں بے بس تھے ''تو پھر منظور'' کہہ کے بیٹھ گئے اور اس طرح تجویز منظور ہوگئی۔

۲

اسکول کے لیے بانس کے کچھ ٹٹر کھڑے کر دیے گئے، کچھ ٹین، زیادہ تر پرانے، دو ایک نئے کام میں آئے۔ پنیر میاں کا فرمانا تھا کہ ہر بڑے کام کی ابتدا عام طور پر چھوٹے ہی پیانے پر ہوتی ہے، بعد میں جب آمدنی بڑھے گی تو دیکھا جائے گا، الغرض اسکول شروع ہو گیا۔ سلطان احمد ہیڈ ماسٹر ہو گئے اور جلودھرا سسٹنٹ ہیڈ ماسٹر۔

سلطان احمد نے کہا، ''جلودھر بابو ٹیچر تو آ گئے۔ اب لڑکوں کا بھی بندوبست کیجیے۔''

جلودھر نے جواب دیا، ''چھلتان میاں، آہستہ آہستہ لڑکے بھی آ جائیں گے۔ آپ فکر نہ کیجیے، ہم لوگ گاؤں میں گھوم گھوم کر لڑکے اکٹھا کر لیں گے۔

پنیر میاں ذرا تیز آدمی واقع ہوئے تھے۔ بعض وقت ضرورت سے زیادہ تیز ہو جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے جلسے کی روداد بہت بڑھا چڑھا کے اخباروں میں چھپوائی۔ اسکول انسپکٹر صاحب کلکٹر صاحب حتیٰ کہ وزیراعظم کے پاس بھی نقلیں بھیجیں، پھر اسکول قائم ہونے کے بعد اس کے بارے میں برابر لکھتے رہے، جوش میں آ کر معائنہ تک کی دعوت بھی دے دی، ان کے خطوں اور رپورٹوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکول ہے تو بس گھوڑا مارا کا، باقی سب تو جھک مارتے ہیں۔ پنیر میاں کا خیال تھا کلکٹر صاحب تو آئیں وائیں گے نہیں صرف پنیر میاں کا سکہ ان کے دل پر بیٹھ جائے گا، اللہ اللہ خیر صلا، لیکن جب صاحب کا خط ملا کہ وہ آ رہے ہیں تو پنیر میاں چونک پڑے۔ دل میں گھبراہٹ اور خوشی کا تصادم ہو گیا۔ خیر، کچھ نہ کچھ تو انتظام ہو ہی جائے گا، اور گاؤں والوں پر رعب کتنا پڑے گا۔ انھوں نے فوراً اطلاع بھیجی، گاؤں بھر میں لیجیو دیجیو کا شور مچ گیا۔ سلطان میاں نے پنیر میاں کو لکھا کہ یہ تو بڑا غضب ہوا، اسکول میں لڑکے وڑکے تو برائے نام ہیں۔ پنیر میاں جہاں دیدہ آدمی تھے۔ وہ فوراً گھوڑا مارا پہنچے۔ جلودھر سے مشورہ کیا۔ گاؤں میں گھومے پھرے۔ ہر ایک کو سمجھاتے رہے۔ گاؤں میں کلکٹر صاحب کا آنا کتنی بڑی بات ہے۔ پھر کون کلکٹر؟ ''موزید شاب۔''

ان سے کون واقف نہ تھا، پہلے کلکٹروں کا نام کون جانتا تھا۔ انھیں خالی ضلع مجسٹریٹ صاحب کہا کرتے تھے، مگر موزید شاب؟ اس نام سے تو گھر گھر واقف تھا۔ حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کی زبان پر بھی یہ نام چڑھ گیا تھا، اور کیوں نہ چڑھے، وہ کتنے دیالو تھے۔ ان سے غریب امیر سب جب چاہیں مل سکتے تھے، بلکہ سچ مچ وہ خود لوگوں سے جا جا کے بھی ملتے تھے اور بعض وقت تو لوگوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ حاکم ضلع سے بات کر رہے ہیں، وہ سچ مچ ضلع والوں کے مائی باپ تھے۔ جبھی تو وہ گھوڑا مارا جیسے چھوٹے گاؤں میں آنے پر تیار ہو گئے۔ ان کا دھوم دھامی استقبال گھوڑا مارا کے لیے باعث عزت اور گاؤں والوں کے لیے باعثِ برکت ہوگا۔ سب لڑکے جھنڈیاں لے لے کر نکلیں اور زندہ باد وغیرہ کے نعرے لگائیں، اور پھر اسکول میں آ کر بیٹھ جائیں، چاہے پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں، مگر سب اپنے آپ کو طالب علم ظاہر کریں، صاحب خوش ہوں گے اور گھوڑا مارا کی قسمت کھل جائے گی۔

موزید شاب (مجید صاحب) میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، وہ آئی سی ایس کے غیر معمولی لوگوں میں ایک معمولی آدمی تھے، مگر شاید اسی ''معمولی پن'' نے انھیں غیر معمولی بنا دیا تھا۔ نیک نامی بھی ایک طرح سے بدنامی سے ملتی جلتی ہے، یعنی اس سلسلے میں بھی جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ اصلیت سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ''موزید شاب'' کا بھی یہی حال تھا، ان کی نیک نامی کے طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ اگر کبھی رات کو تھوڑی دیر کے لیے وہ کہیں نظر آئے تو مشہور ہو گیا کہ وہ رات رات بھر غریبوں کا حال جاننے کے لیے گھومتے رہتے ہیں، اپنے عہد کے ہارون رشید ہیں، اگر انھوں نے ایک وقت کی نماز کسی مسجد میں پڑھ لی، تو اس بات کے چشم دید گواہ پیدا ہو گئے کہ انھوں نے مجید صاحب کو تہجد کی نماز بھی مسجد میں پڑھتے دیکھا ہے، کسی غریب طالب علم کی انھوں نے کبھی کچھ مدد کر دی تو لوگ کہنے لگے، وہ تو اپنی ساری تنخواہ غریبوں کو بانٹ دیتے ہیں، وہ دو ایک دفعہ اتفاقاً کہیں ایسے وقت پہنچ گئے کہ لوگ لاٹھی پاٹھی لیے کسی کھیت کے لیے لڑنے مرنے پر تلے ہیں یا سر پھٹول ہو رہی ہے، یار لوگ لے اُڑے موزید شاب ہر جگہ ہر وقت پہنچ جاتے ہیں، بعض خوش عقیدہ لوگوں نے انھیں ولایت کے درجے تک پہنچا دیا۔ وہ گھوڑا مارا اب تک نہ آئے تھے، مگر لوگ ان کے

نام سے کچھ ایسے مانوس معلوم ہوتے تھے کہ جیسے وہ اپنے ہی آدمی ہوں۔ گھوڑا مارا میں کوئی بھی کلکٹر آنے والا ہوتا تو اس کا دھوم دھامی استقبال ضرور ہوتا، موز ید شاب کے لیے تو خاص الخاص انتظامات کرنے کا ہر ایک کا جی چاہ رہا تھا۔ لہٰذا پنیر میاں کو زیادہ کہنے کی اس بارے میں چنداں ضرورت نہ تھی، وہ خود بھی یہ سمجھتے تھے، مگر ایک تو وکالت پیشہ آدمی پھر سیاست پیشہ بھی ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے کچھ تقریر اور پروپیگنڈے کی مشق ضروری تھی، الغرض بڑے زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔

۳

جمعدار صاحب خون کا گھونٹ پی رہے تھے۔ اسکول کے قیام کے سلسلے سے جو پنیر میاں نے جلسہ کیا تھا، اس میں ان کا نہ بلایا جانا تکلیف دہ ضرور تھا، مگر اب مجید صاحب آئیں گے۔ وہ جمعدار صاحب کی کتنی عزت افزائی کرتے، ایسے موقعے پر جمعدار صاحب نہ پوچھے جائیں اور پنیر میاں بازی لے جائیں تو غضب ہے، کیا کریں کیا نہ کریں، اسی اُدھیڑ بُن میں تھے، گھر میں ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو رہے تھے۔ بی بی جان پر کئی دفعہ کھسیا چکے تھے، یعنی انھیں کئی مرتبہ ''عزیزہ اہلیہ'' کہہ چکے تھے، چھانو کو بھی بغیر کہے ہاتھ سے ہٹا دیتے تھے۔ موتی کی طرف بھی توجہ نہ کی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت چوکی سے ان کا پاؤں ٹکرا گیا تو اسے موٹی سی گالی دے کر دور پھینک دیا۔ زیادہ وقت ٹہلنے اور داڑھی کھجانے میں گزر رہا تھا۔ پریشانی زیادہ بڑھی تو انھیں اپنے ''باپ جان'' کا خیال آیا جو انھیں دنیا میں لا کے اور یہاں کی پریشانیوں میں ڈال کے رخصت ہو گئے تھے اور گھر کے صحن کے ایک کونے میں امرود کے درخت کے نیچے ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے۔ اونچی زمین کی قلت کی وجہ سے اکثر لوگ جس گھر میں چند روزہ زندگی کے دن کاٹتے تھے اسی کے ایک گوشے میں ہمیشہ کی نیند بھی سویا کرتے تھے۔ یہی حال جمعدار صاحب کے والد کا بھی ہوا تھا۔ قبر پر جمعدار صاحب نے اپنے ہاتھ سے امرود کا پیڑ لگایا تھا اور اس کی خاص توجہ سے نگہداشت کرتے تھے، اسے سینچتے بھی خود تھے۔ ایک آدھ مرتبہ بکری نے کچھ پتے چر لیے تھے، انھوں نے اسے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا تھا۔ پریشانی میں عموماً وہ اس قبر کی

طرف رجوع کرتے اور بہت گڑگڑا کر اپنے والد مرحوم کی روح سے اپنا دکھڑا بیان کرتے، چنانچہ وہ آج بھی قبر پر گئے اور دیر تک وہاں رہے۔ جب وہاں سے لوٹے تو ان کا چہرہ بھر بھرایا ہوا، آواز بھرائی ہوئی، آنکھیں سرخ اور داڑھی بھیگی ہوئی تھی۔ پھول محمد کو دیکھ کے انھوں نے اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کی۔ پھول محمد نے تیاریوں کا تفصیلی ذکر شروع کیا۔ جمعدار صاحب کے دل کو سن کے تکلیف ہو رہی تھی، بات بیچ بیچ میں کاٹ دیتے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ستانے میں پھول محمد کو مزہ آ رہا ہے، وہ ظالم پھر وہی ذکر چھیڑ دیتا، بالآخر جمعدار صاحب سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کہا، ''کوئی اور بات کرو، تم بھی اس حرام زادے جلودھر کی طرح پنیر میاں سے مل گئے ہو کیا۔''

پھول محمد نے ایسی نظر سے دیکھا جس میں کچھ غصہ شکایت، جمعدار صاحب نے معذرت کے لہجے میں کہا، ''تو پھر کیوں رٹ لگائے ہو، ہم یہ سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔''

مولوی نورالانوار مؤذن بھی آ گئے، کہنے لگے، ''پنیر میاں اسکول کھول رہے ہیں تو آپ مدرسہ کھول دیجیے۔'' پھول محمد اچھل پڑا۔ ''واہ مؤذن صاحب کیا بات کہی ہے، بس بس چاچا آپ مدرسہ کھول دیں۔''

جمعدار صاحب کے چہرے پر بشاشت کھیلنے لگی، کچھ تعریفی کلمے خود بھی کہنا چاہتے تھے، مگر پھر یکایک انھیں خیال آیا کہ اس تجویز کا سہرا مؤذن صاحب کے سر کیوں رہے۔ وہ حسب معمول خود ہی دولھا کیوں نہ بنیں، فرمانے لگے، ''میں تو خود ہی بہت دن سے سوچ رہا تھا، یہ اسکول وسکول تو لوگوں کو بے دین بنانے کے کارخانے ہیں۔ مدرسے میں خدا رسول کی بات بتائی جائے گی نماز روزہ آئے گا۔''

پھول محمد، ''چاچا آپ بھی تو کسی اسکول میں نہیں پڑھے ہیں۔''

چاچا، ''چاچا اسکول کاہے کو جاتے، پاگل تھوڑی تھے۔''

پھول محمد، ''تو چاچا، پھر مدرسہ کھول دیں، مؤذن صاحب پڑھا لیں گے، چاچا بھی دو ایک سبق دے دیا کریں۔ مسجد میں مدرسہ شروع ہو جائے۔''

چاچا، ''ہاں ہاں سب ٹھیک ہو جائے گا، مگر اب جو مجید صاحب کے سامنے بنیر بازی لے جائے گا، اس کا کیا علاج۔''

پھول محمد، ''چاچا بلائیں گے تو موزید شاب مدرسہ دیکھنے بھی ضرور آئیں گے، چاچا کے بلانے سے کون نہ آئے گا۔'' چاچا کو اتنا یقین نہ تھا، مگر انھوں نے پھر بھی سر ہلا دیا۔ پھول محمد نے کا، ''صاحب کو چاچا فوراً خط لکھ دیں۔'' چاچا کو اتنا لکھنا پڑھنا تو آتا نہ تھا۔ جلو دھر سے بھی خط لکھنے کو نہ کہہ سکتے تھے۔ ذرا تشویش میں پڑ گئے۔ پھول محمد نے کہا، ''کیا سوچ رہے ہیں۔''

چاچا، ''یہی کہ لکھیں کہ نہ لکھیں مدرسے کی بات ہے — عربی میں۔''

پھول محمد نے مسکرا کر کہا، ''تو پھر چاچا جانے دیں، موزید شاب سے زبانی کہیں۔''

چاچا نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔ پھول محمد بولا ''تو آج سے چاچا کے مدرسے میں چھانو میاں ک، میج اور پھول محمد نے پڑھائی شروع کر دیں۔''

چاچا، ''جاؤ بغدادی قاعدہ لے آؤ۔'' مؤذن صاحب سے مخاطب ہو کے جو بے چارے چپ چاپ کھڑے تھے اور جنھیں بولنے کا موقع نہ ملا تھا، بولے، ''مؤذن صاحب اللہ کا نام لے کے آپ آج ہی سے پڑھانا شروع کر دیں۔''

۴

پھول محمد کھیل کود مار پیٹ لڑائی جھگڑے میں گاؤں کے لڑکوں کا سردار تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا، چچا کے پاس رہتا تھا، چچا کا نام ججیر باپ (یعنی جج کا باپ) تھا، ماں باپ نے یا تو کسی جج سے خفا ہو کر یا اس امید میں کہ اُن کے نورِ چشم کا نورِ چشم کسی دن جج ہوگا، یہ نام رکھا تھا، لیکن ججیر باپ کے کوئی لڑکا ہی نہ ہوا، صرف پانچ چھ لڑکیاں ہوئیں، مگر نام بدستور ججیر باپ ہی رہا۔ پھول محمد کو چچا چچی تھوڑا بہت سوکھا سا کھانا کھانے کو دے دیا کرتے۔ وہ بھی چچا کے کھیتوں اور مویشیوں کی تھوڑی بہت دیکھ بھال کر دیا کرتا۔ باقی وقت سیر گشت میں گزارتا۔ اسے اپنے بڑے چچا سے چنداں اُنس نہ تھا، مگر

چھوٹے چچا سے قریب قریب دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کا نام نامی عمدہ میاں تھا۔ جیسا ان کا نام عمدہ تھا، ویسے ہی ان کا قد بھی تھا۔ وہ تھے تو پھول محمد سے پانچ چھ سال بڑے، لیکن قد میں دو تین انگل چھوٹے ہی تھے۔ ان کے چہرے پر مونچھ داڑھی کچھ اس طرح جلوہ نما تھی جیسے کسی بنجر زمین میں کہیں کہیں گھاس اُگ آئی ہو، مگر جتنا قد چھوٹا تھا اتنا ہی مزاج تیز تھا اور جواں مردی کی نمائش کچھ اس سے بھی زیادہ، پھول محمد کو موقع بے موقع ڈانٹ پھٹکار دیتے، کھیل کود میں اس کے ساتھ شریک تو ہوتے، مگر ذرا بزرگ بن کے، لیکن کہاں پھول محمد کہاں میاں عمدہ۔ کبڈی میں عمدہ میاں ہمیشہ دھر لیے جاتے اور پھول محمد کتنوں کو مار کے صاف نکل آتا، بالآخر عمدہ میاں نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ وہ خود چچا بنے رہیں اور بھتیجے کو پیش پیش رکھیں۔ گھوڑامارا کبڈی کے میچ پھول محمد ہی کی بدولت لوہا گاڑا سے جیتا کرتا تھا۔ ڈھیلے بازی میں بھی پھول محمد کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ لوہا گاڑا کے بہت سے سور ماؤں کے سر پھوڑ چکا تھا۔ گھوڑا مارا کے اکثر لڑکے اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔

جمعدار صاحب کے مدرسے کا علم بردار بن کے وہ خفیہ خبر کی طرح گاؤں کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور اس طرح کہ پنیر میاں کو مطلق علم نہ ہوا۔ لڑکوں کی ٹولیاں لے کر گھومنے لگا۔ عمدہ میاں باوجود اپنی بزرگی کے اس کے ساتھ ہولیے، گاؤں کے سجانے میں بھی وہ پیش پیش رہتا۔ کبھی بیٹھ کے کاغذ کی جھنڈیاں کاٹنے لگتا، کبھی ستلی میں ان جھنڈیوں کو چپکاتا، کبھی جھنڈیوں کو پیڑوں میں باندھتا، خود پیڑوں کی ان پھنگیوں تک پہنچ جاتا جہاں کسی اور کی رسائی نہ ہوتی اور وہاں سے ڈپٹ ڈپٹ کر دوسروں سے کام لیتا۔ پنیر میاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے اور کہتے، ''لڑکا ہے تو پھول محمد، شاباش اسی طرح کام کیے جاؤ۔ بیڑی کو پیسہ دیں گے۔'' پھول محمد مسکرا دیتا، ایک بیڑی ٹینٹ سے نکال کر کان میں کھونس لیتا، اور بدستور کام میں لگ جاتا۔ ایک دفعہ ''جندہ باد'' کہہ کے پیڑ سے جو کودا تو پنیر میاں پر، دونوں گر پڑے۔ یہ تو پیٹھ جھاڑ کے اُٹھ کھڑا ہوا اور انھیں بڑی ہمدردی اور معذرت کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا۔ کچھ لڑکے کھڑے ہنس رہے تھے، مگر پھول محمد؟— یہ پتا ہی نہیں چلا کہ یہ حرکت اس نے جان بوجھ کر کی تھی یا اس سے اتفاقیہ سرزد ہوگئی تھی۔ جب یہ مسئلہ استقبالیہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوا

کہ آرائش گاؤں کے کس کس حصے میں کی جائے تو پھول محمد جواز خود کمیٹی کے مشوروں میں شریک ہو گیا تھا، بول اٹھا، ''ہم تو اپنے گھر تک سجائیں گے۔'' پھول محمد کی کارگزاریوں کو دیکھتے ہوئے کسی سے ''نہیں'' کہتے نہ بنا۔ سرت ساہا نے دبی زبان سے اتنا کہا کہ ''اس میں کاغذ تو بہت لگے گا۔''

پھول محمد نے جواب دیا، ''کاکا تمھیں دام سے مطلب کہ اور کچھ؟''

پنیر میاں نے کہا، ''آخر روپیا تو لگے گا۔''

پھول محمد نے کہا، ''آپ نے موزید شاب کو بلایا ہے تو روپیا نہ خرچ کریں گے؟'' بہرحال سب راضی ہو گئے اور نہ بھی ہوتے تو کیا تھا۔ جھنڈیاں پھول محمد کے قبضے میں تھیں۔ الغرض پھول محمد کے گھر تک گاؤں سجنے لگا اور چونکہ پھول محمد کا گھر جمعدار صاحب کے گھر کے بعد تھا۔ اس لیے جمعدار صاحب کے گھر کا راستہ بھی خود بخود سج گیا۔

پنیر میاں نے پھول محمد سے مشفقانہ و رازدارانہ انداز میں فرمائش کی کہ وہ مع گاؤں کے لڑکوں کے مجید صاحب کے معائنے کے وقت اپنے لوگوں کو اسکول کا طالب علم ظاہر کرے۔ صاحب کے جانے کے بعد لڑکوں کو رس گلا ملے گا۔

۵

مجید صاحب کے آنے کا دن آ گیا۔ تمام لڑکوں کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی ٹوپیاں پہنا دی گئیں جو ایسے ہی موقعوں کے لیے رکھی رہتی تھیں، ہاتھ میں سب کے ایک ایک جھنڈی۔ سب کے آگے میاں پھول محمد ایک جھنڈا لے کر منہ سے ''اللہ اکبر''، ''اللہ اکبر'' کہتے اور پاؤں سے الٹے سیدھے لفٹ رائٹ کرتے گھومنے لگے۔ ایک دو پھیرے جمعدار صاحب کے گھر کے بھی ہو جاتے، جمعدار صاحب ذرا فکرمند نظر آ رہے تھے کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

پھول محمد مسکرا مسکرا کر انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں اطمینان دلاتا۔ ایک پھیرے میں پھول محمد کی نظر جمعدار صاحب کے ہاتھ پر جو پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ تسبیح لیے ہیں اور زور زور سے ورد کر رہے ہیں۔

اس نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا،"چاچا اتنا نہ گھبراؤ۔" چاچا نے کہا،"اللہ مالک ہے۔"

اس درمیان میں پنیر میاں بار بار گھاٹ کی طرف جاتے، کچھ دیر تک انتظار کرتے اور نظر دور تک دوڑا کے چلے آتے، جمعدار صاحب موجود نہ تھے۔ ان کی عدم موجودگی محسوس تو کی گئی تھی، خصوصاً جلودھر نے پنیر میاں کو بار بار دلایا تھا، مگر پنیر میاں یہی جواب دیتے،"وہ اجڈ آدمی ہے۔ معلوم نہیں کب کیا کہہ دے، کیا کر بیٹھے۔ رہنے دو۔" یوں اگر وہ از خود آ جاتے تو دوسری بات تھی، مگر وہ آتے کیسے۔ بلائے گئے تو تھے نہیں اور کسی نے تاؤ بھی نہیں دلایا تھا کہ زبردستی اپنا حق منوانے ہی آ جاتے۔ اس معاملے میں پھول محمد نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی، جگہ جگہ پر چوکیدار متعین تھے کہ صاحب کے آنے کی خبر کریں، بالآخر سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں اور پنیر میاں دوڑے ہوئے گھاٹ پر پہنچے۔ صاحب کی کشتی دور سے آتی ہوئی نظر آئی۔ ندی پتلی تھی اس لیے صاحب اپنی لانچ بڑے دریا میں چھوڑ کے کشتی پر آ رہے تھے۔ گاؤں کے سربرآوردہ لوگ پہلے سے اکٹھا تھے، اپنی اپنی سمجھ کے مطابق علاحدہ علاحدہ احکام جاری کرنے لگے۔ اچھی خاصی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چیخ پکار زیادہ، کام کم۔ خیر، خدا خدا کر کے صاحب کی کشتی کنارے لگی۔ جیسے یہ اترے ایک لڑکا چلایا،"موزید شاب کی۔"
دوسرا بولا،"جے۔"

پھول محمد،"اے جندہ باد بولو۔" پھر آواز آئی،"موزید شاب جندہ باد۔" سب لوگ صف باندھ کے مؤدب کھڑے ہو گئے۔ پنیر میاں نے لپک کے"موزید شاب" کا خیر مقدم کیا اور پھر سب سے ملایا۔ لڑکے"اللہ اکبر اللہ اکبر"،"موزید شاب جندہ باد" یا"مسلم لیگ جندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے صاحب کے ساتھ چل پڑے۔"مسلم لیگ جندہ باد" پر صاحب نے مسکرا کے پنیر میاں کی طرف دیکھا۔ پنیر میاں چیخے،"اے، اے۔ مسلم لیگ نہیں خالی موزید شاب کہو۔" پھر صاحب کی طرف مخاطب ہو کے بولے،"آج کل لڑکے مسلم لیگ کا نعرہ لگانے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ کیا بتایا جائے۔" راستہ بھر عورتیں نیلی نیلی ساڑیاں پہنے بانس کی جالیوں یا ٹاٹ کے پردوں کی آڑ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ کچھ جو زیادہ منچلی تھیں وہ گھر سے باہر نکل کے درختوں کی آڑ میں

چھپی ہوئی کھڑی محوتماشا تھیں۔ راستے کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے بچے ایک کے اوپر ایک لدے ہوئے تھے، جیسے جامن کی ڈھیریاں لگی ہوں۔ صاحب کو پنیر میاں اسکول دکھانے لے گئے۔ اسکول کے جھونپڑے میں تمام لڑکے جھنڈی لیے لیے آ کے بیٹھ گئے۔ پنیر میاں نے انگریزی میں ایک سپاس نامہ پیش کا۔ سلطان میاں نے اسی زبان مین ایک رپورٹ پڑھی جس میں پنیر میاں کی عظمت کا دھوم دھامی انداز میں ذکر کیا گیا تھا۔ حاسدوں کا خیال تھا کہ یہ رپورٹ پنیر میاں ہی کی لکھی ہوئی ہے، صاحب نے لڑکوں سے سوال کرنا شروع کیا۔ جواب ندارد۔ صاحب چونکے۔ پھول محمد سب سے زیادہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔ گویا کہہ رہا ہے، ہم سے پوچھیے۔ صاحب نے پوچھا، ''اسکول کب سے آ رہے ہو؟''

اُس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا، ''آج سے۔''

''آج سے خالی تم یا اور سب بھی؟''

''سب۔'' عمدہ میاں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، جو چند لڑکے سچ مچ پہلے سے آئے تھے وہ بھی اس لپیٹ میں آ گئے۔

مجید صاحب کو سخت غصہ آیا اور مولوی پنیر الاسلام پر خوب خوب بگڑے، ان کی طرح کے لوگوں کو ملک کی اور مسلمانوں کی تباہی کا سبب قرار دیا، گاؤں کے سربرآوردہ لوگ اب تک اپنے کو پنیر میاں کے حواریوں میں سمجھ رہے تھے۔ یہ سمجھ کے کہ صاحب لوگوں میں ان کی بڑی مان دان ہے۔ اب جو انھوں نے دیکھا کہ ''موزید شاب'' ان پر اتنا بگڑ رہے ہیں تو ''چھی چھی'' کرنے لگے۔ ''توبہ توبہ کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔ یہ تو بڑی دغابازی کی بات ہے۔'' ''چھی چھی'' وغیرہ وغیرہ کی آوازیں پنیر میاں کے کانوں سے گزر کر دل کو چھیدنے لگیں۔ ان کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر گیا۔

مجید صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ انھوں نے میٹنگ کا خیال بھی ترک کر دیا، اور وہاں سے چلنے لگے، پھول محمد نے بڑھ کر کہا، ''سار (سر) یہاں تو ہم لوگ میٹنگ کے لیے آئے تھے۔ اب چلیے ہمارا مدرسہ دیکھیے۔''

مجید صاحب، ''یہاں کوئی مدرسہ بھی ہے؟''

پنیر میاں خفیف تو بہت ہو چکے تھے، مگر پھر بھی ان سے نہ رہا گیا اور بولے، ''یہاں مدرسہ کہاں ہے؟''

پھول محمد، ''جہاں ہم پڑھتے ہیں، صاحب چل کے دیکھیے۔ ہم لوگوں نے اُسے بہت سجایا ہے وہاں ہمارے زمادار شاب بھی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''کون جمعدار صاحب؟''

''آپ نہیں جانتے؟ وہ تو جرمن کی لڑائی میں لڑ کے آئے ہیں۔ انھیں ہم لوگ بہت مانتے ہیں۔''

پنیر، ''کون مانتا ہے۔''

پھول محمد، ''ہم۔''

صاحب نے پنیر کو ڈانٹا کہ انھیں بولتے شرم نہیں آتی اور کہا کہ وہ مدرسہ ضرور دیکھیں گے اور اس وقت جمعدار صاحب جیسے جنگ آزمودہ آدمی کی خاص طور سے ضرورت ہے۔ اب کیا تھا پھول محمد حلق شگاف نعرے لگاتا ہوا تمام لڑکوں کے ساتھ صاحب کو لیے ہوئے جمعدار صاحب کے گھر کی طرف چل پڑا۔ عمدہ میاں بھی نعرے لگا رہے تھے، لیکن ان کی آواز میں نسوانی شان تھی جو عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ صاحب نے دو ایک دفعہ مڑ کے بھی عمدہ میاں کو دیکھا۔ انھوں نے جو صاحب کو اپنی طرف خاص طور سے دیکھتے ہوئے دیکھا تو خوشی سے کھل پڑے۔ جھٹ سے سلام کیا اور ایک اور نعرہ لگایا۔ جمعدار صاحب کے کانوں میں بڑھتی ہوئی آواز آنے لگی۔ وہ چونک پڑے اور تیز تیز قدم چلانے لگے، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔ کیا سچ مچ پھول محمد، مجید صاحب کو یہاں لا رہا ہے۔ غضب کا لونڈا نکلا، کمال کر دیا۔ واہ رے پھول محمد، واہ رے مجید صاحب۔ جمعدار صاحب کا مکان ایک دوسرے ٹیلے پر تھا۔ دونوں ٹیلوں کے درمیان ایک شاکھو تھا، یعنی پل کی قسم کی ایک چیز بانس کی بنی ہوئی جس میں پاؤں رکھنے کی جگہ دو بانس ذرا اوپر نیچے کر کے بندھے ہوئے تھے۔ بغل میں ایک

طرف قد آدم بلندی پر ایک پتلا بانس تھا جسے پکڑ کر لوگ چلتے تھے۔ پل کی ساخت اونٹ کی پیٹھ جیسی تھی، بیچوں بیچ میں سطح آب سے پندرہ بیس فٹ اونچا تھا۔ چلتے وقت شاکھو چر چوں چر رخ چوں بولتا تھا۔ جب تک شاکھو پر چلنے کی مہارت نہ ہو اس وقت ہر دم یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب پاؤں پھسلا اب بانس ٹوٹا۔ اب اڑا اڑا دھڑ یم گرے۔ شاکھو دیکھ کر مجید صاحب ہچکچائے اور سوچنے لگے کہ واپس چلے جائیں کیا، مگر خفت کا خیال بھی آنے لگا۔ پھول محمد ''موزید شاب جندہ باد'' کا نعرہ لگاتا ہوا آگے چل پڑا اور شاکھو پر اس طرح چلنے لگا جیسے ہوا میں چڑیا جاتی ہے، اس کے پیچھے پیچھے بھر بھر کر کے دوسرے لڑکے بھی ہو لیے۔ ''موزید شاب'' بھی کیا کرتے مجبوراً چلے۔ جمعدار صاحب کو جھنڈیاں اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ دل ان کا بانسوں اچھلنے لگا۔ صاحب قریب آ گئے۔ جمعدار صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ آداب بجالائیں یا لپک کے مصافحہ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کچھ لپکے کچھ ہاتھ بڑھایا اور بالآخر سلام کر کے رہ گئے۔

صاحب، ''تو آپ ہی ہیں جمعدار صاحب؟''

جمعدار صاحب، ''جی حضور۔''

''ہم آپ سے مل کے بہت خوش ہوئے۔ آپ خاموش کام کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔''

جمعدار صاحب، ''چپ۔''

''آپ کیا پہلی جرمن لڑائی میں گئے تھے؟''

''جی حضور۔''

''اب پھر سرکار سے جرمن لڑ رہا ہے۔''

جمعدار صاحب کا چہرہ دمکنے لگا۔

''ہم سے ابھی تک کوئی بولا نہیں۔ ہم بھی چپ رہا، نہیں تو اب تک سینکڑوں آدمی بھرتی کر دیے ہوتے۔ حضور کہیں تو میں خود چلے جائیں۔''

''نہیں اب آپ کیا جایئے گا۔''

''جیسا حضور کا حکم۔''

جلودھر کھڑا جمعدار صاحب کو گھور گھور کے دیکھتا رہا، مگر جمعدار صاحب نے جان بوجھ کر پہلے تو اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ پھر بعد میں ایسے انداز میں دیکھا گویا کہہ رہے ہیں، ''بھرت تو کرائیں گے کیا کر لوگے۔'' مسجد کے سامنے ایک شامیانے کی قسم کی چیز تنی ہوئی تھی۔ ایک بوسیدہ میز بچھی ہوئی تھی۔ اس پر رنگ برنگ کے پھول کڑھی ہوئی چادر پڑی تھی۔ ایک کرسی جس کی نشست لکڑی کی تھی اور جس کا ایک ہتھا ٹوٹا ہوا تھا میز کے پاس رکھی تھی۔ کرسی پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ کچھ تو احتراماً اور کچھ میل چھپانے کے لیے، ایک پھٹی پرانی دری اور چند چٹائیاں فرش کا کام دے رہی تھیں۔ لڑکے اور گاؤں کے تماشائی وہیں بیٹھ گئے، مجید صاحب سے کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کی گئی۔ چھانو ہاتھ میں پھولوں کا ہار لیے دو چھوٹے لڑکوں کے ساتھ گاتا ہوا آیا۔ گانا کیا تھا یہ تو سمجھ میں نہ آیا، مگر غالباً اردو میں تھا، گانا ختم ہوتے ہی چھانو نے ہار مجید صاحب کی جھکی ہوئی گردن میں ڈال دیا۔ لڑکوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں، جمعدار صاحب نے پہلے تو مرحبا کہا، کیونکہ وہ تالی بجانا معیوب سمجھتے تھے، لیکن بالآخر تالیوں کے سیلاب میں خود بھی بہہ گئے۔ جمعدار صاحب نے زور شور کے ساتھ اپنی نظم پڑھی شروع کی۔ وہی ''بلبل کا چیں چیں چیں میں آواز مرحبا ہے'' خالی دوسرا مصرع بدل دیا تھا، یعنی اب شعر یوں ہو گیا تھا:

''بلبل کا چیں چیں چیں میں آوازِ مرحبا ہے'' — ''ہمارا پیارا مجید صاحب بہادر ہمارے گھر جو آ گیا ہے'' اس شان کے اشعار دو تین صفحے تک پھیلے ہوئے تھے جس کا ایک ایک شعر جمعدار صاحب نے پڑھ کے سنایا۔ سامعین میں کچھ تھوڑا بہت سمجھے، کچھ بالکل نہ سمجھے۔ کچھ، کچھ کا کچھ سمجھ گئے، مگر داد سبھوں نے دی اور زوروں سے تالیاں بجائیں۔ جمعدار صاحب فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ کے بیٹھ گئے۔ مولوی نور الانوار نے نحمدہ ونستعینہٗ کہہ کے مدرسے کا ذکر شروع کیا۔ اس کی اہمیت اور اسکول پر فضیلت ظاہر کی۔ جمعدار صاحب کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا۔ پھول محمد جگہ جگہ تالیاں بجاتا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لڑکے بھی، جب جمعدار صاحب کا نام آیا تو اس نے نہایت زور سے

تالی بجائی۔ صاحب کے دل پر جمعدار صاحب کی مقبولیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اب پبلسٹی افسر صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے، ادھر ادھر کی بے سر پیر باتیں بہت کیں۔ مقصد محض یہ تھا کہ صاحب پر اپنی قابلیت اور ہمہ دانی کا رعب جمائیں۔ بالآخر آمدم بر سر مطلب، فرمایا، ''جرمن ہم لوگوں کو غلام بنانا چاہتا ہے۔ اگر وہ جیت گیا تو ہم لوگ غلام ہو جائیں گے۔ ہم لوگ اگر گورنمنٹ کا ساتھ دیں تو جرمن ہمیں کبھی غلام نہیں بنا سکتا۔'' پھر آزادی غلامی پر ایک لمبا چوڑا لیکچر شروع فرما دیا۔ بات کا تک کسی پہلو نہ بیٹھتا تھا، جلودھر کو اچھا موقع ملا۔ اس نے کھڑے ہو کر پوچھ دیا، ''کیا اب ہم غلام نہیں ہیں؟'' پبلسٹی افسر صاحب سٹپٹائے۔ جمعدار صاحب گرجے، ''چوپ۔'' مجید صاحب نے خوش اسلوبی سے پبلسٹی افسر کو بٹھا دیا اور خود کچھ شکریے کے الفاظ کچھ جمعدار کی شان میں تعریفی کلمات کہہ کے بیٹھ گئے۔ مجید صاحب انھیں اس وقت بہت اچھے لگ رہے تھے۔ اتنے اچھے کہ جمعدار صاحب کا جی چاہ رہا تھا کہ اب صاحب وہاں سے جائیں ہی نہ۔ جب صاحب چلنے لگے تو وہ بادل ناخواستہ ان کے ساتھ ہو لیے، لیکن جلد ہی ان پر فخر و مباہات کا عالم طاری ہو گیا۔ بڑی شان سے شاکھو پار کر کے پنیر میاں کی حدود ارضی میں داخل ہو گئے۔

صاحب جب کشتی میں سوار ہوئے تو پنیر میاں نے رخصتی سلام کیا، صاحب نے اس کا جواب بے رخی سے دیا، مگر جمعدار صاحب سے گرم جوشی کے ساتھ ملے۔ جمعدار صاحب کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ بجائے ہاتھ ملانے کے یا تو سینے سے لپٹ جائیں یا قدموں سے۔ قدموں کی طرف جھکے، مگر صاحب نے یہ کہہ کے روک دیا، ''جمعدار صاحب آپ کا سر صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہیے۔''

صاحب کے جاتے ہی پنیر میاں نے گھر کی راہ لی، اور جمعدار صاحب گاؤں کے ہر ہر ٹیلے پر خوب خوب گھومے۔ ''بلبل کا چیں چیں میں....'' گنگناتے ہوئے، پنیر میاں کا جی چاہ رہا تھا کہ ''رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو'' پر عمل کر بیٹھیں اور اسکول وسکول سب بند کر دیں۔ جلودھر کو کھیل بگڑتا ہوا نظر آیا۔ اس نے پنیر میاں کو بہت سمجھایا کہ یہ کہاں کی جواں مردی ہے کہ دریا

میں ذرا سی موج آئی پتوار چھوڑ کے بیٹھ گئے۔ کہیں اس طرح بھی بیڑا پار ہوا ہے، پھر کلکٹر کی کیا مستی، فوراً اس کے خلاف کمشنر، وزیر اعظم، گورنر کو گم نام خطوط بھیجنا شروع کر دیا جائے۔

پنیر میاں چونک پڑے، پھر ذرا سوچ کے بولے، ''مگر موزید شاب کو لوگ بہت مانتے ہیں، اُن کا بڑا اثر ہے۔''

جلودھر، ''اثر پبلک ہی میں تو ہے۔ پبلک کو کون پوچھتا ہے۔ ہم نے پتا چلایا ہے، صاحب لوگ انھیں پسند نہیں کرتے۔ ان کی شکایت سن کے خوش ہوں گے۔''

پنیر، ''ایسی بات ہے؟ مگر وزیر لوگ بھی تو انھیں بہت مانتے ہیں۔''

جلودھر، ''وزیروں کا کیا آپ تو ان کی پارٹی کے آدمی ہیں۔ آپ ان کے کان بھریں۔'' جمعدار صاحب کو مخالف پارٹی کا آدمی بتائیں اور یہ کہیں کہ موزید شاب اسے بہت شہ دے رہے ہیں، اگر ان کا فوراً تبادلہ نہ کر دیا گیا تو پارٹی کا اثر خطرے میں پڑ جائے گا اور آئندہ الیکشن میں کامیابی مشکل ہو جائے گی۔''

پنیر میاں کے قلب مردہ میں خونِ زندگی دوڑنے لگا۔ انھوں نے کہا، ''نہ اس بیٹا موزید شاب کو مزہ چکھایا تو میرا نام پونیر نہیں۔'' گھر سے نکلے اور گاؤں والوں پر اپنا رسوخ ازسرِ نو قائم کرنے کے لیے ہر ایک کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ ''موزید شاب'' ان کے قلم کے ایک اشارے پر بدلے جا سکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لوگ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگے۔ کچھ بگڑ بھی بیٹھے، تو تو میں میں کی نوبت آ گئی۔ پنیر میاں نے اس وقت خاموشی اختیار کرنے ہی میں مصلحت دیکھی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

٦

پنیر میاں نے دیکھا کہ سارا کھیل پھول محمد نے بگاڑا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اسے کسی طرح توڑنا چاہیے، پھول محمد پر براہِ راست حملہ ممکن نہ تھا، اس لیے انھوں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا،

یعنی جچیر باپ اور عمدہ میاں دونوں کو نوکر رکھنا چاہا۔ جچیر باپ کوز میں داری کے کام پر اور عمدہ میاں کو اسکول میں، پھول محمد کو جب پنیر میاں کے ارادے کا پتا چلا تو اس کی ہمت اپنے بڑے چچا سے تو کچھ کہنے کی پڑی نہیں۔ البتہ اس نے عمدہ میاں سے ضرور کہا کہ نہ پنیر میاں اس قابل ہیں نہ ان کا اسکول کہ عمدہ میاں جیسے عمدہ آدمی اس کی نوکری کریں۔ عمدہ میاں کو اپنی اہمیت کا احساس تو ضرور ہوا اور انھوں نے کچھ پس و پیش بھی کیا، لیکن بالآخر ایک بات نے انھیں نوکری کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔ بات یہ تھی کہ دل کا معاملہ آن پڑا تھا، اُن کی شادی اب تک نہ ہوئی تھی۔ ہونے کو تو بہت پہلے ہی ہو جاتی، مگر انھیں اصرار تھا کہ لڑکی ایسی ہو ویسی ہو، ایک ضروری شرط یہ لگا رکھی تھی کہ لڑکی اگر اپنے ماں باپ کی اکلوتی نہ ہو تو کم از کم بھائی بہن زیادہ نہ ہوں تا کہ اسے بہت سی زمین ترکے میں ملے۔ ان کی جملہ شرطیں تو پوری نہ ہوئیں، البتہ ایک عمدہ بیوہ جو اُن سے عمر میں پانچ چھ سال بڑی، لیکن پانچ چھ بیگھے زمین کی مالک تھیں، انھیں پسند آ ہی گئیں۔ ان کا ہم نام ہونا سونے پر سہاگا تھا۔ عمدہ میاں اسی بات پر دل دے بیٹھے۔ شادی کے اخراجات کے لیے سو دو سو روپوں کی ضرورت تھی۔ اس کا کہیں سے ملنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ پنیر میاں نے سو روپے پیشگی دینے کا وعدہ کیا۔ پھر کیا تھا عمدہ میاں سچ مچ زر خرید غلام ہو گئے۔ پھول محمد کھسیایا تو بہت، مگر کیا کرتا، شادی ہو گئی۔ جہیز میں دو عدد نور چشم بھی ملے، پہلے شوہر کے عطیے۔ ان عطیات سے عمدہ میاں خاص طور سے خوش تھے۔ انھیں بڑی شان سے کھلاتے، ایک کو گود میں لیے دوسرے کی انگلی پکڑے تمام گھماتے۔ سب کے سامنے بے دھڑک مارتے بھی، جیسے حق پدری جتا رہے ہیں۔ باہر تو یہی ظاہر کرتے کہ اُن کا بیوی پر بڑا رعب ہے، مگر اصلیت ذرا مختلف تھی، یعنی گھر کے اندر سے جو بگڑنے کی آواز آتی وہ عمدہ بی بی ہی کی ہوتی، عمدہ میاں کی نہیں۔

شادی کے کچھ دن بعد ہی دیورانی جٹھانی میں کھٹ پٹ شروع ہو گئی۔ ایک دن جو ہونا تھا وہ ہوا۔ بات کیا تھی، یہ تو پتا نہ چلا، لیکن لڑائی بہت ہوئی۔ ایک دوسرے کی سات سات پشت کو وہ وہ فرمائشی گالیاں دی گئیں کہ مرحوموں کی ہڈیاں بھی قبر میں کروٹیں لینے لگی ہوں گی۔ پھول محمد نے دیکھا معاملہ طول کھینچ رہا ہے، اس کے دونوں چچا باہر گئے تھے۔ انھیں دوڑ کے بلا لایا۔ یہ لوگ آئے تو تھے بیچ

بچاؤ کرانے، لیکن ہوا کچھ اور۔ جس وقت پہنچے ہیں اس وقت عمدہ بی بی جھپٹ کر کلثوم بی بی کا جھونٹا پکڑنے والی تھیں، ججیر باپ نے ڈانٹا، عمدہ میاں کو برا لگا کہ اُن کی بیوی کو کیوں ڈانٹا۔ انھوں نے اپنی بیوی کی حمایت کی اور ججیر باپ نے اپنی بیوی کی، آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ مرد اتنا لڑے اتنا لڑے کہ عورتیں اپنی لڑائی چھوڑ کر تماشا دیکھنے لگیں۔ لڑائی میں پھول محمد کے بھی دو چار چانٹے پڑ گئے۔

شور و غل کی آواز سن کر مولانا نور الانوار کے چھوٹے بھائی مولوی نور الابصار بھی آ گئے۔ عورتیں آڑ میں ہو گئیں۔ وہ حال ہی میں اپنے بھائی کے یہاں آئے تھے۔ انھوں نے بیچ بچاؤ کی بڑی کوشش کی، کبھی توبہ استغفار کے بعد کہتے کہ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کی شان میں بے ہودہ کلمات نہیں کہنے چاہیں، بلکہ اس کا ادب کرنا چاہیے۔ اس پر بڑے بھائی برافروختہ ہو جاتے اور کہتے، ''ہونہہ، یہ ادب کریں گے۔ یہ تو چاہتے ہیں ہم ان کا ادب کریں۔ ایسے بے ادب کو تو مار ڈالے۔'' اور پہلے سے بھی زیادہ جوش میں جھپٹ پڑتے۔ پھر ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے مولوی صاحب کہتے کہ ''بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی کا خیال کرنا چاہیے۔'' اس پر چھوٹے بھائی صاحب بپھر جاتے، کہتے، ''یہ بھلا خیال کریں گے۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچا کھا جائیں۔ یہ بڑے بھائی ہیں؟ یہ تو دشمن ہیں دشمن۔'' یہ کہہ کے اور گتھ جاتے۔ الغرض مولوی نور الابصار کی کوشش نہ صرف بے کار گئی، بلکہ اس نے معاملے اور سنگین کر دیا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ دونوں بھائی اب ساتھ نہیں رہ سکتے۔ بٹوارا ہو جانا چاہیے۔ کھیت بٹ گئے، گھر بٹ گیا، دل بٹ گئے اور دل ٹھہرا خدا کا گھر۔ اس لیے خدا کا گھر بھی کیسے نہ بٹتا۔ اتنی لڑائی کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ دونوں بھائی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے، لہٰذا ان کے باپ کی بنائی ہوئی بانس کی دیوار اور ٹین والی مسجد کا بٹنا بھی ضروری تھا۔ بیچ میں بانس کے ٹٹر کی ایک دیوار کھینچ دی گئی۔ اب دیوار کے ایک طرف ججیر باپ نماز پڑھیں گے تو عمدہ میاں دوسری طرف۔ اس طرح ایک اور مؤذن صاحب کے رزق کا انتظام بھی رزاقِ حقیقی نے کر دیا اور وہ مؤذن مولوی نور الابصار قرار پائے۔ شاید مسجد کی تقسیم کی اصل وجہ یہی تھی۔ پھول محمد کو اگرچہ عمدہ میاں سے انس زیادہ تھا، مگر اُس نے اپنے بڑے چچا ہی کے پاس رہنا پسند کیا۔ بڑا چچا پھر بڑا چچا تھا اور چھوٹے بھتیجے کو اپنے پاس رکھنے کا

زیادہ حق دار۔

۷

بازار میں جلودھر کی جمعدار صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ جلودھر نے نمسکار کیا۔ جمعدار صاحب نے مکھی اڑادی۔

اس نے کہا، ’’زمادار شاب، آپ بہت خفا ہیں؟‘‘

جمعدار صاحب، ’’جاؤ اس پنیر کے ساتھ، سمجھا تھا کہ اس کی عزت جمعدار صاحب سے زیادہ ہوگی۔ دیکھا نہیں کیا ہوا۔‘‘

جلودھر، ’’ہم سے بس اسکول سے مطلب۔ آپ اسکول کھول دیتے ہم آپ کے یہاں پڑھاتے، پنیر میاں نے کھول دیا ہم وہاں پڑھا رہے ہیں۔‘‘

جمعدار صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ اردو میں بولنے لگے ’’میں بے دینی کا کام نہیں کرتے۔‘‘

جلودھر نے بھی کھسیا کے اُردو میں جواب دیا، ’’اور آپ بولا تھا کہ لڑائی میں مدد نہیں کرے گا پھر آپ موزید شاب کو کیا بولا۔‘‘

جمعدار صاحب، ’’البت کرے گا جرور کرے گا۔ کاہے نہیں کرے گا، ہمارا گورنمنٹ ہے ہم اس کا رعایا ہے۔‘‘

جلودھر، ’’گورنمنٹ انگریز کا ہے، آپ کا تھوڑی ہے۔‘‘

جمعدار صاحب، ’’انگریز ہمارا بادشاہ ہے۔‘‘

جلودھر، ’’وہ تو ہم کو غلام بنایا ہے، ہم اس کو نکالنا مانگتا ہے۔‘‘

جمعدار صاحب، ’’تم نکالے گا؟ بڑا نکالنے والا۔‘‘

جلودھر، ’’ہاں ہم لوگ نکالے گا، ہمارا بھائی بند نکالے گا، غریب لوگ نکالے گا، ہمارا کسان بھائی، مزدور بھائی، سب بھوکوں مر رہا ہے، کتنا مہنگائی ہوگیا ہے، کھانے کو نہیں، پہننے کو نہیں۔

دھنی لوگ بلیک مارکیٹ کرر ہا ہے۔ انگریز لوگ اور ملک کا دھنی لوگ ہمارا خون چوس رہا ہے، ہم لوگ ان کا خون چوسے گا اور دونوں کو نکال دے گا۔"

جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہوا کہ پانی بہت گہرا ہو گیا اور ان کے پاؤں اکھڑے جا رہے ہیں۔ پھول محمد یکا یک نظر آیا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں ایک ایسی دلیل سوجھی کہ ان کے پاؤں زمین پر فوراً ٹک گئے۔ فرمایا، "تم پنیر میاں کا خود غلامی کرتا ہے اور بولتا ہے دھنی لوگوں کا خون چوسے گا۔ پنیر میاں کا خون کاہے واسطے نہیں چوستا۔ وہ دھنی نہیں؟" گرج کے بولے، "اب جو بے ہودہ بات بولا تو ہم تمھارا خون چوس لے گا۔ سمجھا؟" شور و شغب سن کے بازار کے لوگ اکٹھا ہو گئے۔ جمعدار صاحب کا وقار ان کی نظروں میں بہت بڑھ گیا تھا اس لیے ان کی ہاں میں ہاں ملانے کو سب کا جی چاہ رہا تھا، مگر بات جلودھر کی دل کو لگتی تھی۔ لہٰذا سب کا حال ان تماشائیوں کا سا ہو رہا تھا جو مرغوں کی لڑائی دیکھ رہے ہوں۔ کوئی مرغا کسی کا نہیں، اس نے کراری چونچ ماری تو "واہ رے شیر" اُس نے زبر ست لات لگائی تو "وہ مارا"۔ جلودھر نے ٹینی مرغے کی طرح جب امیر غریب، بلیک مارکیٹ گرانی، خون چوسنے وغیرہ کی چونچ ماری تو مجمع اُسے شاباشی دے رہا تھا، مگر جب جمعدار صاحب نے اصیل مرغے کی طرح پنیر میاں کی غلامی کی ضرب کاری لگائی تو ان کی واہ واہ ہونے لگی۔ مجمعے کا جی تو چاہ رہا تھا کہ ابھی دو دو چونچیں اور ہوں، مگر اندیشہ یہ تھا کہ کہیں جمعدار صاحب سچ مچ مار نہ بیٹھیں تو بات کا بتنگڑ بن جائے۔ پھول محمد نے "جائے دیں جا جا جائے دیں" کہہ کے حسب معمول بیچ بچاؤ کرا دیا۔

۸

جلودھر نے پنیر میاں سے کہا کہ اگر اسکول کو واقعی کام کا بنانا ہے تو اچھے اچھے استادوں کا تقرر ضروری ہے۔ پنیر میاں طالب علموں کی کمی کی وجہ سے ہچکچائے۔ جو زائد خرچ ہو گا انھیں اپنی جیب سے پورا کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے وہ چنداں آمادہ نہ تھے۔ جلودھر نے سمجھایا کہ جب تک اچھے استاد نہ ہوں گے لڑکے بھی زیادہ تعداد میں نہ آئیں گے، بالآخر پنیر میاں مان گئے۔ جلودھر نے کہا، مکلیشور

رمن جو گریجویٹ ہے، اور لوہا گاڑا اسکول میں پینتیس روپے پاتا ہے چالیس روپے پر آنے کے لیے راضی ہے۔

پنیر میاں، ''مکلیشور بابو کم میں راضی نہ ہوں گے۔''

جلودھر، ''مکلیشور رمن بھدرلوگ (بنگالی شریف آدمی) تھوڑی ہے۔ وہ مسلمان ہے۔''

پنیر میاں، ''مسلمان؟ کچھ کم میں راضی ہو جائیں تو اچھا ہے۔''

جلودھر، ''نہیں کم میں نہیں ہوں گے۔'' پنیر میاں راضی ہو گئے اور مکلیشور رمن آ گئے۔ آدمی تیز اور ذہین معلوم ہوتے تھے۔ وضع قطع میں جلودھر سے ملتے جلتے۔ پنیر میاں نے کہا، ''مکلیشور میاں یہ اسکول چلانا آپ کا کام ہے۔''

مکلیشور میاں نے اطمینان دلایا کہ وہ جلودھر بابو اور ''چھلتان میاں'' کی مدد سے اسکول کو کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔

جمعدار صاحب کو خبر لگی تو انھوں نے مولوی نور الانوار سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ پنیر میاں کو منہ توڑ جواب دینا چاہیے اور وہ اس طرح کہ مولانا مستنصر باللہ جو فاضل دیوبند ہیں مدرسی کے لیے بلائے جائیں۔ ان کے آنے کی وجہ سے آس پاس کے دیہات سے غلہ وغیرہ کی صورت میں معقول مدد مل جایا کرے گی جیسی اور مدرسوں کو ملا کرتی تھی۔ اس سے مولانا کا خرچ نکل آئے گا۔ چنانچہ مولانا صاحب تشریف لے آئے، مولانا تھے تو بنگال کے، لیکن اپنے بہت سے ہم وطنوں کی طرح حصولِ علم کے شوق میں کئی سال تک لکھنؤ، الٰہ آباد، سہارن پور، دیوبند اور دتی کے علما کی خدمت میں زانوئے ادب تہ کر چکے تھے۔ حج بھی کر آئے تھے، ارض مقدس میں دو تین سال تک رہ بھی چکے تھے۔ ان کے علم و فضل اور خوش بیانی کی اس علاقے میں اچھی خاصی شہرت تھی۔ عمر قریب چالیس پینتالیس کے تھی۔ مولانا نے آتے ہی دھوم دھامی محفلِ میلاد منعقد کی۔ آس پاس کے گاؤں والوں کو دعوت دی گئی۔ مولانا کی شہرت کا یہ اثر تھا کہ میلاد سے پہلے ہی لوگ پانی پھکوانے اور دعا تعویذ کے لیے آنے لگے۔

میلاد میں دور دور سے لوگ آئے۔ گھوڑا مارا میں اتنا بڑا مجمع پہلے کم ہوا تھا۔ میلاد عموماً اردو میں ہوا کرتا تھا، مگر مولانا نے غایت علم کے ثبوت کے طور پر میلاد از ابتدا تا انتہا عربی میں ارشاد فرمایا۔ لوگ اَش اَش کر گئے۔ بڑا رعب پڑا، میلاد کے بعد ہی سے لوگوں نے مدرسے میں اپنے بچوں کا داخلہ کرانا شروع کر دیا۔

پنیر میاں میلاد میں شریک ہونے پر مجبور ہوئے۔ ورنہ گاؤں کے لوگ انھیں شبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے، اور یہ بات ان کے خلاف استعمال کی جاتی، جتنی دیر بیٹھے رہے خون کے گھونٹ پیا کیے۔ ان کے ساتھ سلطان میاں اور مکلیشور میاں بھی بیٹھے تھے۔ جلودھر بابو کنارے کھڑے رہے، جلسہ ختم ہوتے ہی پنیر میاں تو گھر چلے گئے، مگر ان کے ساتھی رہ گئے۔ مکلیشور میاں نے کہا، ''یہ موچھن بلا'' مولانا تو بڑا استاد معلوم ہوتا ہے اس سے ملنا چاہیے۔ مولانا کے پاس گئے اور اپنا تعارف کرایا۔

مولانا صاحب، ''بابو صاحب آپ یہاں کے رہنے والے ہیں۔''

سلطان، ''یہ مسلمان ہیں۔''

مولانا، ''مسلمان؟۔۔۔ استغفراللہ! کیا نام کہا؟ پھر سے کہیے تو۔''

مکلیشور نے پھر بتایا۔

مولانا، ''مکلیشور تو مسلمان کا نام نہیں ہوتا، یہ تو خالص ہندوانہ نام ہے، کس نے رکھا۔''

مکلیشور (اردو میں) ''ہمارا باپ کا پیر نام دیا۔ کھاٹی (خالص مسلمانی نام ہے)۔ ہم پیر فقیر البت نہیں مانتا، ہمارا باپ البت مانتا تھا۔''

مولانا سوچنے لگے کہ اگر کسی پیر کا دیا ہوا نام ہے تو وہ مکلیشور رمن تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور ہوگا جس نے بگڑ کے یہ ہندوانی شکل اختیار کر لی ہے، مگر سوال یہ تھا کہ آخر اصل لفظ کیا ہے، یکا یک مولانا کو شرح صدر سا ہوا اور انھوں نے زور سے کہا، ''استغفراللہ مخلص الرحمٰن! بھائی اپنے آپ کو مخلص الرحمٰن کہا کیجیے جو مسلمانوں کا نام ہے۔''

''ہم مسلمان اسلمان نہیں مانتا۔''

''تو پھر آپ کیا ہیں؟''

''انسان۔''

مولانا اس جواب پر چونکے، بولے،''انسان تو ہم بھی ہیں۔''

''ہاں، مگر آپ لوگ تو آدمی کو آدمی کا غلام بنانے مانگتا ہے، مذہب کا غلام بنانے مانگتا ہے، خدا کا غلام بنانے مانگتا ہے، مذہب افیم کا مافک ہے، ہم لوگ بولتا ہے آدمی کسی کا غلام نہیں، کوئی دھنی نہیں کوئی غریب نہیں۔ سب برابر ہیں، اور ہم لوگ اس مذہب کی افیم کو آدمی کے بدن سے نکال پھینکنے مانگتا ہے۔''

مولانا کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور وہ ابھی کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ ایک گرجتی ہوئی آواز آئی،''چوپ بے ہودہ ہم خود تیری جان نکال لے گا۔'' جس طرف سے آواز کا یہ دھماکا ہوا تھا۔ مولانا اس طرف پلٹے، کیا دیکھتے ہیں کہ جمعدار صاحب کے منہ سے کف جاری ہے اور وہ مخلص الرحمٰن کی طرف جھپٹ رہے ہیں۔ جمعدار صاحب کے غصے نے مولانا کے غصے کو دبا دیا۔ مولانا نے بڑی متانت سے کہا،''جمعدار صاحب رہنے دیجیے مار پیٹ سے کام نہیں چلے گا۔''

جمعدار صاحب،''نہیں مولانا صاحب مین ایسا بات اپنے گھر میں نہیں سننے سکتے۔''

مولانا،''آپ کو اپنے گھر میں تو اپنے آپ پر اور زیادہ قابو رکھنا چاہیے، (مخلص سے مخاطب ہو کے) بھائی آپ کو یہ سب کفر کی باتیں کس نے سکھائی ہیں، یہ تو ہم بھی کہتے ہیں کہ آدمی آدمی برابر ہیں۔''

مخلص نے بات کاٹی،''آپ لوگ مسلمان کے برابر دوسروں کو سمجھتا ہے؟''

''آپ کیمونسٹوں کے برابر اُن کو سمجھتے ہیں جو کیمونسٹ نہیں ہیں۔ آپ انھیں بھی اپنے جیسے حقوق اور اختیارات دیتے ہیں؟''

''یہ کیسے ہونے سکتا ہے، کیمونزم مذہب نہیں اسٹیٹ ہے، آدمی کیمونسٹ نہیں ہونے سے کیمونسٹ اسٹیٹ میں کیسے اختیار پانے سکتا ہے۔ کیمونسٹ لوگ تو ہمارا کامریڈ یعنی ساتھی ہے۔''

''تو یہی حال ہمارا بھی ہے، دوسرے کمیونسٹوں کو آپ ساتھی کہتے ہیں۔ دوسرے مسلمانوں کو ہم بھائی سمجھتے ہیں۔'' مخلص کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یکا یک دیوار سے ٹکرا گیا ہے۔ وہ سوچنے لگا، اس دیوار کو کیسے پھاندے۔

جلودھر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا، ''آؤ چلیں ان سے بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

آپس میں کچھ باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''وہ بدمعاش ایسا بڑا بڑا کفر کا بات بولا۔ آپ اس کا جواب نہیں دیا؟''

مولانا، ''ایمان بحث سے پیدا نہیں ہوتا۔ بحث سے تو اور ضد بڑھتی ہے۔ آدمی اپنی بات کی پچ کے لیے زبردستی کٹ حجتی کیے جاتا ہے، آہستہ آہستہ سمجھانے سے شاید اللہ ہدایت دے۔''

۹

یونین بورڈ کا الیکشن ہونے والا تھا۔ گھوڑا مارا سے پنیر میاں کھڑے ہوئے۔ مجید صاحب کے جانے کے بعد سے گاؤں میں جمعدار صاحب کا اثر بہت بڑھ گیا تھا اور پنیر میاں انھیں نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ انھیں یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں جمعدار صاحب خود ہی امیدوار نہ بن جائیں۔ پنیر میاں جمعدار صاحب سے نفرت تو بہت کرتے تھے، مگر مصلحت انھوں نے اس میں دیکھی کہ فی الحال وہ اپنی نفرت کو پی جائیں اور جمعدار صاحب کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی حمایت کی تو امید کم تھی، لیکن کم سے کم اتنا فائدہ تو ہوگا کہ وہ شاید ان کے مقابلے میں خود نہ کھڑے ہوں۔ پنیر میاں نے ججیر باپ کے ذریعے سے ڈورے ڈالنے چاہے، مگر ججیر باپ ذرا اکھڑ قسم کے واقع ہوئے تھے، ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لہٰذا عمدہ میاں کی طرف رجوع کیا گیا۔ عمدہ میاں نے فوراً حامی بھر لی۔ جمعدار صاحب کے پاس وہ شرمائے لجائے آئے۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے، سوچتے رہے کہ کس طرح

ذکر چھیڑیں۔ کوئی پہلو سمجھ میں نہ آیا، سلام کر کے چلے آئے۔ سوچا، یہ کام پھول محمد کے ذریعے سے کرائیں گے۔ جب انھوں نے پھول محمد سے کہا تو اس نے جواب دیا، ''چاچا سے ایسی بات کہو تو ماریں گے۔'' عمدہ میاں کی اس کے بعد کچھ کرنے کی ہمت نہ پڑی، پنیر میاں کو ابھی وہ جواب دینا نہ چاہتے تھے۔ مجبوراً دو تین روز منہ چھپائے پھرتے رہے۔ آخر ایک دن پنیر میاں نے پکڑ ہی لیا۔ عمدہ میاں نے لمبا چوڑا قصہ چھیڑ دیا۔ وہ جمعدار صاحب سے کس طرح ملے، ان سے کس کس طرح بات کی۔ وہ پہلے کس طرح پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتے تھے۔ پھر آخر کس طرح پسیجے اور اب کس طرح راضی سے ہوئے ہیں۔ یہ خبر اتنی دل خوش کن تھی کہ باوجود محتاط آدمی ہونے کے پنیر میاں کو اس کا یقین فوراً آ گیا اور عمدہ میاں کو انھوں نے ایک روپیا جھٹ سے انعام دیا۔ دال گلتی نظر آ رہی تھی۔ انھیں یہ مناسب معلوم ہوا کہ وہ دو ایک آنچ اب جا کے خود دے آئیں تا کہ جو کچھ کسر گلنے میں رہ گئی ہو وہ بھی پوری ہو جائے۔ وہ خود بات کریں گے تو اُس کی اور ہی بات ہوگی۔ کہا، ''عمدہ میاں اب کے ہم بھی تمھارے ساتھ چلیں گے تا کہ بات پکی کر لیں۔''

عمدہ میاں چکرا گئے، یہ کیا مصیبت ہوئی۔ اب کیا کریں۔ پنیر میاں کو انھوں نے سمجھانا چاہا کہ وہ اس معاملے میں نہ پڑیں، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، مگر پنیر میاں کو اپنی لسانی پر اتنا اعتبار اور ناز تھا کہ وہ کسی طرح نہ مانے۔ انھوں نے مغرب بعد جانے کا فیصلہ کیا اور عمدہ میاں سے اس وقت آنے کی تاکید کر دی۔

پنیر میاں نے سوچا کہ پہلے پہل جمعدار صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔ شرافت کا تقاضا ہے کہ خالی ہاتھ نہ جانا چاہیے۔ انھوں نے پاس کے گاؤں سے وہ خاص قسم کا دہی منگوایا جو بانس کی ٹوکری میں جمایا جاتا ہے اور جو خاص خاص موقعوں پر تحفتاً بھیجا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پانچ سیر رس گلا بھی خریدا اور عمدہ میاں کا انتظار کرنے لگے، مگر میاں عمدہ ہیں کہ نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ کچھ دیر کے بعد جبیر باب نے آ کے اطلاع دی کہ عمدہ میاں کے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے اور صاحب فراش ہیں۔ پنیر میاں بہت کھسیائے اور جبیر باپ ہی کو ساتھ لے کے چلے۔

جمعدار صاحب کے ہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ گھوڑا بنے ہوئے ہیں اور چھانو ان کی پیٹھ پر سوار ہے، پنیر میاں کی آہٹ سن کر انھوں نے گھوڑا بنی ہوئی حالت ہی میں پوچھا، ''کون؟''

پنیر میاں نے جلدی سے جگیر باپ کی طرف اشارہ کیا کہ وہ بتائے، مگر جگیر باپ یا تو سمجھا نہیں یا اُسے الفاظ نہیں ملے۔ جمعدار صاحب ڈپٹے، ''کون ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟''

پنیر میاں کو مجبوراً اپنا نام آپ ہی لینا پڑا۔ بولے، ''میں ہوں پونیر۔''

جمعدار صاحب چونک پڑے اور فوراً گھوڑے سے شیر بن گئے۔ غضب ناک انداز میں پنیر میاں کی طرف دیکھا۔ پنیر میاں کچھ چکرائے، جلدی سے اک رس گلا نکال کے چھانو کو دینے لگے۔ چھانو لپک کے لینا چاہتا تھا کہ جمعدار صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پنیر میاں نے کہا، ''تھوڑے سے رس گلے چھانو میاں کے لیے لایا ہوں اور دہی آپ کے لیے اور بھابی کے لیے۔''

جمعدار صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ پنیر میاں میں اتنا زبردست انقلاب کیسے آ گیا، جمعدار صاحب تکلفات کے چکر میں کیا پڑتے، براہِ راست حملہ آور ہو گئے۔ پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

پنیر میاں نے کچھ جھینپ کے جواب دیا، ''کچھ نہیں، ایسے ہی آپ سے ملنے کو جی چاہا۔ چلے آئے۔''

جمعدار صاحب، ''آج تک تو آپ نہیں آئے تھے۔''

پنیر میاں سٹپٹائے، ''اس دن میلاد میں تو آیا تھا۔''

''ہاں مگر ایسے گھر پر تو نہیں آئے تھے مٹھائی اٹھائی لے کے۔''

''برابر ارادہ کرتا تھا، آج کہیں جا کے پورا ہوا۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''ہم یہ سب بات تو سمجھتے نہیں، بس اتنا جانتے کہ ہماری آپ کی لڑائی ہے، ہم آپ کی مٹھائی نہیں لے سکتے (چھانو سے) جاؤ بیٹا ہم تمھیں بہت سا رس گلا منگا دیں گے۔''

پنیر میاں، ''آپ اتنے خفا کیوں ہیں۔''

جمعدار صاحب، ''اپنے دل سے پوچھو۔''

پنیر میاں کا حال اُس غوطہ زن کا سا ہو رہا تھا جو پانی کی گہرائی ناپنے کے لیے ڈبکیاں لگا رہا ہو اور پاؤں کہیں نہ نکتا ہو۔ پہلے تو وہ سمجھے کہ جمعدار صاحب تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں اور بعد میں کھلیں گے، لیکن ان کے پے در پے سوالوں کے تھپیڑوں کے سامنے کہاں تک ڈبکیوں سے کام چلتا، اب سدِ سکندری میں پناہ لینے کی ضرورت تھی۔ یہ سدِ سکندری پنیر میاں کی دانست میں عمدہ میاں کی ذاتِ گرامی تھی۔ انھوں نے کہا، ''عمدہ میاں نے تو آپ سے کہا ہی ہوگا۔''

جمعدار صاحب، ''عمدہ نے؟ نہیں تو، کیا بات ہے۔''

پنیر میاں نے پوچھا، ''انھوں نے آپ سے کچھ نہیں کہا؟''

جمعدار صاحب، ''ایسے تو باتیں ہوا ہی کرتی ہیں، مگر کوئی خاص بات تو نہیں کی تھی۔''

پنیر میاں، ''میرا کوئی ذکر نہیں کیا؟''

جمعدار صاحب، ''اس کی مجال تھی۔ پھول محمد تک کو تو ہم ڈانٹ دیتے ہیں کہ خبردار جو ذکر کیا ہوگا۔''

پنیر میاں، ''اس نے واقعی میرا کوئی ذکر آپ سے نہیں کیا؟''

جمعدار صاحب، ''کرتا تو ڈانٹ کھاتا۔'' سدِ سکندری اڑا اڑا دھڑیم سے گری۔

پنیر میاں نے بڑی بے چارگی کے عالم میں ججیر باپ کی طرف مخاطب ہو کے کہا، ''سن رہے ہو؟'' ججیر باپ خاموش رہا، پنیر میاں تھوڑی دیر بحرِ فکر میں غوطہ زن رہے۔ یہ تو پتا چل گیا کہ عمدہ میاں انھیں چرکا دے گئے، لیکن بے نیلِ مرام واپس چلا جانا انھیں مناسب معلوم نہ ہوا۔ اب آ گئے ہیں تو دو دو باتیں کر ہی ڈالیں۔ عمدہ سے تو اچھی ہی کریں گے۔ کہاں عمدہ جیسا اَن پڑھ کہاں ان کے جیسا بقراط، پہلے ہی انھوں نے غلطی کی تھی کہ اس کے ذریعے سے پیامِ سلام کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے آخر جی کڑا کر کے جمعدار صاحب سے کہا، ''اچھا اس کی بات جانے دیجیے، ہماری سنیے۔''

جمعدار صاحب، ''ہم سے آپ سے مطلب؟''

''جب ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں تو مطلب کیسے نہیں۔''

''نہیں ہم سے کچھ مطلب نہیں۔''

''پہلے سنیے تو سہی۔''

''اچھا۔''

''یونین بورڈ میں تو آپ جانتے ہیں گاؤں کی ترقی کا کتنا کام کیا جا سکتا ہے۔ راستے بنوانا، نالے نکلوانا، صفائی کا انتظام کرنا، اسکول مکتب کھلوانا وغیرہ، اب تک یونین بورڈ میں جاہل لوگ جاتے رہے، اس سے کچھ زیادہ کام نہیں ہو سکا۔ پڑھے لکھے لوگ جائیں تو البتہ کام بنے۔ ہم نے سوچا ہے کہ اگر آپ مدد کریں تو ہم ممبری کے لیے کھڑے ہو جائیں۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''یہ بات! اب سمجھے! ہم آپ کی مدد نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟''

''ہماری خوشی۔''

''گھوڑامارا میں کوئی اور وکیل ہے؟''

''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

پھول محمد اتنے میں آ گیا۔ پنیر میاں کو دیکھ کر حیران رہ گیا، لیکن جلدی ہی بھانپ گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ پنیر میاں نے جمعدار صاحب سے پھر کہا، ''اچھا آپ ہی بتائیے گھوڑامارا میں ہم سے زیادہ پڑھا لکھا کوئی ہے؟''

جمعدار صاحب بولے، ''ہم انگریزی پڑھائی نہیں مانتے۔''

پنیر میاں، ''دنیا مانتی ہے، آپ نہیں مانتے؟''

جمعدار صاحب، ''دنیا اندھی ہے۔''

پھول محمد کا دم پھول رہا تھا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھا، ''چاچا خود کیوں نہ کھڑے ہوں، چاچا سے اچھا اور کون آدمی ہے۔''

پنیر میاں نے کھسیا کے کہا، ''بھائی پھول محمد جو بات نہ سمجھو اس میں نہ بولا کرو، بھلا جمعدار

صاحب ممبر ہو کے کیا کریں گے۔"

"آپ کیا کیجیے گا۔"

"ہم تو کام کریں گے۔"

"چاچا آپ سے اچھا کام کریں گے۔"

جمعدار صاحب اس بحث کو غور سے سنتے رہے، بالآخر جوش میں آ ہی گئے۔ اردو میں کڑک کے بولے، "میں البت کھڑے ہوں گے۔ میں دکھائیں گے کہ آپ سے اچھا کام کرنے سکتے ہیں کہ نہیں، البت سکتے ہیں۔" پنیر میاں نے دیکھا کہ کھیل بگڑ گیا۔ بڑے غصے میں بغیر علیک سلیک کیے واپس ہوئے۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ رس گلے اور دہی کی ہنڈیا پٹک دیں، مگر پھر سوچا کہ یہ کہاں کی عقل مندی ہے اور اپنے ساتھ جیسے لے گئے تھے ویسے ہی واپس لے آئے۔

جمعدار صاحب نے جو کہہ دیا، کہہ دیا۔ سچ مچ الیکشن میں کھڑے ہو گئے۔ پنیر میاں بہت گھبرائے، گھر گھر ووٹروں کی خوشامد کرنے گئے۔ خوشامد سے کام نہ چلا تو طرح طرح کے وعدے کیے۔ اگر اس کا بھی اثر نہ ہوا تو مٹھی گرم کی کہ شاید اس طرح دل پسیجے۔ اگر کوئی ووٹر اس پر بھی راضی نہ ہوا تو دھمکی دی۔ پنیر میاں کی طرف سے جلودھر سلطان، ننگن بابو اور سرت ساہا اور ان کی ذریات نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ جمعدار صاحب کی فوج میں صرف دو سپاہی تھے۔ ایک پھول محمد دوسرے عمدہ میاں۔ خود جمعدار صاحب اپنے آپ کو ایک لشکر کے برابر سمجھتے تھے۔ پھول محمد بھی کسی سے کم نہ تھا۔ گاؤں میں جسے دیکھیے جمعدار صاحب کا بھائی بھتیجا تھا۔ جہاں پہنچ جاتے ایسا معلوم ہوتا کہ اندھیرے میں چراغ جل گیا۔ بوڑھے بچے اور جوان سب میں ان کا جی لگتا اور سب کا ان میں، باوجودیکہ وہ جہاں دیدہ قسم کے باتونی آدمی تھے اور شیخی بھی بہت بگھارتے تھے، لیکن یہ باتیں ایسی تھیں جن سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا تھا، بلکہ لطف ہی آتا تھا۔ لوگ عام طور سے ان پر بھروسا کرتے تھے۔ مجید صاحب کے جانے کے بعد سے تو یہ بھروسا اور بھی بڑھ گیا تھا۔ الغرض پنیر میاں کی خوشامدیں، رشوتیں دھمکیاں سب بے کار ثابت ہوئیں اور جمعدار صاحب ممبر منتخب ہو گئے۔

پنیر میاں کو ظاہر ہے کہ بہت صدمہ ہوا ہوگا، مگر وہ آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔ جب انھوں نے یونین بورڈ کا ممبر ہونے کی ٹھان لی تو ہو کر رہیں گے، انتخاب سے نہ سہی تو نامزدگی سے سہی۔ چھ ممبر انتخاب کے ذریعے لیے جا چکے تھے۔ تین ممبر نامزد ہونے باقی تھے۔ پنیر میاں نے اس نامزدگی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ وزرا پر طرح طرح کا دباؤ ڈالا اور بالآخر نامزد ہو کے ہی رہے۔ نہ صرف خود نامزد ہوئے، بلکہ اپنے ساتھ انھوں نے نگن بابو کو بھی نامزد کرایا۔ نامزدگی کے بعد جب وہ گھوڑا مارا واپس آئے تو اس شان سے جیسے کوئی فاتح داخل ہوتا ہے۔

۱۰

اب جمعدار صاحب اور پنیر میاں دونوں یونین بورڈ کے ممبر تھے، مگر سوال یہ تھا کہ پریزیڈنٹ کون ہوگا؟ اصل اختیار تو پریزیڈنٹ کا ہوتا ہے، پنیر میاں پریزیڈنٹی کے امیدوار تھے، جمعدار صاحب انھیں ہرا چکے تھے، وہ کیسے بیٹھے رہتے۔ الغرض دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ دونوں میں سے کوئی بیٹھنے پر راضی نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے ووٹ بٹ گئے اور نگن بابو جن سے پنیر میاں یہ امید کرتے تھے کہ ان کا ساتھ دیں گے، یونین بورڈ کے پریزیڈنٹ منتخب ہو گئے۔ پنیر میاں کو اپنے ہارنے کا اتنا غم نہ تھا جتنی اس بات کی خوشی تھی کہ جمعدار صاحب پریزیڈنٹ نہ ہو سکے۔ یہی حال جمعدار صاحب کا بھی تھا۔ الغرض دونوں اپنی اپنی جگہ پر خوش تھے اور نگن بابو تو خوش تھے ہی، نگن بابو کو یونین بورڈ کے تمام چوکیداروں نے سلام کیا۔ اب وہ ان کے مفت کے نوکر ہوں گے۔ زیادہ تر ان کے گھر کا کام کیا کریں گے اور تھوڑا بہت یونین بورڈ کا بھی کام ہو جایا کرے گا۔

☯......☯......☯

چوتھا باب

نظامِ شمس وقمر تو اپنی جگہ ہی پر قائم تھا، دن رات اپنے اپنے وقت مقررہ ہی پر آتے جاتے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت کے پر نکل آئے ہیں، اڑا چلا جا رہا ہے اور شہپر اتنے وسیع ہیں کہ لمحوں کے بجائے برسوں پر چھائے ہوئے ہیں، صدیاں برسوں میں سمٹ آئی ہیں اور برس دنوں میں۔ شہپر کی جنبش سے انتقام وانقلاب بزن وبگیر کی صدائیں آ رہی تھیں۔ ان صداؤں کو کان سنیں نہ سنیں، مگر دل ضرور سن رہے تھے۔ لمحہ بہ لمحہ پرانی عمارتیں ڈھائی جا رہی تھیں۔ لحظہ بہ لحظہ نئی تعمیروں کی بنیادیں پڑ رہی تھیں، تازہ بہ تازہ نو بہ نو، انسان چیخ رہا تھا۔ کارکنانِ قضا وقدر مسکرا رہے تھے۔

شکست وفتح کی خبریں روز آ رہی تھیں۔ آج فلاں شہر تباہ ہوا کل ڈھکاں ملک فتح ہوا۔ ملک کے اخبار اور ریڈیو سرکاری پسپائیوں کا ذکر کچھ اس آن بان سے کر رہے تھے کہ وہ عظیم الشان کارنامے اور فتوحات معلوم ہوتے تھے۔ ریڈیو بھی کیا غیر جانب دار چیز نکل آئی کہ دشمن کی دی ہوئی خبریں بھی ظالم اسی زور شور سے سناتا ہے جیسے کہ اپنی۔ لوگوں کو بھی کچھ ضد سی ہو گئی تھی۔ ہر وقت دشمنوں کے ریڈیو اسٹیشنوں کو سنا کرتے، اور رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ لوگ سرکاری خبروں کو الٹے معنی میں لینے لگے۔ سرکاری خبر آئی ''فلاں جگہ ہماری فوجوں نے عظیم الشان مقابلہ کیا۔ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ ابھی معاملات رقیق حالت میں ہیں۔ دو ایک دن میں ٹھوس صورت اختیار کریں گے۔'' لوگ سمجھ جاتے کہ رقیق کے مطلب کیا ہیں، یعنی ہماری فوجوں پر رقت کا عالم طاری ہے اور اُن کا سیلاب الٹا بہنے لگا ہے۔ اب کچھ دن میں اس ''ٹھوس صورت'' کی خبر آئے گی کہ بڑی خوش سلیقگی اور حسنِ انتظام کے ساتھ ہم نے پیچھے ہٹ کر پہلے سے تیار کیا ہوا مورچہ سنبھال لیا ہے۔ جھٹ سے دشمن کا ریڈیو لگایا۔ وہ باجے گاجے کے ساتھ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا: ''یوں مارا، یوں بھگایا، اتنے قیدی گرفتار کیے۔ اتنا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ شہر پر قبضہ ہو چکا وغیرہ وغیرہ۔'' فوراً شبہات کی تصدیق ہو گئی،

اور دشمن کی خبر گھر کے خط کی طرح معتبر سمجھی گئی۔ جب تک دور دراز کے مقامات کا ''چہلم'' ہوتا رہا یار لوگ مسکرا مسکرا کر لطف اٹھاتے رہے، مگر جب برما کے شہروں کی نوبت آئی تو ذرا تشویش پیدا ہونے لگی۔ نگن بابو جھٹ سے کلکتہ گئے۔ زمیں دار بابو نے کچھ روپے مانگے تھے۔ زمیں دار بابو علاقے پر تو کبھی آتے نہ تھے۔ وقتاً فوقتاً روپے منگوا لیے کرتے تھے۔ نگن بابو انھیں خوش رکھنے کے لیے جتنا کم سے کم دینا مناسب سمجھتے دے دیتے۔ بقیہ اپنا انھوں نے سوچا بابو کو روپے بھی دے آئیں گے اور لڑائی کے اصل حال کا بھی پتا چل جائے گا۔ کلکتہ پہنچ کے انھوں نے دیکھا مارواڑی اور دوسرے تجارت پیشہ لوگ چیزیں خرید خرید کر جمع کر رہے ہیں۔ خاص کر غلہ۔ نگن بابو ہوشیار آدمی تھے۔ کچھ چھنکے اور فوراً گھوڑا مارا پہنچ تھے۔ تھے تو وہ بظاہر کانگریسی اور اس لیے جنگ کے مخالف، لیکن خفیہ خفیہ وار بانڈ بھی خریدتے رہے تھے۔ انھوں نے فوراً بانڈ بیچنے شروع کیے اور اس روپے کو زیادہ منافعے کے کام میں لگانے کے طریقے پر سوچنے لگے۔

۲

نگن بابو اپنے ساتھ بیٹری کا ایک ریڈیو سیٹ لے آئے تھے۔ اس سے ان کا رعب بہت بڑھ گیا تھا۔ لوگ دور دور سے آتے اور ان کے گھر ایک میلہ سا لگا رہتا۔ گاؤں والے شام کے بعد گھر سے کم نکلا کرتے تھے، لیکن ریڈیو کی دل کشی اور دلچسپی ایسی تھی کہ رات کو دیر تک وہیں بیٹھے رہتے۔ اس کی وجہ سے ان گھروں میں جہاں بی بیاں شکی قسم کی واقع ہوئی تھیں، بدمزگی بھی پیدا ہو گئی، مگر یار لوگوں کو خبروں کا ایسا چسکا پڑ چکا تھا کہ آتے ضرور تھے۔ نگن بابو کے گھر کا برآمدہ گاؤں کا کلب بن گیا تھا۔ لوگ وہیں پر بیٹھے خبروں پر تبصرہ کیا کرتے اور گاؤں کے مسائل پر بحثا بحثی۔ نگن بابو کمرے میں ایک مسہری پر دراز رہتے۔ مسہری میں اسپرنگ کی بجائے تختے جڑے تھے، اور گدے پر سیتل پاٹی بچھی تھی۔ نگن بابو لیٹے لیٹے حقے کا کش لیتے جاتے۔ کبھی اپنی کھلی ہوئی توند پر بڑی شان سے ہاتھ پھیرتے اور کبھی اپنے چٹیل میدان سر کو سہلاتے۔ ایک نوکر پاؤں اور کمر دباتا۔ بعض وقت جب کمر زیادہ زور

سے دب جاتی تو کراہ بھی دیتے۔ کبھی کبھار خود بھی باہر آ کر نزول اجلال فرماتے۔ لوگ ''پرنام'' کرتے۔ یہ کینولیس کی میلی آرام کرسی پر براجمان ہو جاتے۔ عموماً ''ابے تبے'' کر کے باتیں کرتے۔ لوگوں کے تبصرے پر خود تبصرہ فرماتے اور ان کے فیصلے حتمی فیصلے کا حکم رکھتے۔ لگے ہاتھوں بقایا لگان کی تاکید بھی ہو جاتی۔ جمعدار صاحب کی آمدنی تو بہت کم تھی، مگر ظاہری ٹیپ ٹاپ اپنی حیثیت سے زیادہ کرتے تھے۔ عموماً قرض پر کام چلتا۔ کھیت کا لگان بھی اکثر باقی رہتا۔ کئی کھیت پہلے ہی سرت ساہا کے ہاتھ بیچ چکے تھے۔ دو ایک بیگھے باقی رہ گئے تھے۔ جب ریڈیو نیا نیا آیا تھا تو جمعدار صاحب بھی دوسرے گاؤں والوں کی طرح دیکھنے گئے تھے، مگر حیرت اور تعجب کا اظہار ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس لیے ''ہاں ہوں'' کر کے چلے آئے تھے۔ اُس دن پھول محمد نے ان سے کہا تھا، ''چاچا یہ تو بڑے جادو کی چیز ہے۔''

چاچا، ''سنے جاؤ بس۔ بھونپو باجے کی طرح سمجھو۔''

پھول محمد، ''مگر کبھی کہتا ہے، لندن سے بولتے ہیں کبھی کون کون جگہ سے۔''

چاچا، ''کہا کرے۔ نگن بابو کہہ دیں گھوڑا مارا ولایت ہے تو ہو جائے گا۔''

اس دن کے بعد سے وہ نگن بابو کے یہاں کم گئے تھے۔ علاوہ کسر شان کے انھیں بقایا لگان کا بھی خیال آتا تھا۔ کئی سال کا لگان باقی تھا۔ نگن بابو نے تقاضا کر دیا تو کیا ہوگا، مگر خبریں روز بروز گرم ہو رہی تھیں۔ رنگون کا معاملہ درپیش تھا۔ ریڈیو کی اصلیت پر اگرچہ ابھی انھیں شبہ تھا، مگر پھر بھی سننے گئے، کون جانے جو لوگ کہتے ہیں سچ ہی ہو۔ دیکھا تو میاں قیص بھی وہاں موجود ہیں۔

قیص نے جو جمعدار صاحب کو دیکھا تو اس کی روح قبض ہو گئی، وہ چپکے سے دم دبا کر چلا گیا۔

آج نگن بابو باہر براجمان تھے۔ جمعدار صاحب کو دیکھتے یہ انھوں نے کہا، ''اوئے ذلیل میاں لگان کب دے گا۔''

ذلیل میاں واقعی اس وقت اپنے کو بہت ذلیل محسوس کر رہے تھے۔ بغلیں جھانکنے لگے۔

اور ''دے دیں گے بابوجی'' کہہ کے قمیص کی طرح بغیر ریڈیو سنے خود بھی گھر واپس ہوئے۔ کچھ احساس ذلت کچھ کھسیاہٹ، سارا غم و غصہ قمیص پر اتارا، ''کہہ دیا خبر سننے نہ جایا کرو۔ لڑائی کی خبر سے تمھیں مطلب؟ پھر سب جھوٹا خبر، مگر نہیں مانتے اور جاؤ جاؤ'' کہتے جاتے تھے اور دھڑا دھڑ ٹھونکتے جاتے تھے۔ عموماً قمیص کو ''تُو'' کہا کرتے تھے، مگر آج ''تُم'' کہہ رہے تھے، غالباً ان کا روئے سخن کچھ اپنی طرف بھی تھا۔

۳

جمعدار صاحب کے چلے جانے کے بعد نگن بابو کے یہاں سرت سا ہا پہنچا۔ آج خبر بڑی گرم تھی۔ جاپانیوں نے رنگون فتح کر لیا تھا۔ نگن بابو بھی پریشان تھے اور سرت بھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ جلودھر اور مخلص نے روس کے شریک جنگ ہونے کے بعد سے پلٹا کھایا تھا۔ وہ جنگ جو برطانوی شہنشاہیت کی جنگ تھی اور جس کے یہ لوگ شدید مخالف تھے دفعتاً عوام کی جنگ میں بدل گئی تھی جس میں جان سے مال سے امداد کرنا ہر شخص کا فرضِ اوّلیں تھا۔

نگن بابو پہلے سے ان سب لوگوں کو شبہے کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ کہیں کاشت کاروں کو بھڑکائیں نہ۔ جب سے ان لوگوں نے جنگ کی تائید شروع کی تھی اس وقت سے اختلاف اور بھی بڑھ گیا تھا اور ان لوگوں کا نگن بابو کے ہاں آ جانا بند ہو گیا تھا، حتیٰ کہ ریڈیو آنے کے بعد بھی یہ لوگ نہ آئے تھے۔ سرت کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رنگون کی فتح سے جو نتیجے نکلنے والے ہوں گے۔ انھیں جلودھر اچھی طرح سے بتا سکے گا، اس کے منہ سے نکلا، ''چلیں دیکھیں جلودھر بابو کیا کہتے ہیں۔'' نگن بابو کو برا لگا۔ انھوں نے کہا، ''وہ سب کیا بتائیں گے، کوئی رشی منی تھوڑی ہیں۔ بیٹھو ابھی ہم سب بتائے دیتے ہیں، اور ہاں.... (ذرا تامل کے بعد) ان لوگوں سے نہ ملا کرو۔''

اتنے میں پنیر میاں آ گئے۔ آج ہی گاؤں پہنچے تھے۔ ان کی بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ''آیئے آیئے پونیر میاں...'' .... ''آیئے وکیل صاحب آیئے'' سے ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ وکیل صاحب ضرور

مستقبل پر روشنی ڈال سکیں گے۔ نگن بابو نے ان کے لیے ایک کرسی منگوائی اور حالات پر تبصرہ شروع ہوگیا۔ تینوں اس نتیجے پر پہنچے کہ صورت حالات تشویش ناک ضرورت ہے، مگر فی الحال خطرناک نہیں کہی جاسکتی۔ اگر جاپانی گئے تو برا کیا ہوگا۔ انگریزوں کی غلامی سے جاپانیوں کی غلامی شاید بہتر ہی ہو۔ آخر وہ ایشیائی ہیں، اور ہندوستان کے پیدا کردہ بدھ مت کے ماننے والے۔ صرف تھوڑی بہت بدامنی اور لوٹ مار کا ڈر ہے۔ جاپانیوں کا اگر ٹھیک سے خیر مقدم کیا گیا تو قسمت جاگ جائے گی۔ آخر یہ نواب رجواڑے بڑے زمیندار وہی تو ہیں جن کے ذریعے سے انگریزوں کا تسلط یہاں قائم ہوا تھا۔ نگن بابو نے ذرا زیادہ دور بینی سے کام لے کے جاپانی سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ساتھ ساتھ تاکید کی کہ جملہ باتوں کو پوشیدہ رکھا جائے۔ اس کے بعد جاپانیوں کے برما پر قبضہ جمائے رہنے اور آگے نہ بڑھنے کی صورت میں جو حالات پیدا ہوں گے ان پر غور کیا گیا۔ اس تصویر کا روشن ترین پہلو یہ نظر آیا کہ وہاں سے چاول آنے بند ہوجائیں گے۔ بنگال کا کام بڑی حد تک اس چاول کے سہارے چلتا تھا۔ ملک میں چاول کم ہوجائیں گے اور دام تیزی سے بڑھیں گے۔ لہٰذا جس قدر ممکن ہو خرید کر رکھ لیے جائیں۔ چند دنوں میں دولت کی انتہا نہ رہے گی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ سرت ساہا کی زبان بھی وہی کہے جو دل کہتا ہو۔ لیکن آج دل کی بات زبان پر بے اختیار آ گئی اور انھوں نے کہا، ''ہے بھگوان! لڑائی اسی طرح جاری رکھو۔'' تینوں میں ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ سارا منافع خود ہی کمالے۔ لیکن دقت یہ تھی کہ نگن بابو اور پنیر میاں کے پاس روپے تھے، مگر انھیں کاروبار کا تجربہ نہ تھا۔ سرت ساہا کاروبار میں ماہر تھا اور تھوڑے بہت روپے بھی رکھتا تھا، لیکن دھان چاول زیادہ مقدار میں خرید کر رکھنے کے لیے بہت روپے کی ضرورت تھی، اور وہ اس کے پاس نہ تھے۔ بڑی بحثا بحثی کے بعد بالآخر سمجھوتا ہو ہی گیا۔ پنیر میاں شریک ہونے کو تو ہو گئے، لیکن دل میں ڈر رہے تھے کہ اگر کہیں راز فاش ہوگیا تو دشمنوں کو الیکشن کے وقت ایک زبردست حربہ ان کے خلاف مل جائے گا۔ انھوں نے تاکید کی کہ ان کے حصے کو مخفی رکھا جائے گا۔ نگن بابو اگرچہ الیکشن وغیرہ کے خیال سے بے نیاز تھے۔ تاہم انھوں نے بھی اپنا حصہ بحیثیت کانگریسی کے پوشیدہ رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

چاول کے دام تیزی سے بڑھنے لگے اور اسی لحاظ سے سرت ساہا کا کاروبار بھی، نگن بابو اور رنیر میاں اپنے اپنے حلقے میں روز بروز خبریں پھیلاتے تھے کہ جلد دام گرنے والے ہیں جس کے پاس جتنا دھان چاول ہو بیچ ڈالے، نہیں تو نقصان اٹھائے گا اور خود بھی دکھانے کے لیے سرت ساہا کے ہاتھ دس بیس من واقعی اور پانچ چھ سو من فرضی دھان کا سودا کر ڈالتے۔ گاؤں والوں نے جلدی جلدی بیچنا شروع کیا۔ جمعدار صاحب کے پاس بھی پچیس تیس من تھے بی بی جی اور مولانا مستنصر باللہ نے بہت سمجھایا، مگر وہ نہ مانے۔ بمشکل پانچ من رکھنے پر راضی ہوئے۔ انھیں خیال آیا کہ کیوں نہ وہ بھی سرت ساہا کی طرح دھان چاول کا کاروبار شروع کردیں۔ ابھی بہت زیادہ دام ملیں گے۔ جب دام گریں گے تو وہ اس سے اور زیادہ دھان خرید لیں گے۔ پھر جب دام زیادہ ہوں گے بیچ ڈالیں گے۔ پھر خریدیں گے پھر بیچیں گے۔ کچھ دنوں میں مال دار آدمی ہوجائیں گے۔ جمعدار صاحب کا خیال تھا تو معقول، مگر اس کو کیا کیجیے کہ صورت حال برعکس نکلی۔ دام بجائے کم ہونے کے بڑھتے ہی رہے۔ جمعدار صاحب کا پچیس من دو تین دن میں پندرہ من ہی رہ گیا۔ پھر دس پھر پانچ۔ یعنی انھوں نے پچیس من تین سو میں بیچے۔ اب جو دھان خریدنے گئے تو اس روپے میں پندرہ ہی من خرید سکے۔ اس کو بیچ کر پھر جو خریدا تو دس من پھر پانچ من۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ جمعدار صاحب کے ہاتھ میں جب بھی روپے آتے گھر میں کچھ خاص قسم کے اخراجات بھی نکل آتے، مثلاً بازار میں معمول سے زیادہ بڑی مچھلی نظر آگئی۔ لوگ خریدنے میں پس و پیش کررہے ہیں۔ جمعدار صاحب نے محض اسی بنا پر اسے فوراً سے پیشتر خرید لیا اور بڑی شان سے لٹکائے ہوئے گھر لائے۔ سب کی نظریں پڑ رہی ہیں اور جمعدار صاحب کا چہرہ مسکرا رہا ہے۔ کبھی کبھی انھیں یاد آتا کہ بی بی جان کے لیے دنوں سے ساڑی نہیں خریدی۔ جھٹ سے ساڑی خرید لیتے۔ چھانو کے لیے تو کچھ نہ کچھ روز ہی خریدا جاتا۔ جب دھان اور اس کے روپے ختم ہونے لگے تو جمعدار صاحب اپنے دل کو یہ کہہ کے تسلی دینے لگے کہ یہ روپیا تو فالتو تھا، کیونکہ عموماً دھان گھر کے کام آیا کرتا تھا بیچا تھوڑی جاتا تھا۔ اصل روپیا تو پٹ سن بیچ کر ملتا تھا۔ وہی پٹ سن جس کے ستون پر نہ محض ان کی بلکہ سارے بنگال کی اقتصادی زندگی کی چھت

قائم تھی۔ ابھی ان کا پٹ سن تھوڑا ہی نکلا تھا اور بڑا حصہ ان کے مکان کے نیچے گڈھے میں سڑایا جا رہا تھا۔ اس کی بو نو واردوں کے لیے نا قابل برداشت سہی، لیکن یہی بو جمعدار صاحب کے مشام جان کو معطر کر رہی تھی اور ہر وقت یاد دلا رہی تھی کہ اس کے ذریعے جمعدار صاحب کو اتنے روپے ملیں گے کہ ان کی ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ کچھ پٹ سن جو نکالا جا چکا تھا الگنی پر پڑا سوکھ رہا تھا۔ اس کے ریشے چاندی کی طرح چمک رہے تھے جسے دیکھ دیکھ کر جمعدار صاحب کو ہر طرف چاندی کی ڈھیریاں نظر آنے لگتیں اور ان کا چہرہ چمکنے لگتا، مگر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ جنگ کی گڑبڑ کی وجہ سے پٹ سن کے دام بھی گڑبڑ ہو رہے تھے۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ جمعدار صاحب سوچتے تھے کہ پٹ سن کو اس وقت بیچیں گے جب دام بہت زیادہ ہوں گے۔ فی الحال وہ ادھر ادھر سے ضرورت پوری کرنی چاہتے تھے اور وہ پوری نہ ہوتی تھی۔

۴

جمعدار صاحب کے پاس مولوی نور الانوار خبر لائے کہ شہزاد پور میں ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ جو کہتے ہیں ہو جاتا ہے، فلاں کا مقدمہ جتا دیا۔ ڈھکان بیمار تھا اچھا ہو گیا۔ گھوڑا مارا سے شہزاد پور ذرا دور تھا۔ وہاں موٹر لانچ جاتی تھی۔ جمعدار صاحب نے سوچا پیر صاحب روزی کی تنگی دور کر دیں گے، فوراً روانہ ہو گئے۔ چھانو کو بھی ساتھ لے لیا اور نذر کے لیے گھر کا پلا ہوا ایک بکرا بھی، دیکھا کہ موٹر لانچ کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ چھت پر بھی لوگ ڈٹے ہوئے ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہے۔ انڈے مرغی بطخ وغیرہ۔ لوگ تو حسب معمول زور زور سے باتیں کر ہی رہے تھے، مگر مرغی بطخ کی داد و فریاد کا وہ زور شور تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ جمعدار صاحب اور ان کے بکرے نے اس غل غپاڑے میں اور اضافہ کر دیا۔ لوگوں نے لاکھ کہا کہ جگہ نہیں ہے، مگر جمعدار صاحب نے گھس پل کے جگہ نکال ہی لی۔ پھول محمد سے البتہ کہہ دیا کہ جاؤ، جیسے ہی انجن تھوڑی دیر غرانے کے بعد چلا وہ موٹر لانچ کا ڈنڈا پکڑ کے باہر کی طرف لٹک گیا۔ اسے کون ہٹاتا ہے، جمعدار

صاحب سے جب پھول محمد کا کرایہ مانگا گیا تو انھوں نے کہا، اسی سے لو۔ پھول محمد سے جب مطالبہ ہوا تو اس نے کہا، ''ہم نالچ (لانچ) پر تھوڑی بیٹھے ہیں۔ ہم تو باہر کھڑے ہیں۔''

لانچ بڑے دریا یعنی پدما میں تھوڑی دور چل کے ایک چھوٹی ندی میں داخل ہوئی۔ ندی کچری پانا یعنی نیلوفر آبی سے اٹی ہوئی تھی۔ ہلکے فالسائی، رنگ کے پھولوں کے گچھے تا حد نظر جھوم رہے تھے۔ شکل وشباہت انگور کے خوشوں جیسی، فرق صرف اتنا تھا کہ انگور کے خوشے سرنگوں رہتے ہیں اور یہ سربلند، بڑا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ پھول محمد جانتا تھا کہ جمعدار صاحب کو پھول بہت پسند ہیں۔ اس نے ہاتھ لپکا کے پھولوں کا ایک گچھا توڑ کے جمعدار صاحب کی گود میں ڈال دیا۔ گھوڑا مارا کے قریب قریب ہر ندی نالے میں کچری پانا بھرے پڑے تھے۔ خود جمعدار صاحب کے تالاب کا یہی عالم تھا۔ کچری پانا کے سائے میں مچھلیاں پناہ لیا کرتیں۔ اس کی راکھ عمدہ کھاد کا کام دیتی، لیکن پھر بھی کچری پانا کی زیادتی سے لوگوں کا ناک میں دم رہتا۔ کشتی چلانا الگ مشکل ہوتا اور ان کے ریلے میں کھیت الگ خراب ہوتے۔ اس لیے کچری پانا کے خلاف لوگ جنگ کرتے رہتے تھے، لیکن اس جنگ میں جیت کچری پانا ہی کی رہتی۔ جمعدار صاحب بھی پودوں کو نوچ نوچ کے پھینکتے، کبھی کبھی ایسا کرنے میں ان کا دل بھی مسوستا، خاص طور سے پھولے ہوئے پودوں کو پھینکنے میں، لیکن جنگ میں دشمن کے اس سپاہی کو بھی جو خوب صورت جوان ہو آخر اسی بے دردی سے مارا جاتا ہے جس طرح دوسرے سپاہیوں کو، یہی حال اس دشمن کا بھی تھا جسے کچری پانا کہا جاتا تھا۔ جمعدار صاحب باوجود کچری پانا سے اس دشمنی کے اس کے پھولوں سے اپنے گھر کی آرائش کرتے اور کبھی کبھی ہاتھ میں لیے گھومتے، لانچ میں کچھ کرنے کو نہ تھا۔ اس لیے وہ کچری پانا کے پھولوں سے کھیلنے لگے۔ لانچ آگے بڑھی تو راستہ قریب قریب بند تھا، کچری پانا میں لانچ پھنس گئی۔ سارنگ نے پھول محمد سے ڈپٹ کر کہا کہ ''لانچ کے باہر کھڑے ہو تو کچری پانا بھی صاف کرو۔'' پھول محمد زور شور سے صاف کرنے لگا، لیکن اس طرح کہ پانی اچھل اچھل کر لانچ میں آنے لگا۔ خاص طور سے سارنگ پر، سارنگ ''ارے ارے'' کہہ کے چلایا۔ خلاصی بانس لے لے کے باہر نکلے اور کچری پانا صاف کرنے لگے۔ لانچ کبھی رکتی کبھی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی

رہی۔ بالآخراڑیل خاں میں داخل ہوئی۔ ''اڑیل خاں'' کی کیابات آخراڑیل خاں ہی ٹھہرے۔ سینہ چوڑا تھااور طوفانی جس میں زبردست موجیں آیا کرتی تھیں۔ لانچ حسب معمول ان موجوں میں جھولا جھولنے لگی۔ لوگ عادی تھے اس لیے انھیں لطف آرہا تھا۔ باوجودیکہ انجن بہت آواز کررہا تھا اور مسافر بھی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، لیکن پھر بھی کچھ من چلے فلمی گانے گائے جارہے تھے۔

جب یہ لدا پھندا قافلہ شہزاد پور پہنچا تو وہاں اور بہت سے قافلوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چاروں طرف سے لوگ چلے آرہے تھے اور ہر ایک اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ لا رہا تھا۔ پیر صاحب کو دیکھ کے جمعدار صاحب بہت مرعوب ہوئے۔ وہ، اُن کا نورانی چہرہ، اس سے زیادہ نورانی داڑھی... جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ان کی آنکھوں سے لے کے دل تک نور ہی نور بھر گیا ہو۔ پیر صاحب ایک تخت پر جلوہ فرما تھے۔ آدھے بیٹھے آدھے لیٹے، ان کے دست مبارک میں سفید کپڑے کا ایک سرا تھا۔ دوسرا سرا نظر نہ آتا تھا۔ ایک کپڑے میں دوسرا کپڑا بندھا ہوا تھا اور اس کا بظاہر لامتناہی سلسلہ زنان خانے میں جا کے ختم ہوتا تھا۔

یکا یک ہاتھی کے چنگھاڑنے کی سی آواز آئی۔ لڑکے ندی کی طرف دوڑے اور چلائے ''نالچ نالچ۔'' معلوم ہوا ''موزید شاب'' سرکاری لانچ میں آئے ہیں جو اپنے پہنچنے کا اعلان کررہی ہے۔ لانچ سے کنارے تک تختہ لگایا جارہا تھا۔ ابھی بہ مشکل تختہ لگا تھا کہ پھول محمد تیر کی طرح لانچ پر چڑھ گیا اور حیرت سے دیکھنے لگا۔ یہ لانچ اس لانچ سے جس میں میاں پھول محمد چڑھ کے آئے تھے بہت مختلف تھی۔ ''موزید شاب'' نے پھول محمد کو پہچان لیا اور اسے لانچ اندر سے دکھائی۔ کمرے اور غسل خانے کو دیکھ کر میاں پھول محمد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گھبرا کے بھاگ جائیں یا اب اتریں ہی نہ۔ کمرہ صاف شفاف تھا دودھ کی طرح سفید، بجلی کے لیمپ اور پنکھے لگے ہوئے تھے۔ موزید شاب نے مسکرا کر یکا یک پنکھا چلا دیا۔ میاں پھول محمد فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ہوا ان کے چہرے پر براہِ راست لگ رہی تھی، بال اُڑ رہے تھے۔ صاحب تو نیچے اتر گئے، حسب معمول ''اللہ اکبر''، ''موزید شاب جندہ باد''، ''مسلم لیگ جندہ باد'' کے نعروں کے ساتھ، پھول محمد کی جھجک دور ہوچکی تھی، اور اس کا جی فی

الحال اترنے کو نہ چاہ رہا تھا۔ صاحب کے جانے کے بعد اسے میدان صاف ملا اور اُس نے ایک ایک چیز کا چھو چھو کر معائنہ کیا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ بجلی کا لیمپ جو ایک دم سے روشن ہو جاتا ہے تو اس میں روشنی کون جلاتا ہے اور پنکھا کون کہاں سے بیٹھ کر گھماتا ہے۔ ادھر ادھر بہت جھانک کے دیکھا، مگر کوئی پتا نہ چلا، لانچ کے اوپر حصے پر چڑھ گیا۔ وہاں دیکھ بھال شروع کی، ایک رسی جو لٹک رہی تھی اسے پکڑ کے کھینچا، زور سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز آئی، پھول محمد نے جھٹ رسی چھوڑ کر کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ آواز سن کے سارنگ صاحب آ گئے اور انھوں نے کان پکڑ کے پھول محمد کو لانچ سے اتار دیا، وہ کان سہلاتے ہوئے اترا۔ کنارے سے دس قدم گیا ہوگا کہ جھٹ سے ایک ڈھیلا جو اٹھا کے رسید کیا تو سارنگ صاحب سر پکڑ کر رہ گئے اور میاں پھول محمد نو دو گیارہ ہو گئے۔

جمعدار صاحب کی ہستی پیر صاحب کے نور میں اس حد تک تحلیل ہو گئی تھی کہ انھیں دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ اپنے لختِ جگر چھانو کو بھی بھول گئے تھے، جو انھیں کی گود میں بیٹھا ہوا ان کی داڑھی سے کھیل رہا تھا۔ ذہن میں یا تو پیر صاحب کا جاہ و جلال تھا یا یہ خیال کہ اگر پیر صاحب مہربان ہو گئے تو وہ کیا سے کیا ہو جائیں گے۔ آئے تو تھے تو محض کشادہ رزق لیے مگر اب ان کا جی چاہ رہا تھا کہ جو کچھ ہو سکے سب مانگ لیں۔

صاحب جو پہنچے تو جمعدار صاحب یکا یک چونک پڑے۔ ارے مجید صاحب! یہاں کہاں۔ واہ رے پیر صاحب! اللہ اللہ کتنا بلند مرتبہ ہے کہ خود مجید صاحب ان سے ملنے آ رہے ہیں، جمعدار صاحب کی ''مرعوبیت'' کی اب کوئی حد نہ تھی، اگر پیر صاحب کہتے کہ اپنا سر کاٹ کر اپنی ہتھیلی پر رکھ کے ناچو تو جمعدار صاحب نہ محض اس چیز کو ممکن سمجھتے، بلکہ فوراً اپنے گلے پر چھری پھیرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ انھوں نے صاحب کو بڑے ادب سے سلام کیا، مگر صاحب نے دیکھا نہیں۔ پیر صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ''موزید شاب'' بنفس نفیس تشریف لا رہے ہیں تو گڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''موزید شاب'' کو معلوم ہو گیا کہ پیر صاحب کتنے پانی میں ہیں، پیر صاحب نے کپڑے کے سرے کو زانو کے نیچے دبا لیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مصافحے کے بعد صاحب نے اس عظیم الشان کپڑے کا حال

دریافت کیا۔ پیر صاحب نے فرمایا، ''عورتوں کی توبہ قبول کر رہا ہوں۔'' مجید صاحب کچھ چونک سے پڑے۔ ''کیا فرمایا پیر صاحب؟ توبہ قبول کر رہا ہوں؟''

پیر صاحب، ''جی ہاں۔''

''مگر حضرت توبہ قبول کرنا تو خدا کا کام ہے۔''

پیر صاحب کچھ سٹپٹائے۔ کوئی جواب بن نہ پڑا اس لیے بات بدل کے مزاج پرسی کرنے لگے۔ مجید صاحب کو برابر اطلاعیں مل رہی تھیں کہ اس علاقے میں فاقہ بڑھ رہا ہے۔ حال ہی میں تقاوی [زرِ پیشگی] کے طور پر معقول رقم یہاں تقسیم کی گئی تھی۔ ان کی لانچ شہزاد پور سے دو میل دور کھڑی تھی، انھوں نے لانچ پر سے بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ جو شخص ہے ایک ہی طرف جا رہا ہے، کوئی گائے بیل لیے جا رہا ہے تو کوئی بھیڑ بکری، کوئی مرغی بطخ، کوئی مچھلی، کوئی دودھ، کوئی دہی، کوئی ترکاری۔ وہ یہ سمجھے کہ کوئی بڑا بازار شاید ادھر لگتا ہے اور آج شاید بازار کا دن ہے، مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب باہر سے تشریف لائے ہیں جن کے لیے یہ سب چیزیں لے جائی جا رہی ہیں تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ کہیں تقاوی کا روپیا پیر صاحب کی نذر نہ ہو جائے اور گاؤں والے کہیں بھوکے کے بھوکے نہ رہ جائیں، دریافت حال کے لیے وہ پیر صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے تھے۔ یہ تو انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ پیر صاحب کوئی سچے خدا رسیدہ آدمی نہیں، بلکہ محض ''کھاؤ گیر'' ہیں، لیکن دقت یہ تھی کہ گاؤں کے سیدھے سادھے غریب لوگوں پر پیر صاحب کا بہت اثر معلوم ہوتا تھا اور اس لیے پیر صاحب کے خلاف کوئی کارروائی آسانی سے نہ کی جا سکتی تھی۔ مجید صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ انھوں نے پیر صاحب سے کہا، ''حضرت مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ پیر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک سچے (مجمعے سے مخاطب ہو کر) ان کی بڑی پہچان کیا ہوتی ہے؟'' (جمعدار صاحب کا جی چاہا کہ کھڑے ہو کر کچھ جواب دیں، لیکن کہیں کیا یہ سمجھ میں نہ آیا اس لیے مجبوراً بیٹھے رہے)۔ ''پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مرید کے محتاج نہیں ہوتے، بلکہ مرید اُن کا محتاج ہوتا ہے، جو خود مرید کا محتاج ہو وہ بھلا انھیں کیا دے سکتا ہے (مجمعے کی طرف دیکھ کے) ٹھیک ہے نا؟''

جمعدار صاحب نے ہاں کہنے کے انداز میں سر ہلا دیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی ہلایا۔ پیر صاحب ذرا ٹپٹائے۔ مغلق اردو میں بولے، ''عالی جناب آپ تفکر فرما کر دیکھنے سکتا کہ میرا اہل و عیال کو ماشاء اللہ خوراک و پوشاک درکار ہے۔'' صاحب سمجھ گئے کہ حضرت اتنی ادق اردو بولنے کی اس لیے کوشش کر رہے ہیں کہ غریب حاضرین دربار سمجھ نہ سکیں۔ گویا فرفری بولی جا رہی ہے، اس لیے جھٹ سے بنگلا زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ.....تو آپ دیکھیے کہ اگلے زمانے کے پیر جو سچے ہوتے تھے کیا کیا کرتے تھے، کوئی جنگل سے خود لکڑی کاٹ کر لاتا تھا۔ کوئی گھاس کا گٹھر لادے پھرتا تھا تو کوئی بہشتی ہی بنا پانی پلایا کرتا تھا۔ غرض اپنے اپنے زورِ بازو سے اکل حلال کماتے تھے۔ پیری فقیری کوئی تجارت تو ہے نہیں کہ بنیے کی دکان کی طرح رکھ لیا ہے؟''

کسی نے ہاں میں سر ہلایا کسی نے نہیں میں اور دونوں نے بغیر سمجھے بوجھے۔ جمعدار صاحب نے گڑبڑا کے دونوں طرح سے سر ہلا دیا۔

''پیر صاحب کیا بنیا ہیں اور دعا تعویذ کیا دال چاول ہے کہ پیر صاحب بیچیں؟ ایسے پیروں کو تو آپ بھی جھوٹا سمجھتے ہوں گے کیوں پیر صاحب؟''

پیر صاحب ''البت'' کہہ کے رہ گئے۔ پھر کچھ سوچ کر فرمایا، ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تحفہ لانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے۔''

صاحب، ''ہاں مگر یہ تحفے تحفے کی حیثیت رکھتے تھے ذریعہ معاش کی نہیں.... پرانے زمانے کے مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ جو پیر اپنی اور اپنے بال بچوں کی روزی آپ پیدا نہیں کر سکتا وہ کیسے اپنے مریدوں کی روزی بڑھا سکتا ہے۔'' جمعدار صاحب کو جیسے کسی نے خواب سے جھنجھوڑ دیا۔ بڑے غور سے سننے لگے۔

پیر صاحب نے پھر کہا (اب کی ان کے لہجے میں بڑی لجاجت تھی)، ''عالی جناب ماشاء اللہ میرے صاحب زادگان کا خیال فرمائیں۔''

صاحب نے پھر ترجمہ کیا اور کہا، ''ان غریب لوگوں کے اپنے بال بچے بھی تو ہیں ان کا

سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اپنے اپنے بچوں کو پالیں، دیکھیے بے چارے کیسی مصیبت میں ہیں۔ ان کے بچے ننگے بھوکے ہیں۔ ان کی مدد کے لیے سرکار کی طرف سے انھیں ابھی روپیا دیا گیا ہے۔ یہ غریب لوگ جو کچھ رکھتے تھے، آپ کے پاس لے آئے ہیں۔ یہی ان کے بچوں کے کام آئے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان تحفوں کو تبرک کے طور پر ان کے بچوں کے لیے واپس دے دیں گے، اور کچھ اپنے پاس سے بھی دیں گے جیسے پہلے زمانے کے سچے پیر دیا کرتے تھے۔"

جمعدار صاحب کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ مجمعے میں ایک نے اپنی ہانڈی اٹھائی اور اپنے گھر کا راستہ لیا۔ دوسرا اپنا بکرا ہنکا کے چلنے لگا۔ صاحب یہ اثر دیکھ کے دل میں بہت خوش ہوئے۔ پیر صاحب سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ بیچ بیچ میں وہی سوال و جواب کا ہونا، پیر صاحب کا وہی ادق اردو بولنے کی کوشش کرنا، صاحب کا وہی ترجمہ کرنا وغیرہ وغیرہ اور ادھر مجمع آہستہ آہستہ کھسکتا رہا۔ تھوڑی دیر میں چند تماشائی رہ گئے اور اللہ کا نام۔

دوسرے لوگ تو غالباً خوش خوش اپنے گھر واپس گئے، مگر جمعدار صاحب کو صدمہ عظیم ہوا۔ ان کا محبوب قصرِ خیالی جسے انھوں نے پیر صاحب کی کرامتوں کے سنگِ بنیاد پر قائم کیا تھا، ان کے محبوب مجید صاحب نے ڈھا دیا تھا۔ کشادہ رزق کا جو ایک سہل سا نسخہ ان کی دانست میں ان کے ہاتھ لگ گیا تھا وہ دفعتاً کھو گیا، جیسے یکایک دریا میں گر کر بہہ گیا ہو اور یہ "ارے" کہہ کے دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ صاحب کے پاس جا کر انھوں نے بڑے ادب سے سلام کیا اور اُردو میں کہا: "سار (سر) آپ کوئی سچے پیر کو جانتا ہے؟"

صاحب نے جمعدار صاحب کو دیکھ کے پہچانا اور کہا، "کہیے اچھے تو رہے، آپ کا مدرسہ کیسا چل رہا ہے۔"

"حضور کا دعا ہے، مدرسے میں تو ہم ایک بہت بڑا مولانا رکھا ہے، مگر آج کل ذرا مشکل ہو رہا ہے۔"

صاحب چپ رہے۔

''سار! وہ سچا پیر کا بات۔''

صاحب نے مسکرا کر کہا، ''آپ خود کسی سے کم ہیں۔'' اور بات ٹال دی۔

جمعدار صاحب (بکرا پیش کرتے ہوئے) ''حضور یہ گھر کا بکرا ہے ناچ پر میں چڑھا دیں؟''

صاحب، ''کیوں؟''

''سار کے لیے۔''

''سار'' نے جمعدار صاحب کو گھور کے دیکھا، جمعدار صاحب ڈر گئے۔ ''سار معافی مانگتا ہے۔'' صاحب لانچ پر گئے۔ اور جمعدار صاحب نہایت غم وغصہ اور کھسیاہٹ کے عالم میں ادھر ادھر چکر لگاتے رہے، کچھ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں، قیص تو تھا نہیں بکرے ہی پر غصہ اتارا، وہ ''میں میں'' کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا، ''میں میں کرتا ہے! چوپ۔'' وہ کاہے کو چپ ہو، انھوں نے اور مارا۔ وہ اور چیخا۔ اب جمعدار صاحب مارے جا رہے ہیں اور بکرا چیخے جا رہا ہے، جوش میں ایک آدھ ہاتھ اس کے سینگ پر بھی پڑ گیا۔ ہاتھ میں چوٹ لگ گئی۔ جمعدار صاحب چیخے۔ ''مار ڈالے حرام زاد [بنگالی میں عموماً حرام زادے کی جگہ حرام زاد کہتے ہیں] کو... حرام زاد در حرام زاد۔'' چھانو اس ہڑبونگ سے ڈر کر رونے لگا۔

پھول محمد سارنگ کے ڈر سے اپنے کو چھپائے ہوئے تھا۔ جمعدار صاحب اور بکرے کی چیخ پکار سن کے نکلا اور ان کے پاس لپک کر پہنچا، ''جانے دئیں چاچا جائیں دیں'' کہتا ہوا۔

چاچا اردو میں، ''نہیں میں مار ڈالیں گے اُس کو۔''

''چاچا پیر صاحب کو بکرا دے دیجیے نا۔''

''نہیں میں گھر لے جائیں گے۔''

لیکن جائیں کیسے موٹر بوٹ جا چکی تھی۔ صاحب کی لانچ البتہ کھڑی تھی۔ اگر یہ کہیں تو شاید مجید صاحب لانچ پر بیٹھنے کی اجازت دے دیں، لیکن صاحب ابھی ناخوش ہو چکے تھے۔ ان سے کہیں یا نہ کہیں۔ بڑی دیر تک اسی گومگو کے عالم میں رہے، پھر جی کڑا کر کے آخر لانچ پر چڑھ ہی گئے،

لیکن خود صاحب سے کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ چپراسی کے ہاتھ میں ایک روپیا رکھ کے کہلوایا۔ صاحب نے اجازت دے دی۔ اب پھول محمد بڑے چکر میں پڑا۔ لانچ میں سفر کرنے کا خیال تو اسے خواب میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ اتنی بڑی نعمت! جیسے چاند مل جائے، لیکن سارنگ صاحب کا ڈر تھا۔ وہ تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔ خیر ہر چہ بادا باد۔ پھول محمد بھی لانچ میں آ گیا۔ نہایت نیک بنا ہوا جمعدار کے پاس بیٹھا رہا۔ سارنگ صاحب نے جو دیکھا تو ''کیوں بے شیطان کا بیٹا شیطان'' کہہ کے دو جھانپڑ رسید کیے۔ پھول محمد پی گیا۔ جمعدار صاحب بھی کچھ نہ بول سکے۔ دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ رات بھر لانچ دریا میں لنگر انداز رہی، دوسرے دن بعد نماز فجر روانہ ہوئی۔ جمعدار صاحب کو حاجی گنج میں اتارتی ہوئی چلی گئی۔

۵

اسی رات کا ذکر ہے نگن بابو اپنے چھوٹے بھائیوں کلدیپ، پردیپ اور امبیکا کے ساتھ بھوجن کرنے بیٹھے ہی تھے کہ یکایک گھر میں دھائیں دھائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک آدھ چیخ کی آواز بھی سنائی دی۔ ''ڈاکو ڈاکو۔'' نگن بابو، ''ارے باپ رے۔'' کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ شریمتی جی نے اپنے شریمان جی کو پریشان نظروں سے دیکھا۔ شریمان جی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ ایک دم سے رسوئی کے باہر دوڑ پڑے۔ پیچھے پیچھے تینوں بھائی بھی دوڑے۔ سامنے تالاب تھا۔ آواز آئی، ''غڑاپ۔'' پھر اس غڑاپ غڑاپ کی تین آوازیں اور آئیں اس کے بعد خاموشی۔ تھوڑی دیر کے بعد تالاب سے ایک سر نکلا۔ گھر میں چیزوں کے گرنے کے دھماکے ہو رہے تھے۔ ''ہے بھگوان'' کی آواز کے ساتھ سر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور سر نکلا، آوازیں کم ہو گئی تھیں۔ ایک سر اور نکلا۔

پہلے نے پوچھا، ''کون؟ دادا؟ (بڑے بھائی)''

نگن، ''کون؟ کلدیپ؟''

''ہاں۔''

اس کے بعد دو اور چھوٹے بھائیوں پرودیپ اور امبیکا نے بھی اپنا اپنا سر نکالا، چاروں بھائی دبی زبان میں ایک دوسرے کی خیریت پوچھ رہے تھے کہ شریمتی جی کی للکارتی ہوئی آواز آئی،

''ارے کیا ہو گئے؟ کہاں ہو؟''

''یہاں ہیں۔ تالاب میں، ڈاکو گئے؟''

''ہاں گئے۔''

تیزی کے ساتھ تالاب سے چاروں بھائی برآمد ہوئے۔ ''باپ رے باپ'' کہتے ہوئے گھر کی طرف بڑھے۔ شریمتی جی اب تک لکڑی لیے ہوئے کھڑی تھیں۔ نگن بابو نے پوچھا، ''ڈاکو بھاگ گئے؟''

''ہاں تم اپنی کہو۔''

''دیکھ نہیں رہے ہو، سالے ہم کو کیا پاتے، ہم تالاب میں ڈبکی مار گئے۔''

نگن بابو کو معلوم ہوا کہ ان کے جانے کے بعد ان کی شریمتی جی اور دوسری بھاوجوں نے ڈاکوؤں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ دروازہ بند کر کے جس کے جو ہاتھ میں آیا لے کے کھڑی ہو گئی اور تمام چیزیں کھینچ کھینچ کے مارنے لگیں۔ ڈاکوؤں کو چوٹ آئی۔ پڑوس کے لوگ بھی دوڑ آئے اور ڈاکو بھاگ کھڑے ہوئے۔ نگن بابو نے کہا، ''لانا تو میری بندوق ابھی حرام زادے دور نہ گئے ہوں گے۔'' پردیپ بندوق لے کے دوڑا۔

نگن، ''مار سالوں کو۔''

کلدیپ، ''دادا پہلے بندوق کا خیال ہی نہ آیا نہیں تو ایک سالے بچ کے نہ جاتے۔''

امبیکا، ''ارے ہم لوگ سب سالوں کو ڈھیر کر دیتے۔''

''کچھ حرام زادے لے تو نہیں گئے۔'' نگن نے پوچھا۔

''لے کیا جاتے۔'' اپنا پھٹا ہوا سر لے گئے ہوں گے۔'' شریمتی جی نے جواب دیا۔

گاؤں والے جمع ہو گئے۔ ہر ایک آ کے حال پوچھتا جاتا تھا اور چاروں بھائی بتاتے جاتے تھے۔ نہ لوگ پوچھنے سے تھکتے نہ یہ بتانے سے۔ ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق تنقید و تبصرہ کر رہا تھا، نگن بابو نے راتوں رات اس واقعے کی رپورٹ اس انداز میں ایس ڈی او صاحب اور کلکٹر صاحب کے پاس لکھ بھیجی جیسے کوئی بہت بڑا کارنامہ کیا ہو۔ شریمتیوں کی بہادری کا ذکر بھی کیا اور اپنے لوگوں کی استادی کا بھی۔ انھیں کانگریسی ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا تو نہ چاہیے تھا، مگر کر بیٹھے۔ بس ان کا جی چاہ گیا اور وہ جی سے مجبور ہو گئے۔ ان کے لاشعور یا تحت الشعور میں اس کی کوئی وجہ ہو تو ہو اس کا انھیں علم کیسے ہو سکتا تھا۔

۶

دوسرے دن مجلس شوریٰ بیٹھی، پنیر میاں سرت بابو اور نگن بابو مع اپنے تینوں بھائیوں کے اراکین مجلس تھے۔ مسئلہ زیر غور یہ تھا کہ ڈاکو کہاں سے آئے اور کون ہو سکتے ہیں۔ کسی نے کسی کو پہچانا تو تھا نہیں، چاروں عورتوں سے ان کے شوہروں نے طرح طرح سے پوچھا تھا، مگر سب نے یہی کہا تھا، ''ہم نے نہیں دیکھا۔'' سرت بابو اور پنیر میاں کی رائے ہوئی کہ یہ معاملہ یوں نہیں چھوڑا جا سکتا، نگن بابو نے صاد کیا۔ اخباروں میں کئی خبریں پڑھ چکے تھے کہ دہشت پسند روپیا فراہم کرنے کے لیے ڈاکے مارتے ہیں۔ ان کی رائے ہوئی کہ جلودھر اور مخلص کا نام دے ہی دیا جائے۔ پنیر میاں کو اپنے اسکول کا خیال آیا کہ اگر دونوں پکڑے گئے تو کام کیسے چلے گا۔ آخر مصالحت اس بات پر ہوئی کہ صرف جلودھر کا نام لیا جائے۔ مخلص کو رہنے دیا جائے۔ پنیر میاں نے مخلص کی جگہ جمعدار صاحب کو پھنسانے کا خیال ظاہر کیا۔ کہنے لگے، ''یہ زماندار بڑا بدمعاش ہے۔ جلودھر کا پرانا دوست ہے۔ لڑائی میں جا چکا ہے۔ ہمت کھلی ہے، اس کا ہاتھ بھی ضرور رہا ہوگا۔'' جمعدار صاحب کے نام پر سب کو اچنبھا ہوا، سب کی رائے تھی کہ وہ بکواس اور تکراری آدمی ضرور ہے، لیکن چور ڈاکو نہیں۔ پنیر میاں نے اصرار کیا کہ ''تم لوگ نہیں جانتے وہ چھپا رستم ہے۔'' جمعدار صاحب کو بچانے میں کسی کو کوئی خاص دلچسپی تو

تھی نہیں کہ ان کی طرف سے بولتا، جب پنیر میاں ایسا آدمی اصرار کر رہا ہے تو خیر ان ہی کا کہنا سہی، فضول ان کی ناخوشی کون مول لے۔ بعد میں وہ کہیں ایم ایل اے ہو کے کچھ سے کچھ ہو گئے تو مشکل پڑ جائے گی۔ وہ خود بھی اپنے شاندار مستقبل کی طرف اشارہ کر چکے تھے۔

پنیر میاں آخر وکیل ٹھہرے۔ تھانے میں ابتدائی رپٹ کا مسودہ ان کے علاوہ کون تیار کر سکتا تھا۔ بڑی کاٹ چھانٹ کے بعد آخر ایک مسودہ تیار ہوا۔ چونکہ عورتیں کسی طرح اس پر آمادہ نہ ہوئیں کہ جلودھر اور جمعدار صاحب کو پہچاننے کا اقرار کرتیں اس لیے اس کام کا بیڑا مردوں نے اٹھایا۔ آخر یہ لوگ تالاب ہی میں تو تھے۔ وقتاً فوقتاً سر نکال کر دیکھتے ہی تھے، اسی وقت ڈاکوؤں میں سے کچھ کو پہچان لینا کون بڑی بات تھی۔ الغرض صاف لکھ دیا گیا کہ جلودھر اور ذلیل الدین کو پہچانا گیا اور یہ لوگ بڑے بدمعاش ہیں، پنیر میاں نگن بابو کو ساتھ لے کے خود تھانے گئے۔ ان کے کہنے سے نگن بابو نے داروغہ جی کے ہاتھ میں دس روپے رکھے اور داروغہ جی نے جلد تفتیش کا وعدہ کیا۔

جمعدار صاحب کی مالی حالت یوں ہی پتلی ہو رہی تھی۔ اب یک نہ شد دو شد۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ داروغہ جی نے پہلے تو گھوڑا مارا پہنچ کے معائنہ موقع کیا۔ پھر جلودھر اور جمعدار صاحب دونوں کو طلب کیا گیا، جمعدار صاحب پہلے آئے تو حسب معمول بڑی اکڑ کے ساتھ، سمجھے کہ مشورے کے لیے داروغہ جی نے بلایا ہوگا۔ لیکن جب انھیں معاملے کی اصل نوعیت معلوم ہوئی تو ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ انھوں نے بہت انکار کیا۔ بڑی قسمیں کھائیں، مگر کون سنتا ہے۔ بڑی مشکل سے داروغہ جی ضمانت لے کے چھوڑنے پر راضی ہوئے، بشرطیکہ جمعدار صاحب پچیس روپے نذر کریں۔ مرتا کیا نہ کرتا بے چارے گئے بی بی جان کا سو روپے کا قیمتی زیور سرت بابو کے پاس پچیس روپے میں رہن رکھ کے روپیا داروغہ جی کی نذر کیا، لیکن مقدمے کی تلوار سر پر جھولتی رہی۔ معلوم نہیں ابھی اور کتنا خرچ کرنا پڑے اور کیا نتیجہ نکلے۔ سرت بابو خوش ہوئے کہ چلو بونی اچھی ہوئی۔ جلودھر نے پہلے تو ہیکڑی کی لی اور خوب تکرار کی مگر جب دیکھا کہ اب حوالات میں بند ہونا ہی پڑے گا تو مجبوراً اس نے بھی جمعدار صاحب کی طرح پچیس روپے دے کے ضمانت کا بندوبست کیا۔ پنیر میاں نے خود

داروغہ جی سے معاملہ طے کیا۔ جلودھر نے پنیر میاں سے پچیس روپیا مانگا تو پنیر میاں کچھ ہچکچائے لیکن بالآخر روپیا دینے پر راضی ہو گئے، بطور پیشگی تنخواہ کے۔ جمعدار صاحب کی عقل چرخ تھی۔ پریشانی کے عالم میں باپ کی قبر پر گئے۔ بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ فاتحہ پڑھی اور دعا مانگی۔ دعا مانگتے وقت انھیں یکا یک خیال آیا کہ کہیں یہ اس بات کی سزا تو نہیں ہے کہ وہ کل پیر صاحب کو بغیر بکرا اندر کیے چلے آئے تھے۔ پیر صاحب کہیں سچے پیر نہ رہے ہوں اور انھیں یہ بات بری نہ لگی ہو۔ فوراً بکرا لے کر شہزاد پور چلے، راستے میں پیر صاحب کی کرامتوں کے قصے کہتے ہوئے، شہزاد پور پہنچ کے معلوم ہوا کہ پیر صاحب نے اسی رات کو اپنا بوریا بستر سنبھالا اور کہیں چلے گئے، یہ کوئی نہیں بتا سکا کہاں گئے۔

پیر صاحب کے اس طرح غائب ہو جانے کی خبر سن کر جمعدار صاحب اور بھی مرعوب ہوئے اور اسے بھی پیر صاحب کی کرامت سمجھے، واپسی میں پیر صاحب کے یکا یک ''غائب ہو جانے'' کو اس انداز سے بیان کرتے رہے کہ مسافروں کی عقیدت مندی تو خیر بڑھ ہی گئی۔ لیکن خود جمعدار صاحب کا عقیدہ بھی اپنی ہی باتیں سن سن کے مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا۔ دل میں انھوں نے پیر صاحب سے بڑی معافی مانگی اور اپنے کان دونوں ہاتھوں سے اینٹھ کے اپنے دونوں گالوں پر ایک ایک چپت توبہ کے انداز میں لگائی۔ شہزاد پور سے واپس ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ جلودھر ان سے ملنے آیا۔ قسمت نے دونوں کو ایک ہی کشتی میں لا بٹھایا تھا۔ جلودھر کو جمعدار صاحب کی بے گناہی کا پورا یقین تھا۔ اگر چہ جمعدار صاحب جلودھر کو شبہے کی نظر ہی سے دیکھتے تھے تاہم اس معاملے میں کیا عجب ہے کہ وہ بھی انھی کی طرح بے قصور ہو، الغرض مشورہ شروع ہو گیا۔ آخر کون ان دونوں کا اتنا بڑا دشمن ہو سکتا ہے جس نے اتنے سنگین معاملے میں انھیں بے گناہ پھنسا دیا۔ جمعدار صاحب کو اپنے دشمن کا پتا چلانے میں چنداں دقت نہ ہوئی۔ ہو نہ ہو یہ پنیر میاں ہی کا کام ہے۔ جلودھر نے نگن بابو کو اپنا دشمن قرار دیا اور معاملے کی پیچیدگیاں انھیں سمجھانی شروع کیں۔ جمعدار صاحب کا دم گھٹ رہا تھا، لیکن مجبوراً سنتے رہے، جب وہ ختم کر چکا تو انھیں محسوس ہوا کہ سینے پر سے ایک بوجھ اٹھ گیا۔ کہنے لگے، ''یہ سب تو ٹھیک ہے جو تم کہہ رہے ہو، مگر سچی بات ہم سے پوچھو، بھیا اس دن ہم.....'' اب انھوں نے

پیر صاحب کا قصہ تفصیل سے سنانا شروع کیا۔ وہ کس طرح مجید صاحب کے ساتھ واپس آئے پھر کس طرح دوبارہ ان کی خدمت میں بکرا نذر کرنے گئے اور وہ کس طرح غائب ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر آمدم بر سر مطلب کہ یہ جھوٹا معاملہ پیر صاحب کے عتاب کا نتیجہ ہے، جلودھر کو پیر صاحب کی کرامتوں کے قصوں میں مطلق دلچسپی نہ تھی، مگر وہ جانتا تھا کہ جمعدار صاحب کوئی قصہ کہنے پر آ جائیں تو جب تک وہ ختم نہ کرلیں پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ مصلحت اس نے اسی میں دیکھی کہ خاموشی سے سنے جائے۔ جمعدار صاحب نے صاحب کے ساتھ لانچ پر آنے کا ذکر کیا تو اس نے دلچسپی سے سننا شروع کیا۔ پورا قصہ ختم ہونے کے بعد اس نے پوچھا، ''تو آپ موزید شاب کے ساتھ لانچ پر آئے؟''

''اور کیا، بھیا یقین نہ آئے تو پھول محمد سے پوچھ لو، اے پھول محمد....'' او کمبخ ..... بلا تو پھول محمد کو۔''

''نہیں رہنے دیجیے ہم کو یقین ہے..... تو آپ یہاں کب پہنچے؟''

''کل صبح۔''

''پرسوں رات کہاں تھے؟''

''کہہ تو دیا بھیا موزید شاب کی لانچ میں شہزاد پور کے پاس۔''

''اسی رات کو تو ڈاکا پڑا، یہ کیسے ہوسکتا ہے آپ ایک ہی وقت میں صاحب کی لانچ میں بھی رہیں اور نگن بابو کے گھر ڈاکا بھی ڈالیں۔''

جمعدار صاحب بگڑ پڑے، ''ارے ہم کہاں ڈاکا مارا۔''

جلودھر (اردو میں)، ''ہم تو یہی بولتا ہے کہ آپ ڈاکا نہیں مارا۔''

جمعدار صاحب، ''ہاں ایسا کہو۔''

جلودھر، ''(پھر بنگالی میں) یہ تو بڑے کام کی بات معلوم ہوئی، موزید شاب خود جان لیں گے کہ مقدمہ کتنا جھوٹا ہے، آپ سے تو صاحب سے خاطر [بنگالی محاورہ] ہے آپ سب حال انھیں لکھ کے دے آئیے، کہیے تو میں لکھ دوں۔''

''ہاں بھیا لکھو دو۔'' بکرے والے قصے کے بعد جمعدار صاحب موزید شاب کے پاس جانے سے جھجکنے لگے تھے، جلودھر نے بڑی تفصیل سے خط لکھا اور یہ طے پایا کہ وہ خود جمعدار صاحب کو لے کے صاحب کے پاس جائے گا، لیکن کل تو صاحب صدر مقام پر ہوں گے نہیں، کالی گنج میں جہاں سالانہ کشتی کی دوڑ ہوتی ہے وہاں ہوں گے، کیوں نہ وہیں چلا جائے، کشتی کی دوڑ کا بھی تماشا دیکھا جائے گا اور کام بھی ہو جائے گا۔ جمعدار صاحب یوں تو کشتی کی دوڑ دیکھنے برابر ہی جایا کرتے تھے اور کچھ دن پہلے تک تو اس میں خود بھی شریک ہوا کرتے تھے، مگر اس مقدمے سے ان کا دل مرجھا گیا تھا اور کھیل تماشوں میں شریک ہونے کو ان کا جی نہ چاہتا تھا، پھر بھی جلودھر اور اس سے زیادہ پھول محمد کے اصرار پر راضی ہو گئے، جلودھر جانتا تھا کہ موزید شاب کے خلاف گم نام درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں۔ وہ خود کئی بھیج چکا تھا، اب وہ ڈرا کہ کہیں وہ درخواستیں رنگ نہ لائیں۔ اور موزید شاب کا سچ مچ تبادلہ نہ ہو جائے۔ اگر ہو گیا تو اس جھوٹے مقدمے سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔ اُس نے فوراً ایک گم نام خط موزید شاب کی تعریف میں لکھ کے سب کو بھیج دیا۔ ان کو غریبوں کا مائی باپ قرار دیا۔ اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ اگر ان کا تبادلہ ہو گیا تو غریب مر جائیں گے۔

کمشنر صاحب کو جب یہ خط ملا تو انھوں نے کہا، ''یہ مجید ہی کی حرکت معلوم ہوتی ہے شاید اسے خبر لگ گئی ہے کہ لوگ اس کے خلاف ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ خط بھجوایا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا چالاک آدمی سمجھتا ہے بیوقوف کہیں کا۔''

۷

اگرچہ جمعدار صاحب قطعی بے قصور تھے اور گاؤں والوں کو ان کے ماخوذ ہونے پر بڑا تعجب ہوا تھا، پھر بھی تعجب کی جگہ شبہے نے جلد لے لی۔ بے چارے جدھر جاتے لوگ شبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے اور ان کی طرف اشارہ کرتے۔ پہلے انھیں غصہ آتا، لیکن یہ جان کر کہ لوگ اُن پر شبہ کر رہے ہیں، یہ خود بھی ایک حد تک خفیف ہونے لگے اور بجائے غصے سے تردید کرنے کے عموماً خاموش

ہو جاتے۔ صرف دل ہی دل میں کہتے، لوگوں کا جو جی چاہے کہیں، لیکن خدا تو جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ گاؤں والوں کو نہ اپنا منہ دکھائیں اور نہ ان کا دیکھیں۔ کالی گنج میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اس طرح گاؤں والوں سے دور رہیں گے، پھول محمد تو ساتھ تھا ہی۔ کشتی چلانے کے لیے انھوں نے چاند شیخ کو بھی ساتھ لے لیا۔ چاند شیخ غریب مزدور تھا، عمر قریب پچیس کے تھی۔ دوسروں کے کھیت میں کام کرتا اور کبھی کبھی کشتی بھی چلاتا، نو دس بجے رات کو کشتی روانہ ہوئی۔ جلودھر نے اپنے دستور کے مطابق چاند شیخ سے باتیں کرنی شروع کیں۔ پوچھا، ''چاند بھیا تمھاری اپنی تو کوئی زمین نہیں ہے؟'' چاند شیخ کو برا لگا۔ اس نے کہا، ''ہے کیسے نہیں۔'' جلودھر کو ذرا تعجب ہوا اور پوچھا، ''کتنی ہے؟ کہاں ہے؟'' چاند شیخ نے جواب دیا۔ ''تین بیگھے ہے، دریا میں۔'' جلودھر چونک پڑا۔ ''کہاں؟ دریا میں؟''

''ہاں پانچ سال ہوئے ہماری زمین دریا کاٹ لے گیا۔ ابھی دریا میں ہے جب ہٹ جائے گا، پھر نکل آئے گی۔'' جلودھر کو چاند شیخ کی سادگی، خوش عقیدگی اور اطمینان پر کچھ تعجب ہوا۔ کچھ ہنسی آئی۔ وہ کچھ اور بھی باتیں کرتا، مگر جمعدار صاحب کو یہ بک بک بری لگ رہی تھی۔ ان کی طبیعت پریشان تھی، سونا چاہتے تھے، مگر نیند نہ آتی تھی۔ انھوں نے کہا، ''جلودھر بھیا سونے دو باتیں صبح کر لینا۔'' سب خاموش ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کشتی کالی گنج پہنچ گئی۔

کالی گنج میں بڑی دھوم دھام نظر آ رہی تھی۔ سینکڑوں کشتیاں چلی آ رہی تھیں۔ تا حد نظر سرخ نیلے پیلے بادبانوں جھنڈیوں اور جھنڈوں کی بدولت ساری فضا قوس قزح بنی ہوئی تھی۔ کنارے پر بانس اور ٹین کی عارضی دکانیں لگائی جا رہی تھیں۔ ہر طرح کی دکانیں تھیں۔ کھانے پینے سے لے کر بزازے تک، کچھ کشتیاں رنگین گٹھریوں سے لدی ہوئی تھیں، قریب آئیں تو یہ گٹھریاں بولتی چالتی جاندار نظر آئیں۔ ان کی آغوش میں چھوٹی چھوٹی گٹھریاں بچوں کی صورت میں اچھلیں۔ ہر بڑی گٹھری کے ساتھ تین تین چار چار چھوٹی گٹھریاں تھیں، مرد دوسری کشتیوں سے اترے، طرح طرح کی داڑھیوں اور رنگ برنگ کے تہمدوں سے بنے سنورے، کچھ داڑھیاں نورانی تھیں، کچھ سڈول، کچھ پر

پانی و بہزاد کے موقلم کا گمان ہوتا تھا۔ ہر مرد نے اپنے بار امانت کو سنبھالا، عورتیں پیچھے پیچھے اور مرد آگے آگے، ہر خاندان کی علیحدہ ٹولی۔ چھوٹے چھوٹے چشمے کی طرح انسانوں کے اس رنگین دریا میں جو کنارے پر موجیں مار رہا تھا، ملتی جاتی تھی۔ اس کی سطح پر چھوٹے بڑے بلبلے تیرتے نظر آرہے تھے، چمکتے دمکتے، کامدار ٹوپیاں پہنے۔ والدین کے کندھوں پر سوار، کوئی بچہ غبارہ پھلا رہا ہے، کوئی بھونپو بجا رہا ہے، کوئی رو رہا ہے، کسی کی ناک بہہ رہی ہے۔ جمعدار صاحب کے دکھے دل میں چھانو کی یاد بار بار آکر چٹکیاں لینے لگی۔ وہ اس وقت ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔ اسے بھی جمعدار صاحب اپنے کندھوں پر چڑھا کر تمام میں گھوماتے۔ وہ بھی بھونپو بجاتا، وہ بھی چیزیں خرید کر کھاتا، وہ بھی ہنستا، وہ بھی روتا، جمعدار صاحب اسے بھی چپ کراتے۔ ناک پونچھتے اور وہ چپ نہ ہوتا تو اس کے منہ میں ایک رس گلہ ٹھونس دیتے جیسا انھوں نے پارسل کیا تھا، مگر اس مقدمے کا برا ہو کہ اب کی دفعہ ان کا جی چھانو کو لانے کو نہ چاہا۔ خیر، آئندہ سال سہی۔ پھول محمد کا جی بھی چیزیں خریدنے کو چاہ رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے آٹھ آنے پیسے میلے کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ کچھ گڑ چوڑا اور تیل میں تلی ہوئی جلیبیاں اپنے لیے خریدیں اور ایک بھونپو چھانو کے لیے۔ بھونپو دیکھ کر جمعدار صاحب سمجھ گئے۔ انھوں نے بڑی محبت سے چار آنے پیسے اپنی طرف سے پھول محمد کو دیے۔ پھول محمد نے ''جا چار ہنے دیں'' کہہ کے لے لیا۔ کچھ رس گلّے خریدے اور ایک غبارہ۔ رس گلے میں اس نے جمعدار صاحب کو بھی شریک کیا۔ وہ تھوڑے اصرار کے بعد شریک تو ہو گئے، مگر انھیں چھانو کا خیال ستا رہا تھا۔ انھوں نے چھانو کے لیے بھی کچھ رس گلے خریدنے کے لیے چار آنے پیسے اور دینے چاہے۔ پھر اُن کے دل نے کہا، وہ خود اپنے ہاتھ سے کیوں نہ خریدیں۔ وہ دکان کی طرف بڑھے۔ مول بھاؤ کرتے اور کریدتے وقت ان کا دل ایک خاص لذت محسوس کر رہا تھا جسے چھانو کی محبت کا مزہ کہا جا سکتا تھا۔ اس مزے نے ان کے غم کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا دیا اور انھوں نے بجائے چار آنے کے ایک روپے کی چیزیں خرید ڈالیں۔ چاند شیخ بھی دکان پر نظر آیا۔ کچھ چیزیں دیکھ بھال رہا تھا۔ اٹھاتا دام پوچھتا، نظر بھر کے دیکھتا اور رکھ دیتا۔ جمعدار صاحب نے جب اسے دیکھا تو وہ ایک دکان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جس میں تہمد،

بنیائین ساڑیاں اور بنی ہوئی جمپریں اور بچوں کے نیکر باڈی خاص طور سے نمایاں تھے۔ اس کے علاوہ کچھ پیتل اور گلٹ کی چیزیں بھی تھیں اور کچھ کنگھی چوٹی کا سامان بھی۔ جمعدار صاحب سمجھے شاید اپنے لیے کوئی تہمد خریدنا چاہتے ہے۔ انھوں نے فوراً چند تہمدوں کے خوش رنگ ہونے کے متعلق اپنا قیمتی مشورہ پیش کیا۔ چاند شیخ کچھ جھینپ سا گیا۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''اچھا یہ بات ہے۔ تو ساری لے لو اور یہ جمپر۔'' قیمت پوچھی تو اتنا روپیا نہ جمعدار صاحب کے پاس تھا اور نہ چاند کے۔ جمعدار صاحب کچھ خفیف سے ہوئے اور اپنے آپ کو دل ہی دل میں ملامت کرنے لگے کہ ناحق وہ بیچ میں پڑے۔ چاند کی نظر بچا کے وہ وہاں سے کھسک گئے۔ چاند نے بالآخر ایک جوڑ پیتل کا بُندا خریدا۔ اس کی بیوی ان بُندوں کو دیکھ کر کتنی خوش ہوگی، وہ پہنے گی تو کتنی اچھی لگے گی۔ چاند کا چہرہ اس خیال سے چمکنے لگا۔ یہ چمک آواز میں منتقل ہوگئی اور چاند گنگنانے لگا۔

دوڑ میں شریک ہونے والی کشتیاں کچھ تو آ گئی تھیں کچھ آ رہی تھیں، رنگی چونگی چم چم چمکتی رنگین جھنڈیوں سے سجی ہوئی، رنگ برنگ کے جھنڈے اُڑاتی۔ ہر ایک کشتی میں ڈھولک بج رہی تھی اور گانے للکار للکار کر گائے جا رہے تھے، جیسے رجز پڑھے جا رہے ہوں۔ رفتہ رفتہ سب کشتیاں آ گئیں اور سج سجا کر مقابلے کے لیے پرے جما کر کھڑی ہو گئیں۔ دونوں کناروں پر غریب تماشائیوں کی کشتیاں اور امیروں کے بجرے گل بداماں اور گلستاں بدوش یوں نظر آ رہے تھے جیسے افق دریا پر شفق پھولی ہو۔ ''موزید شاب'' بھی اپنی لانچ سے ایک موٹر بوٹ میں اترے، موٹر بوٹ پھول محمد کے شوق کی طرح ہر طرف تیز تیز جا رہی تھی۔ جب انتظام درست ہوگیا تو سیٹیاں بجنے لگیں اور پستول کے فائر نے دوڑ کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔

دوڑ ہوئی اور خوب ہوئی، جیتنے والے فخر و مباہات کی تصویر بنے جوش سے ڈھولک بجاتے چیخ چیخ کے گاتے ہوئے انعام لینے کے لیے بڑھے۔ جمعدار صاحب کو بھی اپنے سینے میں کشادگی محسوس ہونے لگی۔ جیسے وہ خود ہی جیتنے والوں میں ہوں، آخر وہ کسی زمانے میں تو تھے ہی، لیکن پھر مقدمے کے خیال نے انھیں افسردہ کر دیا۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اُن کا اٹھا ہوا سینہ بیٹھ

گیا۔

تماشا ختم ہوا اور جمعدار صاحب مع پھول محمد کے صاحب کی لانچ کی طرف بڑھے۔ جلودھر غائب تھا۔ جمعدار صاحب کھسیا رہے تھے اور غصہ پھول محمد پر اتارنے والے ہی تھے کہ جلودھر نظر آیا، کچھ لوگ اسے گھیرے ہوئے تھے، اپنی سنا رہے تھے اور اس کی سن رہے تھے۔ پھول محمد جلودھر کو دیکھ کر چیخا، ''او! جلودھر بابو چاچا یہاں پریشان ہو رہے ہیں اور آپ وہاں بکواس مچائے ہیں۔'' جلودھر آ گیا۔ جمعدار صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور صرف ''کہاں چلے گئے تھے بابو'' کہنے پر قناعت کی۔ صاحب کے پاس پہنچے، جھجکتے ہوئے درخواست دی اور حالات بتائے۔ جلودھر نے کم اور پھول محمد اور جمعدار صاحب نے زیادہ۔ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، مگر کوئی جواب نہ دیا۔ جمعدار صاحب متردد ہوئے، مگر کیا کرتے، تھوڑی دیر کھڑے رہے، پھر چلے آئے اور شام کو اپنی کشتی میں روانہ ہو گئے۔

۸

اماوس کی اندھیری گھپ رات تھی۔ آسمان سے کروڑوں حوریں تاروں سے جھانک رہی تھیں۔ ان کا عکس دریا میں لوٹ رہا تھا۔ کنارے پر لاکھوں جگنو کی پریاں رقص کر رہی تھیں، جیسے زمین پر آسمان اتر آیا ہو۔ شبنم میں نہائی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آغوشِ دریا کو گدگداتی، موجوں سے کھیلتی، تاروں کی حوروں کو جھولا جھلاتی، جگنو کی پریوں کو اڑاتی، انسان کے دل میں ترنگ پیدا کرتی، کچھ ایسی کیفیت تھی کہ درختوں کی پتیاں، پانی کی لہریں، تاروں کی حوریں، جگنو کی پریاں، زمین و آسمان اور خود اماوس کی رات، گیت گاتی معلوم ہوتی تھیں۔ انسان کے گانے کی آواز بھی دور سے آنے لگی۔ وہ بھٹیالی کا روح پرور راگ، دریائے والگا کے کشتی بانوں کے راگ کو شرماتا ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کی نغمگی انسان کی لَے میں حل ہو گئی ہے اور یہ لَے فطرت سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ انسان کے وجود کا پردہ اٹھ چکا ہے، اور نغمہ ہی نغمہ رہ گیا ہے۔ نہ گانے والے کو اپنے وجود کی خبر تھی

اور نہ سننے والے کو۔ دونوں نغمے میں جذب ہو کر جزوِ نغمہ بن چکے تھے۔ جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو، بنگال کا جادو۔

چاند شیخ کو بھی بٹھیالی راگ لے اڑا اور اس کی دردناک آواز فضا میں نغمہ بار ہو گئی۔ چاند گا رہا تھا، ''آمی جلسے آمی جلسے۔ تور بھانگا نو کائے چڑ تام نا۔ چڑ تام نا۔ تور بھانگا نو کائے۔'' (میں جانتا تو بیٹھتا کیوں ٹوٹی ناؤ میں.... تری ٹوٹی ناؤ میں..... میں جانتا) جمعدار صاحب جلو دھر اور پھول محمد کی طرح ساری کائنات مسحور تھی۔ کشتی بھی چلی جا رہی تھی، بادبان ایک نوجوان کے سینے کی طرح بادِ مراد سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بادِ مراد جس میں بھٹیالی راگ کی لاکھوں کروڑوں لہریں اڑ رہی تھیں، گویا راگ کشتی کو اڑائے لیے جا رہا تھا۔ جوار کا پانی پیچھے سے ہڑ ہڑ کرتا ہوا آیا۔ کشتی اور تیز چلنے لگی۔ آسمان پر ابر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نمودار ہوئے۔ وہ بھی کشتی کی طرح بہہ رہے تھے۔ جلد ہی آسمان پر ایسی سینکڑوں ہزاروں کشتیوں کے پرے کے پرے جم گئے۔ جیسے آسمان کا بحری بیڑا جنگ کے لیے تیار ہو رہا ہو۔ تارے چھپ گئے، ہوا تھم گئی، نغمہ ختم ہو گیا۔ جگنو غائب ہو گئے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ صرف دریا میں تھوڑی چمک باقی رہ گئی جیسے بہت بڑا سانپ کینچل میں چمک رہا ہو۔ جوار کی ہڑ ہڑ میں سانپ کی پھنکار کا اثر پیدا ہونے لگا۔ بادبان کسی بڈھے آدمی کے چہرے کی طرح پچک گیا۔ ڈھلا ہوا، جھریاں پڑا ہوا۔ فضا کا یہ عالم تھا۔

سانس بھی جیسے ہو رکی، نبض بھی جیسے ہو تھمی

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیز ہونے والی ہے۔ چاند نے کہا، ''چاچا طوفان آ رہا ہے۔''

طوفان کوئی ایسی نئی چیز نہ تھی۔ برابر ہی آیا کرتا تھا۔ چاچا نے کوئی خاص تشویش ظاہر نہ کی۔ جب طوفان آ جائے گا تو کشتی کنارے پر حسبِ معمول باندھ دی جائے گی۔ طوفان کے بعد کشتی پھر چل پڑے گی، لیکن کبھی کبھی یہ اندیشہ چور کی طرح دبے پاؤں ان کے دل میں آتا کہ یہ اماوس کی رات ہے اور دریا بھی اڑیل خاں ہے جس میں کشتی پہنچ چکی تھی۔ کہیں طوفان معمول سے زیادہ زور نہ پکڑے۔ احتیاطاً کشتی کا رخ کنارے کی طرف کر دیا گیا۔ کچھ دیر تک کامل حبس رہا، کہیں ایک پتی نہ

ہلتی تھی۔ جتنا حبس بڑھتا جاتا تھا اتنا ہی جمعدار صاحب اور چاند شیخ گھبرا رہے تھے۔ جلودھر اور پھول محمد بے خبر سو رہے تھے۔ جلودھر بڑبڑا رہا تھا، امیر غریب..... روٹی..... آگ..... بم..... وغیرہ کے الفاظ خاص طور سے سنائی دیتے تھے، لیکن پوری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ جمعدار صاحب کو ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ اسے چھیڑ چھیڑ دیتے۔ تھوڑی دیر کے لیے بڑبڑانا بند ہو جاتا۔ اس کے بعد پھر شروع۔ یکایک زمین و آسمان جنبش میں آئے۔ زمین پر ہوا کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ آسمان پر بجلی کے نیزے چمکنے لگے۔ کچھ دیر بعد ان پرانے ہتھیاروں کی جگہ نئے سامانِ حرب استعمال کیے جانے لگے۔ ہوائی بمبار اڑنے لگے۔ توپیں گرجنے لگیں۔ بم پھٹنے لگے۔ جمعدار صاحب نے "یسبح الرعد بحمدہ" کہتے ہوئے کان میں انگلی دے لی۔ ان کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ گرج کی آواز سے جلودھر اور پھول محمد چونک کر اٹھ بیٹھے۔ ہوا زور پکڑتی گئی۔ اڑیل خاں صاحب جوش میں آ گئے۔ غصے میں بپھر گئے، ہر موج پہلے سے زیادہ اونچی آنے لگی۔ کشتی کسی ڈرپوک کے دل کی طرح ڈوبنے اچھلنے لگی۔ جلودھر نے حالات کا جائزہ لیا اور جمعدار صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، انھوں نے کہا، "جو خدا کو منظور ہوگا، ہوگا۔" جلودھر کو یہ دقیانوسی قسم کی بات معلوم ہوئی، بحث کا موقع نہ تھا۔ اس کی زندگی میں خود بہت سے طوفان آ چکے تھے اور آتے ہی رہتے تھے، وہ ان کے تھپیڑوں کا عادی ہو چکا تھا۔ ان سے ٹکریں لے لے کے اس کے کردار میں مضبوطی آ گئی تھی، وہ اس طوفان کے مقابلے کے لیے بھی کمر بستہ ہو گیا۔ اُس نے کہا، "آیئے ہم سب لوگ مل کے کشتی کو بچانے کی کوشش کریں، جو کچھ میں کہوں وہ کیجیے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے قیادت سنبھال لی۔ خود ایک چپولے کے پوری قوت سے چلانے لگا۔ جمعدار صاحب اور پھول محمد سے اس نے کہا کہ کشتی کا پانی نکال نکال کے پھینکیں۔ وہ پھینکنے لگے۔ کشتی کا رخ کنارے کی طرف کیا گیا، لیکن کنارہ دور تھا اور طوفان بڑھتا جاتا تھا۔ وحوش و طیور، شجر و حجر الامان والحفیظ کہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، لیکن امان ملتی نظر نہ آتی تھی۔ یکایک بجلی زور سے چمکی، جلودھر نے کہا، "ذرا کنارے کی طرف دیکھو۔ کنارے کی طرف۔" سب کی نگاہیں اٹھ گئیں، بجلیاں چمک رہی تھیں، ان کی روشنی میں کنارے پر عجیب تماشا نظر آیا۔ فضا میں نرالا رقص ہو رہا تھا، طوفان اپنے مرکز پر یکایک

ناچنے لگا تھا۔ زمین سے کئی سوفٹ اوپر مکانوں کے ٹین ناچ رہے تھے۔ بکریاں ناچ رہی تھیں، مرد ناچ رہے تھے، عورتیں ناچ رہی تھیں۔ بچے ناچ رہے تھے اور آسمان کی طرف ناچتے چلے جارہے تھے۔ یہ رقص یکایک رقص بسمل بن گیا۔ ٹین ناچتے ہوئے آتے۔ شپ سے سر کٹ کے الگ ناچنے لگتا، دھڑ الگ ناچتا رہتا۔ ایک عورت کا سر بھی بکھرے ہوئے بالوں کے ہالے کے درمیان ناچنے لگا۔ ایک گائے کا سر بھی ناچ اٹھا، اور چھٹک کے آدمی کے پیٹ سے ٹکرایا۔ پیٹ میں سنگینیں گھس گئیں۔ اب فضا میں بہت سے سر اور بہت سے دھڑ الگ الگ ناچ رہے تھے۔ جانوروں کے، مردوں کے، عورتوں کے، بچوں کے، آناً فاناً یہ ناچتی ہوئی ٹولی فضا میں بکھر گئی۔ ناچنے والے زمین پر اس طرح گرے جس طرح بطخیں شکاری کی بندوق سے گرتی ہیں۔ جمعدار صاحب کا دماغ ناچنے لگا۔ وہ سجدے میں چکرا کے گر پڑے۔ پھول محمد ان سے لپٹ گیا۔ چاند کا رنگ بھی زرد پڑ گیا۔ جلودھر بھی پسینے پسینے ہوگیا۔ طوفان تو ہر سال ہی آتے تھے، مگر ایسا طوفان کسی نے نہ دیکھا تھا، خیریت یہی تھی کہ اس طوفان کا مرکز خشکی پر تھا پانی پر نہیں۔ ورنہ کشتی بھی اُڑ گئی ہوتی، شاید صرف آندھی تباہی کے لیے کافی نہ سمجھی گئی، بارش بھی آ گئی اور اس زور شور کے ساتھ کہ معلوم ہوتا تھا کہ سال بھر کا پانی آج ہی برس جائے گا۔ پانی کی بوندیں تھیں کہ لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں، بڑی بڑی کشتیاں ڈوب رہی تھیں، الٹ رہی تھیں، جمعدار صاحب کی چھوٹی کشتی موجوں کے ساتھ اٹھتی تھی، گرتی تھی، جلودھر اور چاند شیخ پوری قوت سے کشتی چلائے جا رہے تھے۔ جمعدار صاحب اور پھول محمد کشتی سے پانی نکال نکال کے پھینکتے جاتے تھے، لیکن طوفان اتنے زور کا تھا اور بارش اتنی شدت سے ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کشتی اب الٹی اب ڈوبی۔ کشتی کنارے تک آ چکی تھی، مگر چونکہ موجیں کنارے سے زوروں سے ٹکرا رہی تھیں اس لیے کنارے تک پہنچنا محال تھا، کشتی میں پانی بھر چکا تھا، پانی کے تھپیڑے چہروں پر پڑ رہے تھے۔ موجیں بیس بیس فٹ اونچی آ رہی تھیں۔ بالآخر کشتی الٹ ہی گئی اور جمعدار صاحب مع اپنے ساتھیوں کے دریا میں کود پڑے۔ جمعدار صاحب اور پھول محمد ایک ساتھ تھے اور جلودھر اور چاند شیخ ایک ساتھ، تھوڑی دیر تو ان لوگوں نے ہاتھ پاؤں چلائے اس کے بعد..... اندھیرا۔

۹

مجید صاحب کی لانچ بھی طوفان میں گھر گئی تھی۔ سارنگ اور خلاصیوں نے لانچ کو بچانے کی ہر ممکن تدبیر کی۔ پہلے تو کوشش یہ کی کہ کسی طرح لانچ کو کسی پتلی ندی میں پہنچا دیں، مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ مجبوراً دونوں لنگر گرا دیے اور لانچ کو طوفان کے رخ پر کھڑا کر دیا تاکہ طوفان کا تھپیڑا لانچ کی بغل مین نہ لگے، بلکہ منہ پر پڑے، لانچ کی کرسیاں دھڑا دھڑ گرنے لگیں۔ شیشے کے برتن چکنا چور ہو گئے۔ صاحب کے ہاتھ پاؤں سر زخمی ہو گئے۔ ایک خلاصی نے اذان دینی شروع کر دی۔ سارنگ صاحب باآوازِ بلند قرآن شریف زبانی پڑھنے لگے۔ جب لانچ بچتی نظر نہ آئی تو لائف بوٹس پانی میں ڈال دی گئیں۔ خلاصی اور صاحب سب پانی میں کود گئے۔ سارنگ نے سب سے آخر میں ڈوبتی ہوئی لانچ کو چھوڑا۔ صاحب ڈوبنے لگے، اگرچہ اس طوفان میں اپنی جان بچانی مشکل تھی، لیکن صاحب کو ڈوبتا ہوا دیکھ کر ایک خلاصی نے اپنی جان پر کھیل کر انھیں اپنی پیٹھ پر لے لیا۔ کنارے پر پہنچ کر سب بے ہوش ہو گئے۔ صبح کے قریب سب کو ہوش آیا، زخم پھٹے پرانے کپڑوں سے باندھے گئے۔ پھر سب اُٹھ کے پاس کے گاؤں میں گئے۔ وہاں عجیب منظر تھا۔ بھاٹے کی وجہ سے پانی بہت دور تک ہٹ گیا تھا۔ دیہات کا میل ڈیڑھ میل ٹکڑا بالکل صاف ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے درخت اکھڑے پڑے تھے۔ کچھ درخت کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کی اونچی اونچی ڈالوں پر مکانوں کے ٹین ٹنگے ہوئے تھے۔ تڑے مڑے جیسے کوئی دھوتی ٹانگ دے، لاشیں جگہ جگہ نظر آ رہی تھیں۔ بہت سے لوگ طوفان کا رنگ دیکھ کے پہلے ہی نکل بھاگے تھے۔ طوفان کے گزر جانے کے بعد سب واپس آ گئے تھے۔ اپنے اپنے گھروں کی تباہ حالت دیکھ کے کوئی رو رہا تھا، کوئی سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔ عورتیں خاص طور پر واویلا کر رہی تھیں۔ نہ محض گھر تباہ ہوئے تھے، بلکہ غلہ بھی اُڑ گیا تھا۔ جو بچ رہا تھا وہ بھیگ کے خراب ہو گیا تھا اور وہ نوٹ جو لوگوں نے چھپروں کے خفیہ کونوں میں کھونس رکھے تھے وہ سب بھی اڑ گئے تھے۔ وہ جنھوں نے کچھ زیادہ کھویا نہ تھا، اس لیے کہ اُن کے پاس کچھ کھونے کو تھا ہی نہیں۔ وہ اس فکر میں گھوم رہے تھے

کہ دوسروں کی اُڑی ہوئی دولت اگر ہاتھ لگ جائے تو وہ دفعتاً امیر ہو جائیں۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ دیکھ رہا تھا، ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی اپنی چیز کوئی دوسروں کی، کچھ لوگ اپنے سے زیادہ مصیبت زدوں کی امداد کے لیے بھی آئے تھے۔ مجید صاحب کو موجود پا کر سب دنگ رہ گئے، کیوں نہ ہو آخر ''موزید شاب'' ہی ٹھہرے۔ یہ کسے خبر تھی کہ صاحب خود طوفان میں گھر گئے تھے اور مرتے مرتے بچے تھے۔ وہاں کی موجودگی طوفان کی ممنونِ کرم تھی نہ کہ ان کے ارادے کی۔ ''موزید شاب'' نے خلاصیوں کو پاس کے دیہاتوں میں بھیجا۔ تھوڑی بہت تباہی تو ان دیہاتیوں میں بھی آئی تھی، مگر ''موزید شاب'' کا نام سنتے ہی سب خوشی کے مارے دوڑتے ہوئے آئے، ''واہ رے موزید شاب۔'' فوراً مردوں کی تجہیز و تکفین اور تباہ حالوں کی امداد کا بندوبست کیا گیا۔ زخمیوں کو تلاش کر کر کے کشتیوں میں قریب کے شفا خانے میں مرہم پٹی وغیرہ کے لیے بھیجا جانے لگا۔ زخمیوں کی تلاش میں سارنگ خلاصی اور گاؤں کے کچھ لوگ بھی نکلے۔ گاؤں سے کچھ دور ایک کنارے پر کچھ لوگ پڑے نظر آئے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک لڑکے کو لپٹائے پڑا تھا۔ لڑکے کو ہوش آ گیا تھا، مگر اس میں ابھی اٹھنے کی سکت نہ تھی۔ سارنگ نے دیکھ کے پہچانا کہ یہ تو وہی پھول محمد ہے۔ پھول محمد، سارنگ کو دیکھ کر سہم گیا۔ انھوں نے ''بچہ'' کہہ کے اسے تشفی دی اور اسے پانی پلایا۔ پھول محمد اٹھ بیٹھا اور ہائے چاچا کہہ کے اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی سے لپٹ گیا۔ ''چاچا اٹھو، چاچا اٹھو، اب نہ اٹھو گے کیا۔'' مگر چاچا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھول محمد رونے لگا۔ سارنگ نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی، مگر پھول محمد تھا کہ روئے چلا جا رہا تھا اور اس طرح پھوٹ پھوٹ کر کہ سارنگ کی بھی آنکھیں نم ہو گئیں۔ جمعدار صاحب کو ہلایا ڈلایا۔ ان کے منہ میں جھاگ جما ہوا تھا۔ اُسے پونچھا، منہ دھلایا پھر خوب اٹھایا بٹھایا۔ تھوڑی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھول محمد کے لیے صدیاں گزر گئیں۔ بالآخر جمعدار صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ پھول محمد چیخا، ''ارے چاچا'' اور بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔ جمعدار صاحب بڑی دیر تک پڑے رہے۔ رفتہ رفتہ ان میں سکت آئی اور وہ ''شکر الحمدللہ'' کہہ کے بیٹھ گئے۔ جمعدار صاحب کا جسم چور چور ہو رہا تھا۔ ہلنے ڈلنے کو جی نہ چاہتا تھا، مگر جب سنا کہ 'موزید شاب' خود موجود ہیں تو فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، سیدھے

صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں کام میں لگا دیکھ کر خود بھی لگ گئے۔ آہستہ آہستہ ڈانٹ پھٹکار بھی شروع کر دی۔ مجید صاحب انتظامات میں منہمک تھے، مصیبت زدوں کے کھانے پینے اور گھر کی مرمت وغیرہ کے لیے ایک ریلیف کمیٹی قائم کی اور گورنمنٹ سے ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا۔ جمعدار صاحب کا گھر اگرچہ یہاں سے کوسوں دور تھا، مگر ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ خود بھی اس کمیٹی کے ممبر بن جائیں اور کچھ دن یہیں رہ کے کام کریں۔ تھوڑا ہچکچانے کے بعد انھوں نے ممبری کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ مجید صاحب نے تعجب ظاہر کیا۔ جمعدار صاحب نے کہا کہ اب وہ اسی گاؤں میں کچھ دن رہ کے کام کرنا چاہتے ہیں۔ مجید صاحب نے ان کے اس قومی جذبے کو سراہا، مگر یہ خیال دلایا کہ کہیں ان کے گاؤں میں بھی تباہی نہ آئی ہو۔ گاؤں کی تباہی کے خیال سے ان کے دل میں متضاد جذبات پیدا ہوئے۔ ایسا گاؤں جہاں کے لوگ اس قسم کے جعل ساز اور کم ظرف ہوں پیر میاں.... نگن بابو.... سرت.... کہ ان پر جھوٹا الزام لگائیں یا اس کا یقین کریں برباد ہی ہو جائے تو اچھا ہے، لیکن آخر اسی گاؤں کی فضا میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی۔ اس کے آدمیوں سے نہ سہی تو اس کے ٹیلوں سے اس کے درختوں سے، اس کے کھیتوں سے، اس کے چپے چپے سے انھیں اُنس تھا۔ ان سب کی تباہی کیسے دیکھی جائے گی اور پھر ان کا اپنا گھر— چھانو، بی بی جان، موتی۔ ان کا جی چاہا اُڑ کے پہنچ جائیں۔ ''جیسا حضور کا حکم'' کہہ کے وہاں سے چلے آئے۔ پھول محمد ساتھ تھا۔ روانہ ہونے کو تو ہو گئے، مگر کشتی؟ اس کا خیال ہی نہ آیا تھا، اور وہ چاند شیخ اور جلو دھر؟ غالباً دونوں ڈوب گئے۔ جمعدار صاحب کو بڑا قلق ہوا۔ ان کے پاس جو کچھ روپیا تھا۔ وہ بھی بہہ گیا تھا۔ مجبوراً پیدل چل پڑے۔ جسم کی تکان کا تو یہ عالم تھا کہ ہر ہر قدم پر ڈھیر ہو جانے کو ان کا جی چاہتا تھا، مگر جلد گھر پہنچنے کا جذبہ ایسا تھا کہ انھیں کھینچے لیے جا رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب گھر پہنچے، چھانو کو سوتا ہوا پایا۔ سوتے ہی میں اُسے پیار کیا۔ بی بی جان جاگ رہی تھیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ گاؤں میں زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ صرف چند ڈالیس ٹوٹ گئی تھیں اور چھپر اڑ گئے تھے۔ گھوڑا مار اطوفان کی زد میں نہ آیا تھا۔

۱۰

جمعدار صاحب صبح کو دیر سے اٹھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ گاؤں کی حالت گھوم کے دیکھیں، مگر آج وہ معمول سے زیادہ نماز وظیفے میں مشغول رہے۔ پھر گاؤں کی گشت کو نکلے، تاڑ کے تنے والی کشتی کو کھیتے ہوئے، کوئی خاص نقصان نظر نہ آیا۔ سرت ساہا کی دکان بے ضرر کھڑی تھی، خریداروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہر شخص چاول خریدنا چاہا تھا اور سرت ساہا بڑی خوشامد کے بعد پانچ سیر کے خریدار کو ایک سیر دے رہا تھا۔ نگن بابو کی کچھری کو بھی نقصان نہ پہنچا تھا۔ پنیر میاں کا مکان بھی جوں کا توں تھا۔ جمعدار صاحب کو بڑی کوفت ہوئی۔ دل ہی دل میں خدا سے شکوہ وشکایت کا دفتر کھول دیا۔ اسی عالم میں گھوڑا مارا کی دنیا کا چکر کاٹتے ہوئے جمعدار صاحب اپنے ٹیلے کی دوسری جانب پہنچ گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ٹیلے کے نیچے ایک ہرا بھرا کھیت تیر رہا ہے۔ بہت بڑے بڑے کبھنڈے اور کھیرے لدے ہوئے ہیں۔ اس نعمت غیر مترقبہ کو دیکھ کے جمعدار صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ سب شکوہ شکایت بھول گئے۔ وہ تو کہیے تاڑ کے تنے میں اتنی جگہ ہی نہ تھی ورنہ جمعدار صاحب شاید شکرانے کی نماز بھی وہیں پڑھنے لگتے۔ شکر کی بات بھی تھی۔ بغیر کسی کوشش اور محنت کے انھیں ایسا اچھا کھیت مل گیا تھا۔ کھیروں کو تو بس کھانے کی دیر تھی۔ کبھنڈے بھی پکانے کے لائق تھے، اور یہ کھیت ملا بھی کس طرح تھا، وہی طوفان جس نے ہزاروں کھیت تباہ کر دیے تھے، سینکڑوں گھر ڈھا دیے تھے۔ وہی اس کھیت کو جمعدار صاحب کے قدموں میں ڈال گیا تھا۔ اس سے بڑھ کے اور خدا کی کیا مہربانی ہو سکتی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے کھیت کو باندھ کر رکھنے کا انتظام کیا کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ پھول محمد اور قمیص کی مدد سے اس کے چاروں طرف ایک ایک مضبوط بانس پانی میں گاڑ دیا۔ اور رسّی سے کھیت کو ان بانسوں سے باندھ دیا۔ پھر کھیت میں اتر کر کھیرے اور کبھنڈے توڑنے لگے۔ فیاضی میں پھول محمد اور قمیص کو بھی بخشتے جاتے تھے۔ اتنے میں ایک شخص چھوٹی سی کشتی چلاتا ہوا آیا اور کھیت کو دیکھتے ہی اس نے داد فریاد شروع کر دی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ کھیت اس کا ہے، بڑی محنت سے اس نے پوال اور پٹ سن کے

ڈنٹھلوں کا انبار لگا لگا کے سڑایا تھا اور اس پر کوڑا کرکٹ، خاک دھول، کوئلہ راکھ وغیرہ ڈالتا رہا تھا۔ اس طرح کھیت کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تیار ہو گیا تھا۔ وہ کھیت کے اس جزیرے کو کھے کے کئی بازاروں میں بھی لے گیا تھا۔ تازہ تازہ پھل ترکاری بیچنے کے لیے وہ رات کو اپنے مکان کے پاس باندھ کے رکھ دیتا تھا، مگر طوفان اتنے زور کا آیا کہ کھیت کو یہاں بہا لایا۔ جمعدار صاحب نے پہلے تو تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا، لیکن جب دیکھا کہ یہ شخص کسی طرح ٹلتا ہی نہیں تو بگڑنے لگے۔ اس طرح کے کھیت تو بہتوں کے ہیں۔ کیسے معلوم کہ وہ کھیت خود جمعدار صاحب کا نہیں ہے۔ کیا پہچان ہے کہ یہ اس کا ہے، جب اس نے گواہ پیش کرنے پر آمادگی ظاہر کی اور اپنا نام ٹھکانا ہری منڈل ساکن لوہا گاڑا بتایا تو جمعدار صاحب نے پینترا بدلا اور کھلم کھلا کہا کہ اگر بالفرض وہ کھیت اس کا بھی ہو تو وہ خود تو چرا کے لائے نہیں خدا نے بھیج دیا۔ کوئی دوسرا طوفان آئے اور اس کھیت کو خوشی سے بہا لے جائے۔ اس وقت اگر جمعدار صاحب کچھ عذر کریں تو جو چور کی سزا وہ ان کی۔ اس دلیل کے آگے بے چارے ہری منڈل کی کیا پیش جاتی، اُس نے اپنی غریبی کا واسطہ دیا۔ جمعدار صاحب کی رائے میں وہ خود اس سے زیادہ حاجت مند تھے۔ اگر نہ ہوتے تو خدا اس سے چھین کے ان کے پاس کھیت کیوں بھیج دیتا۔ بالآخر ہری منڈل نے پنچایت میں فیصلہ کرانے کی دھمکی دی۔ جمعدار صاحب پر اس دھمکی کا کچھ اثر نہ ہوا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پنچایت کے دن گئے۔ اب یونین بورڈ کا زمانہ ہے اور وہ خود اس کے ممبر ہیں۔ ہری منڈل ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ الغرض انھوں نے اسے چلتا کیا اور خود کہنڈے اور کھیروں سے ٹوکرے بھرے گھر پہنچے۔ دیکھا چاند شیخ کی بیوی ہاجرہ بیٹھی ہے، جمعدار صاحب کو دیکھ کے اس نے گھونگھٹ کاڑھ لیا اور پیٹھ ان کی طرف کر لی۔ بی بی جان نے بتایا کہ چاند شیخ کا حال پوچھ رہی ہے۔ جمعدار صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دیں۔ اپنے کو مجرم سمجھ رہے تھے۔ اگر وہ چاند شیخ کو نہ لے گئے ہوتے تو وہ کیوں ڈوبتا، مگر وہ اب کیا کریں۔ فوراً کہنڈے اور کھیروں کی ٹوکری اس کے سامنے رکھ دی، مگر اس نے جیسے دیکھا ہی نہیں۔ اپنے میاں کا حال جاننے پر اصرار کیا۔ جمعدار صاحب نے باتیں بنانی شروع کیں، وہ نہ مانی۔ جمعدار صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ اس کی پریشانی اور بڑھی۔ بالآخر

جمعدار صاحب نے کہا، ''صبر کرو۔ صبر، اللہ کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں۔'' وہ صبر کے نام پر چیخ اٹھی اور پچھاڑیں کھا کھا کر رونے لگی۔ جمعدار صاحب کی بیوی نے بھی ہمدردی میں رونا شروع کیا۔ جمعدار صاحب نے بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن سب بے سود۔ ہاجرہ بیان کر کر کے روئے جاتی تھی۔ جمعدار صاحب اس دل دوز آواز کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور باہر چلے گئے، لیکن زیادہ دیر تک باہر بھی نہ رہ سکے۔ پھر گھر میں آئے۔ ہاجرہ بدستور اپنے کو پیٹے جا رہی تھی۔ انھوں نے کہا، ''ہاجرہ بی بی اب زیادہ رونے سے کیا فائدہ؟ آج سے تم ہمارے یہاں کھانا کھایا کرو۔ جو کچھ ہم سے ہو سکے گا ہم تمھارے بچے کی مدد کریں گے۔'' ہاجرہ کا بچہ گیدو سال بھر کا تھا۔ ہاجرہ اپنے کو پیٹ رہی تھی اور وہ الگ پڑا بلک رہا تھا۔ جمعدار صاحب نے شفقت کے طور پر اسے گود میں لے لیا اور چپ کرانے کی کوشش کی، مگر یہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ بی بی جان کی گود میں دے کے کہا، ''اسے چپ کراؤ۔'' اور باہر چلے گئے۔ سخت نادم اور حیران تھے کہ کیا کریں۔ کس طرح ہاجرہ کی تشفی کرائیں۔ باہر بیٹھے تھے کہ گیدو کی ماں آتی نظر آئی۔ اس سے کہا، ''سنو گیدو کی ماں ذرا ہاجرہ کو چپ کراؤ۔ دیکھو ہمارا کیا قصور، ہم نے جان کے تو مارا نہیں۔ ہم تو خود مرتے مرتے بچے۔ تم ہاجرہ کو دلاسہ دو۔ ہم تمھیں انعام دیں گے۔''

گیدو کی ماں اندر گئی۔ ہاجرہ سے لپٹ کے روئی۔ اسے بہت سمجھایا، مگر ہاجرہ کی بے قراری نہ گئی۔ مجبوراً باہر آ کر اس نے کہا کہ ہاجرہ کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ دو ایک روز میں آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی، مگر جمعدار صاحب کو اس خیال سے تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ اتنے دنوں تک اپنے کو پیٹتے رہے گی۔ مولانا مستنصر باللہ سے جا کر کہا۔ انھوں نے کہا، ''اس کے پاس بیٹھ کے قرآن شریف کی تلاوت کیجیے۔ خدا کے کلام کی آواز کان میں جائے گی تو دل تھم جائے گا۔'' جمعدار صاحب قرآن شریف پڑھ تو لیتے تھے، مگر اٹک اٹک کے۔ کچھ اپنی کوتاہی کا احساس کچھ مولانا کی بزرگی کا۔ انھوں نے گھر میں پردہ کرا دیا اور مولانا کو اندر لے گئے۔ مولانا نے بڑی خوش الحانی سے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت شروع کی۔ ہاجرہ نے جب قرآن شریف کی آواز سنی اور مولانا کو پڑھتے دیکھا تو ادب کے طور پر سنبھل کے بیٹھ گئی۔ اس کا چیخنا بند ہو گیا، مگر آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ مولانا وقتاً فوقتاً اس پر پڑھ پڑھ

کے دم کرتے تھے۔ پھر پانی منگوایا۔ جمعدار صاحب خود دوڑ کر لائے۔ مولانا نے پھونک کر ہاجرہ کو پینے کے لیے دیا اور کہا کہ اس میں ہاتھ ڈبو کر منہ پونچھ لے، لیکن پانی زمین پر گرنے نہ پائے۔ ہاجرہ نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر مولانا نے قرآن شریف کی ہوا دی اور اس کے بعد کہا، ''فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھاؤ۔ چاند شیخ کی روح کے لیے آرام کے لیے۔ وہ تو شہید ہوا۔'' جمعدار صاحب نے فوراً ہاتھ اٹھایا۔ ہاجرہ بے چاری نے بھی اٹھایا۔ اندر کوٹھڑی میں جمعدار صاحب کی بیوی بیٹھی سن رہی تھیں۔ جب انھوں نے چاند شیخ کے فاتحہ کے بات سنی تو اس کے چھوٹے بچے نے بھی دونوں ہاتھ فاتحہ کے انداز میں اٹھا دیے۔ فاتحہ کے بعد ہاجرہ کا دل تھم گیا اور وہ چپ ہو کے بیٹھ گئی۔ جمعدار صاحب جلودھر کے گھر جا کے اس کے ڈوبنے کی بھی اطلاع کرائے۔ وہاں بھی کہرام مچ گیا۔

11

جلودھر نے چاند شیخ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ دونوں بہے جا رہے تھے، قریب قریب بے ہوش۔ راستے میں ایک درخت ملا۔ آندھی اُسے اڑا لائی تھی۔ درخت میں دونوں الجھ گئے۔ چاند شیخ بے چارہ نیچے کی ڈال میں پھنس گیا اور وہیں ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ جب طوفان تھما، بھاٹا آیا اور جلودھر کے ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے اپنے آپ کو پانی کی سطح سے کئی فٹ اونچی ایک ڈال میں لٹکا ہوا پایا۔ چاند شیخ کی لنگی نیچے کی ڈال میں پھنسی ہوئی نظر آئی۔ یہی اس کی یادگار تھی۔ جلودھر درخت پر بیٹھ گیا۔ جب ایک کشتی ادھر سے گزری تو اس میں سوار ہو گیا۔ چاند کی لنگی اس نے لے لی۔ کشتی طوفان زدہ گاؤں کی طرف جا رہی تھی۔ جلودھر بھی وہیں گیا۔ وہاں کی تباہی دیکھ کر اس نے وہیں کچھ دن کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ قریب قریب ہر کمیٹی کا ممبر بن گیا۔ بہت سے ممبر محض نمائشی تھے۔ جلودھر کچھ تو رفاہِ عام کے خیال سے اور کچھ اپنی پارٹی کے اصول کے مطابق ممبر ہوا تھا۔ اُس لیے بڑی تن دہی سے کام کر رہا تھا۔ سب ممبروں سے زیادہ، مصیبت زدوں نے جب اسے جانفشانی اور خلوص سے کام کرتے دیکھا تو ان کے دل میں اس کی وقعت پیدا ہوئی۔ اس کی ہر بات کو غور سے سننے لگے۔ اس نے اپنے

کام کے ساتھ ساتھ انتظامات پر نکتہ چینی بھی شروع کردی۔ ''یہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے۔ غریب جیسے آدمی ہی نہیں۔ امیر ہی سب کچھ ہیں۔ اصل دولت کون پیدا کرتا ہے؟ غریب ہی تو، اگر غریب محنت نہ کریں تو چاول اور پٹ سن کہاں سے پیدا ہو، امیر کہاں سے روپیا پائیں۔ امیر گھر میں بیٹھے آرام کر رہے ہیں۔ غریبوں کا خون چوس رہے ہیں۔ غریب مر رہے ہیں۔ اس کا بس چلے تو سب امیروں کو توپ دم کر کے غریبوں کی حکومت قائم کردے۔ اصل طاقت تو غریبوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوں تو کوئی انھیں دبا نہیں سکتا۔ اگر وہ امیروں کے ظلم کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے کہنے پر عمل کریں، ان کی حالت جلد بدل جائے گی۔'' مجید صاحب بھی انتظامات کی خاطر وہیں مقیم ہو گئے تھے۔ جلودھر مصیبت زدوں کی ہر تکلیف کو ان سے بیان کرتا اور اس کے دور کرانے کی کوشش کرتا۔ اب جلودھر بابو ہی جلودھر بابو تھے۔ جلودھر بابو نے مطالبہ کیا کہ ہر مصیبت زدہ کو دو دو سو روپے فوراً بطور مدد کے دیے جائیں۔ مصیبت زدوں کا ایک جلوس نکال دیا جو ''ہمارا مطالبہ ماننا ہوگا ہمارا مطالبہ ماننا ہوگا'' چیختا ہوا سارے گاؤں میں گھوما۔ بہت سے تماشائی بھی ساتھ ہو گئے۔ ایسا جلوس گاؤں میں پہلے کبھی نہ نکلا تھا اور پھر ''موزید شاب'' کی موجودگی میں اس کا نکلنا عجیب بات تھی۔ گاؤں والے یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ طوفان اور سیلاب تو پہلے بھی آ چکے تھے، مگر مصیبت زدوں کی امداد اتنی جلد اور ایسی اچھی طرح کبھی نہ ہوئی تھی، نہ محض طوفان زدہ لوگوں کی غلہ اور نقد روپے سے مدد کی گئی تھی، بلکہ متعدد ٹیوب ویل بھی لگائے گئے تھے اور اس علاقے کی جملہ آبادی کو ہیضے اور ٹائیفائڈ سے بچانے کے ٹیکے بھی دیے گئے تھے جہاں جہاں غلہ اور روپیا تقسیم کیا جاتا تھا وہاں وہاں ٹیکا لگانے والے بھی بھی کھڑے رہتے تھے۔ پہلے لوگ ٹیکا لگواتے پھر گلہ اور روپیا پاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے میں کوئی وبا نہیں پھیلی جیسا کہ اس سے پہلے طوفانوں کے بعد پھیلا کرتی تھی۔ اس لیے لوگوں کے دلوں میں شکوہ کے بجائے شکریہ کے جذبات تھے، لیکن پھر بھی جلوس کے ساتھ ہو لیے۔ شاید اس نئے طریقے سے کچھ زیادہ ہی مل جائے۔ جب جلوس اس جھونپڑی کے پاس پہنچا جو مجید صاحب نے اپنے عارضی قیام کے لیے ڈلوائی تھی تو رک گیا اور خاموش ہو گیا۔ جلودھر نے آہستہ سے کہا، ''چیختے کیوں نہیں۔''

''نہیں بے ادبی کی بات ہے۔'' جلودھر نے بتایا کہ ادب قاعدہ پرانی چیزیں ہیں جو بڑوں نے چھوٹوں کو دبائے رکھنے کے لیے نکالی ہیں۔ اب انھیں بھول جانا چاہیے۔ لوگ تعجب سے دیکھنے لگے۔ بڑوں کو برا لگا، چھوٹوں میں سے کچھ کے دلوں نے ضرور یہ کہا کہ اگر ایسا ہوتا تو کیا ٹھاٹھ ہوتے۔ جہاں چاہا گھوم رہے ہیں، جو چاہا کر رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں کہ روک ٹوک سکے۔ جلودھر نے لوگوں کا پس و پیش دیکھ کر ''ہمارا مطالبہ ماننا ہوگا''، ''ہمارا مطالبہ ماننا ہوگا'' کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ کچھ لونڈے بھی اس کے ہم زبان ہو گئے۔ مجید صاحب باہر نکل آئے پوچھا کہ کیا مطالبہ ہے۔ جب پتا چلا تو انھوں نے بتایا کہ وہ کس قدر ناممکن ہے اور مجمعے سے گھر جانے کو کہا۔ جلودھر پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہ مطالبہ پورا نہ ہو سکے گا، اور جب نہ ہوا تو اس نے لوگوں سے کہا، ''دیکھا لاکھوں روپیا دوسرے کاموں میں خرچ ہوتا ہے اور یہاں اتنی مصیبت پڑی ہے، مگر دو روپیا بھی نہیں دیا جا سکتا۔'' مجید صاحب جلودھر کا مطلب سمجھ گئے۔ انھیں اس خیال سے افسوس ہوا کہ سارے گاؤں میں سب سے زیادہ محنت سے کام کرنے والا جلودھر ہی ہے، اور اگر وہ چلا گیا تو کام کو نقصان پہنچے گا، مگر وہ غریبوں کی مصیبت سے اپنی پارٹی کے لیے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا اور لوگوں میں بددلی زبردستی پھیلا رہا تھا۔ اس لیے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اسے وہاں سے روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جلودھر کو ایک کشتی میں بیٹھا کر چلتا کیا گیا۔ اس نے پہلے مخالفت کی کوشش کی، مگر جانتا تھا کہ ابھی اس کا اثر اتنا نہیں کہ لوگ ''موزید شاب'' کے خلاف اس کا ساتھ دیں۔ جلودھر کو از سرِ نو یہ محسوس ہوا کہ جب تک ''موزید شاب'' کا یہاں سے تبادلہ نہ کرایا جائے گا تب تک دال نہ گلے گی، مگر وہ جھوٹے مقدمے کا قصہ ختم ہو لے تب۔

۱۲

جلودھر جب دس بارہ دن کے بعد گھوڑا مارا واپس آیا تو گاؤں میں شور مچ گیا۔ ہر شخص ملنے اور حال دریافت کرنے آ رہا تھا۔ جمعدار صاحب نے جب سنا تو خوش ہونے سے زیادہ شرمندہ

ہوئے۔ انھوں نے ناحق محض قیاس کی بنا پر اس کے مرنے کی خبر اڑا دی تھی۔ اب لوگ کیا کہیں گے، اور اگر جلودھر واپس آ سکتا ہے تو چاند شیخ کیوں نہیں آ سکتا، وہ بھی ضرور زندہ ہوگا۔ فوراً چاند شیخ کے گھر گئے اور ہاجرہ کو پکار کر کہنے لگے، ''ہاجرہ بی بی! ہاجرہ بی بی! کچھ سنا، چاند شیخ زندہ ہے، مبارک۔'' ہاجرہ دوڑی ہوئی آئی۔ اسے مارے خوشی کے یقین نہ آتا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ جلودھر جو چاند شیخ کے ساتھ تھا، زندہ واپس آ گیا ہے۔ اب چاند شیخ بھی واپس آتا ہوگا۔ ہاجرہ نے مارے خوشی کے اپنے بچے کو اٹھا کر پیار کر لیا اور فوراً اس کے منہ میں زبردستی اپنا دودھ دے دیا۔ اس وقت اس کے دودھ پلانے کے انداز میں ایک عجیب بانکپن تھا۔

جمعدار صاحب جلودھر سے ملنے گئے۔ مبارک باد دی اور حال پوچھا۔ اُس نے بتایا اور چاند شیخ کی لنگی دے کے یہ خیال ظاہر کیا کہ غالباً وہ ڈوب چکا ہے، مگر جمعدار صاحب نے باور نہ کیا۔ ان کے خیال میں لنگی کا ملنا اس بات کی دلیل تھی کہ اب چاند شیخ بھی مل جائے گا۔ اس کی لنگی درخت میں اٹک گئی ہوگی اور وہ بچ گیا ہوگا۔ انھوں نے لنگی لا کر ہاجرہ کو دی اور کہا، ''لو، یہ چاند شیخ کی لنگی، ابھی یہ ملی ہے۔ بعد میں وہ بھی مل جائے گا۔'' لنگی دیکھ کے ہاجرہ کا دل دھڑدھڑ کرنے لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے لنگی اپنے سینے سے لگا لی۔ یہ لنگی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ اسی کو اوڑھتی، اسی پر لیٹتی۔ چاند شیخ کی سلامتی کی دل ہی دل میں دعائیں مانگتی۔ جاگتے میں اسی کا خیال کرتی۔ سوتے میں اسی کا خواب دیکھتی۔ سوتے میں اس کا چہرہ کبھی مسکرانے لگتا اور کبھی وہ چیخ کر اٹھ بیٹھتی۔

۱۳

جمعدار صاحب اپنے گھر کے تالاب میں کچھ مچھلیاں پکڑنے کی فکر کر رہے تھے۔ اب مچھلیاں بہت کم رہ گئی تھیں۔ وہ برابر پکڑ پکڑ کے کھاتے اور بیچتے رہے تھے۔ کٹیا لگائے گھنٹوں بیٹھے رہتے، مگر مشکل سے کوئی مچھلی پھنستی۔ آج بھی یہی حال تھا۔ وہ کھسیار ہے تھے۔ گھر میں کھانے کی بڑی دقت تھی۔ چاول ختم ہو رہا تھا۔ بی بی جان کا اصرار تھا کہ جس طرح سے بھی ہو آج مچھلی ضرور پکڑی جائے۔

بی بی جان نے پکار کے پوچھا، ''کچھ پھنسیں؟''

جمعدار صاحب نے غصے اور کھسیاہٹ میں چیخ کر جواب دیا، ''نہیں۔'' پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولے، ''کیا بتایا جائے حرام زادیاں بڑی ہوشیار ہو گئیں ہیں۔ ہم کب سے بیٹھے مکھی مار رہے ہیں۔''

بی بی جان نے تالاب کے کنارے آ کر کہا، ''اب شاید نہیں رہ گئیں۔''

''نہیں ہم نے ابھی دیکھا تھا ایک غڑاپ سے اچھلی تھی۔''

''اب بہت دیر ہو گئی۔''

''نہیں ہم جال لگائیں گے۔''

''جال تو پھٹ گیا، سوت بھی مرمت کے لیے نہیں ملتا۔''

''ہاں اس سسری لڑائی کے مارے ناک میں دم ہے، اچھا جاتے ہیں۔ مچھیروں کے پاس ایک آدھ ہوگا، لے آئیں گے۔'' باہر گئے تو دیکھا کہ ایک دو مچھیرے نہیں، بلکہ سینکڑوں ایک کے پیچھے ایک کشتیوں میں چلے آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی کشتیاں بھی پرے باندھے آ رہی ہیں۔ جمعدار صاحب نے قریب جا کے حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ سب کشتیاں سرکار خرید رہی ہے۔ دام روپیا کا چار آنہ مل رہا ہے۔ اس لیے یار لوگ اپنی اپنی کشتیاں لے لے کے بھاگ رہے ہیں۔ لیکن بہت سے پکڑے بھی گئے اور ہزاروں کشتیاں سرکار نے لے لی ہیں۔ جمعدار صاحب کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ آخر سرکار کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں کشتیاں خرید رہی ہے۔ خرید کے کیا کرے گی۔ مچھلی کے جال کا قصہ بھول گئے، اسی الجھن میں پھنس گئے۔ جلودھر کی رائے لینے تو کیا، مگر ہاں تبادلۂ خیالات کے لیے اس کی طرف گئے۔ راستے میں ملاقات ہو گئی۔ دور ہی سے جمعدار صاحب بولے، ''ارے جلودھر بابو کچھ سنا سرکار تمام کشتی پکڑ رہی ہے۔''

''ہاں۔''

''تم تو بہت پتا چلاتے ہو کچھ اس کا بھی پتا چلایا۔''

''بات یہ ہے کہ سرکار ابھی ہار رہی ہے۔ جاپانی بڑھ رہے ہیں برما میں۔ وہاں کی تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ سرکار کو یہ ڈر ہے کہ کہیں یہاں بھی ایسا ہی نہ ہو۔ اس لیے کشتیوں کو خرید کے پہلے ہی سے اپنے قبضے میں کر رہی ہے۔''

''تو بھیا پھر کاروبار کیسے چلے گا۔ مچھلی کیسے پکڑیں گے۔ دھان چاول کیسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے گا۔ ویسے ہی دھان چاول کی کمی ہے۔ پھر تو مر جائیں گے۔

''ہاں یہ تو ہے۔''

جمعدار صاحب سوچ میں پڑ گئے اور فوراً بیرنگ واپس ہوئے۔ بی بی جان نے پوچھا، ''جال ملا؟'' جمعدار صاحب نے کہا، ''ارے ہم تو دوسرے جال میں پھنس گئے۔ بی بی جان، ''یہ تو بڑی مشکل کی بات ہوگئی۔'' اور انھوں نے جو کچھ جلو دھر سے سنا تھا وہ بتایا، کہنے لگے، ''ہم اپنی کشتی چھپا دیں۔ نہیں تو حرام زادے بھی لے جائیں تو مشکل ہو۔'' تیزی سے گئے اور اپنی تاڑ والی کشتی کچری پانا کے نیچے چھپانے لگے۔ اتنے میں چھانو بڑی زور سے چیخا۔ جمعدار صاحب چونک پڑے۔ جلدی سے اوپر گئے۔ دیکھا کہ اس کی گھگی بندھی ہوئی ہے اور ہاتھیوں کی ایک قطار پاس سے گزر رہی ہے۔ جمعدار صاحب نے چھانو کو لپٹا لیا اور ہاتھیوں کی طرف دیکھ کے کہا، ''بیٹا کچھ نہیں، جانور ہیں۔''، فیل بانوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے، انھوں نے بھی وہی بتایا کہ سرکار کے حکم سے ہاتھی ہٹائے جا رہے ہیں کہ کہیں جاپانیوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ایک ہاتھی نے سونڈ بڑھا کے ایک کیلے کا درخت اکھاڑ لیا۔ جمعدار صاحب ''ارے'' کہہ کے رہ گئے۔ فیل بان نے دل ہی کے طور پر کہا، ''آیئے، آپ کو اور ان چھوٹے میاں کو تھوڑا سا گھما لاؤں۔'' جمعدار صاحب کبھی ہاتھی پر نہ چڑھے تھے، مگر ظاہر بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ چھانو سے پوچھا، ''بیٹا چڑھوگے؟'' وہ ان سے اور کچکچا کر لپٹ گیا۔ اتنے میں پھول محمد پہنچ گیا۔

ایک منٹ تو جھجکا، پھر کہنے لگا، ''چاچا ہم چڑھیں؟''

جمعدار صاحب نے کہا، ''نہیں جانے دو۔ اتنا بڑا جانور ہے کہیں دبا بادے تو مشکل ہو۔''

فیل بان نے اطمینان دلایا تو جمعدار صاحب کی ہمت بندھی اور وہ خود بھی چھانو کو لپٹائے پھول محمد کے ساتھ ہاتھی پر چڑھ گئے اور تمام گاؤں کا چکر لگا آئے۔ خاص طور سے پنیر میاں کے گھر کا، ہر راہ چلتے کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے۔ کبھی خود سلام کرتے کبھی سلام کا جواب دیتے۔ جیسے یہ ہاتھی جمعدار صاحب کا ذاتی ہو، پنیر میاں کو بہت برا لگا۔ انھوں نے نگن بابو سے کہا، ''دیکھا اس ذلیل الدی کی شیخی؟ ہم لوگوں کے سامنے ہاتھی پر چڑھ کے گھومتا ہے جیسے اس کے باپ کا ہے۔''

نگن بابو کی رائے تھی کہ یہ بھی کلجگ کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے، کہ نیچ لوگ اپنے کو اونچے لوگوں سے اونچا سمجھنے لگے ہیں۔

پنیر میاں نے کہا، ''ابھی مقدمے کا فیصلہ ہونے دو۔ جب بیٹا کو سات برس کا جیل ہوگا تب پتا چلے گا۔ کچھ دن اور شیخی بگھار لے۔''

۱۴

آج جمعدار کے گھر میں دن عید تھا اور رات شب برات۔ مقدمہ نہ محض خارج ہوا تھا، بلکہ نگن بابو پر الٹا قائم ہو گیا تھا۔

جمعدار صاحب کا گھر نیلی پیلی جھنڈیوں سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ پھول محمد انتظامات میں پیش پیش تھا۔ جمعدار صاحب مسکرا مسکرا کر مبارک باد قبول کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاؤں کا ایک آدھ چکر بھی لگا آتے، مگر ان کی بے چینی نہ مٹتی تھی، حتیٰ کہ میلاد شریف سے بھی نہ مٹی، حالانکہ انھوں نے بڑے خشوع وخضوع سے ''یا نبی سلام علیک'' پڑھا۔ اتنے خشوع وخضوع کے ساتھ کہ آنکھ سے آنسوؤں کا چشمہ جاری ہو گیا۔ میلاد کے بعد وہ اپنے والد کی قبر پر گئے اور اس پر اتنے پھول چڑھائے اتنے پھول چڑھائے کہ پھولوں کا تختہ بن گئی۔ پھر دیر تک کھڑے فاتحہ پڑھے رہے۔ اس میلاد کے اہتمام میں جمعدار صاحب کا بڑا روپیا خرچ ہو گیا۔ یوں قرض نہ ملتا تھا، اس لیے انھیں کچھ زمین رہن رکھنی پڑی تھی۔ ان کی خوشی تو بڑھی، لیکن ساتھ ساتھ پریشانی بھی۔ سوچتے تھے کہ پٹ

سن کے دام بڑھیں گے تو قرض ادا کر دیں گے۔

نگن بابو سخت مشکل میں پھنس گئے، کیوں انھوں نے پنیر میاں کا کہنا مانا، اپنی عقل اور ایمان دھرم سے کام کیوں نہ لیا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ اپنا منہ نوچ لیں یا پنیر میاں کا، پھر بھی انھوں نے پنیر میاں سے بگاڑ مناسب نہ سمجھا۔ آخر مقدمے کی پیروی بھی تو انھیں سے کروانی تھی۔ سرت نگن اور پنیر میاں میں مشورے ہوئے۔ پنیر میاں نے کہا، ''ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ 'موزید شاب' ذلیل الدی کا آدمی ہے، جب تک یہ رہے گا ہم لوگوں پر یوں ہی ظلم ہوتا رہے گا۔ مقدمے کی بات بعد میں ہوگی۔ پہلے اسے نکلوانا چاہیے۔'' نگن بابو نے کہا، ''کتنی درخواستیں دے چکے ہیں، مگر کچھ اثر نہ ہوا۔''

''ہوگا کیسے نہیں، یہ چیز ہم پر چھوڑ دو اور میں جیسا کہوں ویسا کرو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

۱۵

صوبائی اسمبلی میں اُس حلقۂ انتخاب کی ایک نشست خالی ہوئی جس میں گھوڑا مارا واقع تھا۔ ضمنی انتخاب کا اعلان کیا گیا۔ بہت سے مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ امید کی دیوی کی آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کی نگاہِ غلط انداز ہر طرف پڑ رہی تھی۔ ہر ایک یہی محسوس کر رہا تھا کہ مجھی پر پڑ رہی ہے اور شہید ہوا جا رہا تھا۔ پنیر میاں قدرتاً ایسے شہیدوں کی صفِ اوّل میں تھے۔ جمعدار صاحب یونین بورڈ کے انتخاب میں انھیں شکست دے ہی چکے تھے۔ ان کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ بھی انتخاب کے میدانِ کارزار میں مردِ میدان بنے ہوئے اتر آئے۔ یونین بورڈ کے انتخاب میں تو مسلم لیگ نے بحیثیت جماعت کے کوئی حصہ نہ لیا تھا، مگر یہ معاملہ صوبائی اسمبلی کا تھا اور مسلم لیگ کی اس میں شرکت لازمی تھی۔ جمعدار صاحب کوئی سیاسی آدمی تو تھے نہیں کہ وہ صوبہ اور یونین بورڈ کے انتخابات کے فرق کو سمجھتے۔ انھیں خبر ہی نہ تھی کہ مسلم لیگ بھی اس میں حصہ لے گی۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لیے بڑے بڑے امیدوار تھے۔ جمعدار صاحب نے البتہ درخواست نہ دی تھی۔ پنیر میاں کے حسنِ تدبیر کی وجہ سے قرعۂ فال انھیں کے نام نکلا اور وہ مسلم لیگ کے نمائندے قرار پائے۔

جمعدار صاحب اس نمائندگی کی اہمیت نہ سمجھے۔ دھڑلے کے ساتھ مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ مخلص اور جلودھر اگرچہ پنیر میاں کے ملازم تھے اور یونین بورڈ کے انتخابات میں جمعدار صاحب کی مخالفت میں کام کر چکے تھے، مگر اب مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کی خاطر اپنے آقا کے خلاف، جمعدار صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ انھیں ہر وقت پٹّا بھڑا دیتے۔ جمعدار صاحب یوں ہی بڑے طنطنے کے آدمی تھے۔ ان کی ہمت ویسے ہی آسمان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ جلودھر اور مخلص کی باتیں سن سن کر اب وہ آسمان ہی پر رہنے لگے تھے۔ زمین پر ان کا پاؤں ہی نہ پڑتا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جلودھر نے جمعدار صاحب کو یہ بھی بتا دیا کہ اسمبلی کی ممبری سے ماہوار تنخواہ بھی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت روپیا بھتا وغیرہ کا ملتا ہے۔ جمعدار صاحب ''سچ؟'' کہہ کے اک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر میں ''اور کیا؟ اور کیا؟'' کہتے جاتے اور جواب سن سن کے اُف اُف کرتے جاتے تھے۔ اس ''اور کیا؟ اور کیا؟'' نے مخلص اور جلودھر کے جوابات کا خزانہ خالی کر دیا۔ کہنے لگے، ''اور جو کچھ ہوگا وہ جب آپ ممبر ہو جائے گا تب خود ہی دیکھ لیجیے گا۔''

جمعدار صاحب، ''جب کیا، سمجھو ہو ہی گئے۔''

مخلص نے کہا، ''ہاں چاچا، ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔''

جمعدار صاحب، ''ہاں تو پھر اور کیا کیا ہو گا ذرا بتاؤ۔''

''اور کیا اگر قسمت زور کر گئی تو وزیر بھی بن سکتے ہیں آپ۔''

جمعدار صاحب اگرچہ سچ مچ عالم ممکنات میں تھے یعنی انھیں ہر ناممکن چیز اس وقت ممکن معلوم ہو رہی تھی، مگر پھر بھی وہ یہ سن کے چونک پڑے اور بولے، ''کیا کہا! وزیر؟ ناہیں۔''

''آپ 'ناہیں' کہہ رہے ہیں، وہاں پنیر میاں کہتے ہی پھرتے ہیں کہ وہ وزیر ہو جائیں گے۔''

''تب تو میں البت ہو جائیں گے، یونین بورڈ میں دیکھا نہیں، پنیر کو کیسا ہرایا۔''

''جی ہاں۔''

''اچھا تو وزیر ہو کے میں کیا کیا کریں گے؟''

''پھر کیا آپ ہی کا راج ہوگا۔ جو چاہیے گا کیجیے۔ بڑے بڑے صاحب لوگ آپ کو 'سارُ'[Sir] کہیں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ ایسی بات!''

مخلص، ''اور کیا آپ کے موزید شاب بھی آپ کو'سار' کہیں گے۔''

جمعدار صاحب، ''نہیں میں نہیں کہنے دیں گے۔ ہم سے یہ نہ ہوگا۔''

جلودھر، ''اچھا انھیں جانے دیجیے۔ دوسرے صاجب لوگ، سچ مچ کے صاحب، لوگ گورے چٹے انگریز بھی تو آپ کو سار کہیں گے۔ آپ کا حکم مانیں گے۔ ان پر تو حکم چلایئے گا۔''

جمعدار صاحب، ''ارے ایسا ویسا! بس دیکھنا، ارے میں تو جب لام پر گئے تھے تبھی کتنے گوروں کو ڈانٹ دیتے تھے۔ سب ڈر جاتے تھے۔ اچھا ٹھیرو ابھی میں آتے ہیں۔''

مخلص اور جلودھر سمجھ گئے کہ جمعدار صاحب گھر میں جانا چاہتے ہیں، بی بی جان کو سنانے۔ مسکرا کر چپ ہو رہے۔

جمعدار صاحب کے گھر میں پہنچنے سے پہلے ان کی آواز پہنچی، ''ارے سن رہی ہو؟''

بی بی جان باورچی خانے سے نکلیں، ''کیا ہے؟''

جمعدار صاحب، ''کچھ سنا تم نے؟''

''کہو گے تب سنوں گی کہ ایسے ہی؟''

''اب تک تم نے سنا ہی نہیں؟''

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

''خیریت کہہ رہی ہو؟ ارے ہم بہت بڑے آدمی ہونے والے ہیں۔''

''تم؟''

''ہم بھی تم بھی۔''

''کیوں کیا لام پر جانے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں اب میں لام سری پر جائیں گے؟''

''پھر؟''

''ارے میں وزیر ہو رہے ہیں۔''

''وزیر؟''

''ہاں ہاں وزیر۔''

بی بی جان کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ جمعدار صاحب کی طرف حیرت سے دیکھنے لگیں۔

جمعدار صاحب، ''تمھیں تعجب ہو رہا ہے۔ تعجب کی بات ہی — تھی، مگر اب نہیں ہے۔''

''کیسے؟''

''تم ممبری تو جانتی ہی ہو۔ ہم جو یونین بورڈ کے ممبر ہوئے، پنیر کو کیسا ہرایا؟ اب یونین بورڈ سے بھی ایک بڑی چیز نکل آئی ہے۔ اس کا نام ہمیں یاد نہیں رہا۔ میں اس کے بھی ممبر ہو رہے ہیں جو اس کا ممبر ہوتا ہے، وزیر ہو جاتا ہے۔ بہت تنخواہ ملتی ہے۔ ہر مہینے صاحب لوگ، کون صاحب؟ کالے صاحب نہیں، سچ مچ کے صاحب ہم کو 'سار' کہیں گے۔ ہمارا حکم مانیں گے اور میں بھی خوب حکم دیں گے۔ ان کی میم صاحب لوگ تم کو 'سار' کہیں گی۔ تمھارا حکم مانیں گی۔ بس تم دیکھتی جاؤ۔''

بی بی جان کو کچھ کچھ یقین آنے لگا۔ ان کے شوہر نامدار آخر ایک الیکشن تو جیت ہی چکے تھے۔ اپنے ذہن میں بات صاف کرنے کے لیے انھوں نے پوچھا، ''تم ہو گئے یا ہو گے؟''

''ہوا ہی سمجھو۔ پنیر میاں ہمارے مقابلے میں پھر کھڑے ہوئے ہیں، پھر ہاریں گے۔ ان شاء اللہ۔''

''ایک دفعہ ہار چکے تو اب کیا مقابلہ، انھیں شرم نہیں آتی؟''

''شرم ہمیں تمھیں آتی ہے، بے حیا کو تھوڑی؟''

جمعدار صاحب کا چہرہ اس وقت دیکھنے کے قابل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خون کے ہر قطرے میں خوشی کا چراغ جل رہا ہے۔ تمام چہرہ سرِ چراغاں بنا ہوا تھا۔ دل بانسوں اچھل رہا تھا۔

انھوں نے بی بی جان کا ہاتھ لے کر پہلے اپنے گالوں پر رکھا پھر دل پر۔ بی بی جان نے کہا، ''میرا ابھی دل دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ تمھارا چہرہ گرم آگ ہو رہا ہے۔ منہ دھو ڈالو۔''

''ہاں خوب یاد آیا۔ خوشی کے مارے خیال ہی اتر گیا۔ ابھی وضو کر کے شکرانے کی نماز پڑھتا ہوں۔ تم بھی پڑھ ڈالو۔'' دونوں میاں بیوی نے شکرانے کی نماز پڑھی۔

جمعدار صاحب جب باہر آئے تو دیکھا کہ جلو دھر اور مخلص جا چکے ہیں۔ ان کا جی کچھ اور باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ پھول محمد کے گھر کی طرف چلے۔ اتنے میں دیکھا۔ وہ خود ہی آ رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی دور سے بولے، ''ارے پھول محمد تم کہاں تھے یہاں اتنی اتنی بات ہو گئی۔''

''کیا چاچا؟''

''ارے کچھ نہ پوچھو۔ معلوم ہے میں وزیر ہو رہے ہیں۔''

''کیسے؟'' اب جمعدار صاحب نے پورا قصہ دہرایا۔

پھول محمد نے کہا، ''مگر چاچا.....''

جمعدار صاحب، ''یہ تمھاری اگر مگر بہت بری ہے، ہر بات میں اگر مگر، یہ بھی کوئی بات ہے۔''

پھول محمد، ''چاچا سنیے تو۔''

''ہم کچھ نہیں سنتے۔ اچھا کہو، مگر اگر مگر نہ کرنا۔''

''چاچا پنیر میاں کہتے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے ہیں۔''

''جھوٹا ہے، مسلم لیگ سے کیا مطلب، یونین بورڈ میں کہیں مسلم لیگ بولا تھا؟''

''ہاں مگر اس میں بول رہا ہے۔''

''میں نہیں مانتے، مسلم لیگ یہاں آ کے ہم سے خود کہے تو جانیں، اگر پنیر میاں کے بلانے سے مسلم لیگ آ ئی بھی، جیسے مجید صاحب آئے تھے تو جب ہمیں اور انھیں دیکھے گی تو انھیں ڈانٹے گی، اور ہماری پیٹھ ٹھونکے گی۔ جیسا کہ مجید صاحب کیا تھا۔''

''مگر چاچا سنا ہے کہ مسلم لیگ کوئی آدمی نہیں ہے۔''

''آدمی نہیں تو کیا جنات ہے۔ تم بھی لوگوں کی الٹی سیدھی باتوں میں آ جاتے ہو۔''

''جلودھر بابو بھی کہتے تھے۔''

''جلودھر بابو مذاق کرتے ہوں گے۔''

''نہیں چاچا سچ مچ کہہ رہے تھے۔''

''سچ مچ کیسے کہتے ہوں گے، ہم نے خود مسلم لیگ کی تصویر دیکھی ہے۔ ہمارے گھر میں بھی ہے۔ ابھی میں لاتے ہیں۔''

جلدی سے جا کے ایک تصویر لیے واپس آئے۔ ''یہ دیکھو مسلم لیگ ہم نہ کہتے تھے؟ کہہ دیا کہ ہماری بات مانا کرو اور کسی کی نہیں، مگر تم سمجھتے ہو کہ چاچا بیوقوف ہیں۔''

پھول محمد نے تصویر لے لی، قائداعظم کی تصویر تھی۔ تصویر کے نیچے ان کا نام اور نیچے صدر مسلم لیگ اردو میں لکھا تھا۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''دیکھو یہ پڑھو، ہاں، مگر تم تو ابھی اردو پڑھ نہیں سکتے، یہ لکھا ہے: مسلم لیگ، م پیش مُس ل م زیر لِم، ل ی گ زیر لیگ، مسلم لیگ۔''

''یہ تو جناح صاحب کی تصویر ہے۔''

''دونوں ایک ہی ہیں جیسے جمعدار صاحب بھی ہم اور جلیل الدین بھی ہم۔ ان کا نام جناح صاحب ہے، مگر لوگ مسلم لیگ کہتے ہیں، اب سمجھے؟''

پھول محمد کو بات معقول معلوم ہوئی۔ اس نے کہا، ''ہاں یہی بات ہوگی۔''

جمعدار صاحب نے ناخوش ہو کے کہا، ''ہوگی کیا، ہئی ہے۔ آئیں جلودھر بابو تو ہم ان سے پوچھتے ہیں نا۔''

کہنے کو تو جمعدار صاحب نے کہہ دیا کہ جلودھر بابو آئیں، مگر ان کا جی گھبراتا تھا کہ بات اتنی دیر تک ٹلی رہ جائے گی۔ کہنے لگے، ''چلو ابھی چلیں۔ تصویر ہاتھ میں لی اور پھول محمد کو لے کے جلودھر کے یہاں دم مدار پہنچ گئے۔ پہنچتے ہی بولے، ''جلودھر بابو آپ کیا پھول محمد کو غلط سلط باتیں بتاتے رہتے ہیں۔''

جلودھر کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ پوچھا، ''کیا؟'' بولے، ''کیا کہتے ہو؟ تم نے پھول محمد سے مسلم لیگ کے بارے میں کیا کہا؟''

''مسلم لیگ کے بارے میں کیا کہا؟ یاد نہیں پڑتا۔''

''اب کاہے کو یاد پڑے گا۔ جو کچھ کہنا ہے ہم سے کہا کرو، بچوں سے کیا کہتے ہو؟''

''کاکا، ہم نہیں سمجھے۔''

''نہیں سمجھے؟ تم نے پھول محمد سے نہیں کہا کہ مسلم لیگ کوئی آدمی نہیں ہے؟''

جلودھر چونک پڑا۔ ''اور آپ کیا سمجھتے ہیں آدمی ہے؟''

''ہم سے بھی ایسا بات؟ یہ دیکھو مسلم لیگ کی تصویر۔'' جلودھر دیکھ کے مسکرانے لگا۔ جمعدار صاحب اس سے الجھ پڑے، بڑی بحثم بحثا ہوئی۔ کوئی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکا۔

جمعدار صاحب غصے میں لوٹ آئے۔ رستے میں انھوں نے پھول محمد سے کہا، ''ہم سمجھے، جلودھر بابو ہم سے تو کہتا ہے، ہمارے ساتھ ہے، مگر ہے اصل میں پنیر میاں کے ساتھ۔ مسلم لیگ کا ذکر جھوٹ جھوٹ اس لیے نکالا ہے کہ پنیر میاں کا پلہ بھاری رہے۔ بدمعاش کہیں کا۔''

۱۶

جمعدار صاحب عشا کی نماز کے بعد مولانا مستنصر باللہ کے پاس گئے کہ ان کو بھی خوشخبری سنا دیں۔ جب ان سے جمعدار صاحب نے ذکر کیا تو انھوں نے بھی وہی مسلم لیگ والا قصہ چھیڑ دیا۔ جمعدار صاحب نے پہلے تو وہی جواب دیا کہ پنیر میاں کی یہ سب چال ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے، بھلا مسلم لیگ الیکشن میں کیوں حصہ لینے لگی۔ کبھی اُس نے یونین بورڈ کے الیکشن میں حصہ لیا تھا؟ اور جب تک کہ مسلم لیگ خود آ کے اپنی زبان سے نہ کہہ دے کہ پنیر میاں کو اُس نے نامزد کیا ہے وہ نہیں مان سکتے۔ مولانا نے بڑی نرمی اور سیدھی سادی مثالوں سے جمعدار صاحب کو اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔ وہ بات تو پوری طرح نہ سمجھ سکے، مگر اتنا ضرور سمجھ گئے کہ مسلم لیگ بھی اسی طرح کی چیز ہے۔ جیسے

مسلمان یعنی کسی خاص فرد کا نام نہیں، بلکہ سب مسلمانوں کا ہے۔ کہنے لگے، ''تو پھر ہم سب مسلم لیگ ہیں۔''

مولانا، ''ایسا ہی سمجھیے۔''

''تو پھر پنیر میاں صرف اپنے آپ کو مسلم لیگ کیوں کہتے ہیں؟''

''وہ اپنے آپ کو مسلم لیگ تھوڑی کہتے ہیں، وہ تو کہتے ہیں کہ ہم مسلم لیگ کی طرف سے کھڑے ہوئے ہیں۔''

''مگر ہم تو کھڑا نہیں کیا، ہم سے کوئی پوچھا بھی نہیں، میں نہیں مانتے۔''

اب مولانا نے جماعتی نظام کی نوعیت پر تھوڑی روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ جب جماعت کوئی حکم دے تو اس کی تعمیل ہر فرد پر ضروری ہے۔

''مگر پنیر تو اچھا آدمی نہیں اور ہمارا دشمن ہے۔''

''ہم بھی مانتے ہیں کہ وہ اچھے آدمی نہیں ہیں اور اگر ان کا کچا چٹھا ان لوگوں کو معلوم ہوتا جنھوں نے انھیں نامزد کیا ہے تو شاید وہ ایسا نہ کرتے، مگر اب تو وہ نامزد ہو ہی گئے، اب ہم آپ کو ماننا ہی پڑے گا۔''

''یہ تو بڑا مشکل کا بات ہے۔''

''مشکل ضرور ہے، مگر اسے آسان کرنا ہوگا۔''

''کیسے ہوا، میں مر جائیں گے۔ بی بی جان مر جائے گا۔''

''نہیں جمعدار صاحب ایسی بات نہ کیجیے۔''

''تو پھر میں کیا کریں۔''

''آپ نہ کھڑے ہوں۔''

''ہم تو کھڑا ہو گیا۔''

''تو بیٹھ جایئے اور پنیر میاں کی مدد کیجیے۔''

''ہمیں مار ڈالیے مولانا صاحب، مگر ایسا بات نہ کہیے، میں سچ کہتے ہیں۔''

''نہیں، جمعدار صاحب! قوم کے فائدے کے لیے اپنے ذاتی فائدے کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ آپ ایسے قربانی ضرور کر سکتے ہیں۔ اس کا انعام خدا کے یہاں پایئے گا۔'' جمعدار صاحب بجائے گھر آنے کے سیدھے مسجد گئے اور ساری رات وہاں گزاری، کبھی نماز پڑھتے، کبھی دعائیں مانگتے۔ کبھی روتے۔ کبھی ٹہلتے، کبھی لیٹ جاتے، کبھی آنکھ لگ جاتی تو ذرا دیر میں چونک اٹھتے۔ جیسے کوئی وحشت ناک خواب دیکھا ہو۔ بی بی جان کو جب معلوم ہوا کہ جمعدار صاحب مسجد میں ہیں تو بڑی خوش و مطمئن ہوئیں۔ یہ سمجھ کر جمعدار صاحب شکرانے کی نفلیں پڑھ رہے ہیں۔

۱۷

جمعدار صاحب صبح صبح گھر میں آئے۔ عجب حالت تھی۔ بال پریشان تھے اور چہرہ اس سے بھی زیادہ۔ آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں۔ سینہ دبا ہوا تھا۔ پیٹھ جھکی ہوئی۔ وہ یکا یک بڈھے ہوئے تھے۔ بی بی جان نے دیکھا تو گھبرا گئیں۔ کہنے لگیں، ''اتنی خوشی بھی اچھی نہیں ہوتی، تم نے تو اپنے کو ہلکان کر لیا ہے۔''

جمعدار صاحب صرف ''ہوں'' کہہ کے چلے گئے۔ حوائج ضروری سے فارغ ہوئے، واپسی پر بی بی جان نے حسب معمول مرمرے اور گڑ کا ناشتہ پیش کیا۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''نہیں، جی نہیں چاہتا۔''

بی بی جان، ''خوشی کے مارے میری بھی بھوک مر گئی ہے۔ رات میں نے بھی کچھ نہیں کھایا۔''

جمعدار صاحب، ''اب کیا بتائیں خوشی کی بات نہیں ہے، ہیں تو مر گئے۔''

''کیا ہوا؟''

''ارے کیا بتائیں — مسلم لیگ۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''تم کیا سمجھو گی، ہم خود نہیں سمجھے تھے۔''

''کچھ کہو بھی۔''

''اب کیا کہیں، بس لٹ گئے۔ تباہ ہو گئے۔ مر گئے۔''

''یہ گول گول باتیں تو میری سمجھ میں آتی نہیں۔ صاف صاف کہو۔''

''ارے بھائی اب معلوم ہوا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کا نام ہے کسی آدمی کا نہیں اور مسلم لیگ نے پنیر میاں کو ممبری کے لیے کھڑا کیا ہے۔''

''مطلب کیا ہے؟''

''کیا بتائیں مطلب۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مشکل میں پڑ گئے ہیں۔ سوچ لیں تو بتائیں۔''

جمعدار صاحب سوچنے کے بجائے اپنے والد کی قبر پر گئے، فاتحہ پڑھی، روئے اور اُن سے مدد چاہی۔ پھر گھر کے باہر ٹہلنے لگے۔ ٹہلنے جا رہے ہیں، نہ کسی کی طرف دیکھتے ہیں نہ کسی سے بات کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ پھول محمد آیا اور انھیں خبر نہ ہوئی۔ اتنے میں جلودھر اور مخلص بھی آ گئے۔ ان کی صاحب سلامت سے جمعدار صاحب چونکے۔ کہنے لگے، ''بھائی جلودھر تم سچ کہتے تھے۔ مسلم لیگ آدمی کا نام نہیں، لیکن اب میں کیا کریں۔''

جلودھر، ''کاکا، سوچنے کی کیا بات، مسلم لیگ کہا کرے پنیر میاں کا کوئی ساتھ نہ دے گا۔ سب آپ کا دیں گے۔ پنیر میاں کو تو ہرانا ہی ہے۔''

جلودھر، ''مسلم لیگ آپ کے خلاف گئی تو آپ اس کے خلاف جائیے۔''

جمعدار صاحب، ''ذرا سوچنے دو۔''

''سوچ لیجیے، مگر آپ کو وزیر تو ہونا ہی ہے۔''

''بھائی ہمارا سر چکرا رہا ہے۔''

جمعدار صاحب تیز تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوئے اور اپنی چوکی پر جا کر بیٹھ گئے۔ پھر دراز ہو گئے۔ بی بی جان سرہانے آ کے کھڑی ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ سر دبانے لگیں۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''بی بی جان ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، ہیں کیا کریں۔''

بی بی جان، ''پوری بات تو بتاؤ۔''

''مطلب یہ ہے کہ ہم بنیر کے مقابلے میں کھڑے ہوں کہ نہیں، کھڑے ہوں تو ضرور جیت جائیں، مگر مسلم لیگ کا معاملہ آن پڑا ہے۔''

''مسلم لیگ سے اس سے مطلب۔''

''یہی تو ہم بھی کہتے ہیں، پاکستان کے لیے لڑے تو ہم توپ سے لڑ جائیں، مگر الیکشن کے لیے کیوں لڑتی ہے؟ الیکشن پاکستان تھوڑی ہے۔''

''تو تم یہی لکھ دونا۔''

''ارے اب لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو اس نے فیصلہ کر ہی دیا۔''

''پھر کیا کرو گے۔''

''یہی تو سوچ رہے ہیں۔''

''تو پھر موزید شاب سے پوچھو۔''

موزید شاب کا نام سنتے ہی جمعدار صاحب اٹھ بیٹھے، جیسے کوئی ڈوبتا ہوا اچھل کر پانی کی سطح پر آ جائے۔ کہنے لگے، ''بی بی جان تم بڑی سمجھ دار ہو۔ میں پریشانی میں بھول ہی گئے تھے۔ ابھی جاتے ہیں۔'' فوراً چل کھڑے ہوئے۔ بی بی جان نے بہت کہا، ''کھانا تو کھالو۔'' مگر ان سے رکا نہ گیا۔ انھیں جانے کی اتنی جلدی تھی کہ پھول محمد کو بھی ساتھ نہ لے سکے۔

۱۸

دوسرے دن قریب دوپہر کے مجید صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ وہاں ملنے والوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ جمعدار صاحب کھسیائے، انھیں برا لگا کہ اتنے لوگ کیوں ملنا چاہ رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات لے کے آئے ہوں گے، وہ اتنی بڑی بات لے کر آئے تھے، مگر اب انھیں بھی سب کے ساتھ انتظار

کرنا پڑے گا۔ ان کا دم گھٹنے لگا۔ ہر سانس اس طرح لے رہے تھے جیسے آخری سانس ہو، صاحب کے کمرے میں کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں میٹنگ ختم ہوئی، لوگ باہر آئے اور ان کے ساتھ مجید صاحب بھی، جمعدار صاحب نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ مجید صاحب جمعدار صاحب کو دیکھ کے مسکرائے۔ خیریت پوچھی۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''حضور میں بہت مشکل میں گر گئے ہیں۔ آپ سے رائے لینا مانگتے ہیں۔'' جس مشکل میں ''گر گئے'' تھے اس کی تفصیل انھوں نے بتائی۔ اگرچہ مولانا مستنصر باللہ انھیں بتا چکے تھے کہ مسلم لیگ جماعت کا نام ہے فرد کا نہیں، مگر پھر بھی جمعدار صاحب کو خیال آیا کہ اس بنیادی سوال کے بارے میں بھی مجید صاحب سے پوچھ لیں۔ کون جانے مولانا صاحب سے غلطی ہو گئی ہو اور جمعدار صاحب کا پہلا خیال ہی صحیح نکلے۔

فرمایا، ''مولانا صاحب کہتا ہے، مسلم لیگ کسی آدمی کا نام نہیں۔ سب مسلمانوں کا نام ہے، میں کہتے ہیں مسلم لیگ قائدِ اعظم کا نام ہے، حضور کا کیا رائے ہے۔''

مجید صاحب کو ہنسی تو بڑے زور سے آئی، مگر ہونٹوں تک آتے آتے دبی ہوئی مسکراہٹ بن گئی۔ انھوں نے جواب دیا، ''آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں (جمعدار صاحب کا دل ایک دم سے اچھل کے حلق میں آ گیا)... اور مولانا صاحب بھی..... (جمعدار صاحب کا دل بیٹھنے لگا) اس اچھل کود کی وجہ سے جمعدار صاحب کا دل دھڑ دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پوچھا، ''حضور میرا بھی بات سچ اور مولانا صاحب کا بھی؟''

''جی ہاں۔''

''حضور میں اس وقت بہت گھبرائے ہوئے ہیں، حضور کا بات سمجھ نہیں سک رہے ہیں۔''

''مطلب یہ ہے کہ ہے تو مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت ہی کا نام، لیکن اس وقت قائدِ اعظم اور مسلمانوں کی جماعت میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔''

''تو پھر حضور میں کیا کریں۔''

''آپ نماز میں کیا کرتے ہیں؟ جب امام سجدہ کرتا ہے تو آپ بھی سجدہ کرتے ہیں کہ نہیں؟''

"البت کرتے ہیں۔"

"تو پھر یہی کیجیے۔"

"مگر حضور یہ تو نماز نہیں۔"

"ایک طرح کی نماز ہی سمجھیے۔"

"مگر حضور پنیر میاں تو بہت برا آدمی ہے۔"

مگر آپ تو اچھے ہیں۔"

"حضور کا دعا ہے، اسی سے تو میں کھڑے ہونا مانگتے ہیں۔"

"امام سجدے میں ہو اور جماعت میں کوئی آدمی کہے نہیں ہم تو کھڑے ہی رہیں گے تو کیا آپ اسے اچھا آدمی کہیں گے۔"

"نہیں۔"

"پنیر میاں برے ہیں تو برے سہی، آپ تو برے نہ بنیے۔"

"مگر حضور یہ تو نماز نہیں۔او.... ہم بھول گیا آپ بولا تھا یہ بھی نماز کا مافک ہے، حضور مافی مانگتا ہمارا دباغ خراب ہو رہا ہے۔"

مجید صاحب نے جمعدار صاحب کے چہرے سے اندازہ کیا کہ ان پر غشی طاری ہوا چاہتی ہے۔ انھیں بٹھایا۔ پانی پلوایا۔ گھر میں لیچی کا درخت تھا۔ اسی کی لیچیاں جمعدار صاحب کو کھلوائیں اور کچھ چھانو کے لیے ساتھ کر دیں۔ جمعدار صاحب کا دل باغ باغ ہو گیا۔ ایسا باغ جس میں لیچی ہی لیچی کے درخت ہوں اور ہر درخت میں لیچیاں گھنگھروں کی طرح لدی ہوئی ہوں، وہ اپنی ناکامی کا قصہ وقتی طور پر بھول گئے۔ گاؤں کے لوگ جب سنیں گے کہ موز ید شاب نے خود اپنے گھر کی لیچیاں کھلائیں اور چھانو کے لیے بھی بھیجیں تو ان کا کیا حال ہوگا۔ چھانو کس شوق سے یہ لیچیاں کھائے گا۔ جمعدار صاحب ان لیچیوں میں سے بی بی جان کو بھی کچھ کھلائیں گے اور کچھ پھول محمد کو بھی۔

19

جمعدار صاحب گھر میں داخل ہوتے ہی چیخے، ''ارے بی بی جان کہاں ہو۔ سنو ہم موزید شاب (جلدی میں صحیح تلفظ مجید صاحب جو عموماً کیا کرتے تھے نہ کر سکے اور موزید شاب منہ سے نکلا) نے ہمیں اپنے باغ کی لیچی کھلائی، تمھیں بھی بھیجی ہے یہ لو۔ ارے چھانو! لیچی، او قمیص..... لیچی'' بی بی جان کوٹھڑی سے باہر نکلیں، جمعدار صاحب کی خوشی دیکھ کے خوش ہوگئیں۔ ایک لیچی بڑی مشکل سے کھائی اور بقیہ جمعدار صاحب اور چھانو کے لیے رکھ دی۔ لیچی کی خوشی جب ذرا کم ہوئی تو انھوں نے جمعدار صاحب سے پوچھا، ''جس بات کے لیے گئے تھے اس کا کیا ہوا؟''

''ارے کیا بتائیں موزید شاب ارے مجید صاحب نے بھی وہی کہا جو مولانا صاحب کہتے تھے۔''

''تو پھر کیا ارادہ ہے؟''

''اب کیا بتائیں۔''

''میں زیادہ تو جانتی نہیں، میری سنو تو وہ کرو جس سے خدا رسول خوش ہوں۔''

''مجید صاحب اور مولانا صاحب تو کہتے ہیں کہ ہم بیٹھ جائیں تو خدا رسول خوش ہوں گے۔''

''تو پھر بیٹھ جاؤ۔''

''مگر سوچو تو کتنا بڑا ظلم ہے کہ ہم چاہیں تو وزیر ہو جائیں، مگر ہو نہیں سکتے۔''

''ہمیں ایسی وزارت نہیں چاہیے جس سے خدا اور رسول خوش نہ ہوں، حلال کی کمائی کا سوکھا بھات اچھا۔''

''وزارت کی کمائی بھی تو حلال ہی کی ہوتی ہے۔''

''لیکن اگر خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہو تو ضرور حرام ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے، تو تم غریبی میں خوش ہو؟''

''ہاں، حرام کی امیری سے حلال کی غریبی اچھی۔''

جمعدار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ بی بی جان نے پوچھا، ''تو کیا کرو گے؟''

جمعدار صاحب، ''جب تم عورت ہو کے ایسا کہتی ہو تو ہم مرد ہو کے کیسے بیٹھے رہیں۔ جو تم کہہ رہی ہو مولانا صاحب بھی کہتے ہیں مجید صاحب بھی۔ اب جیسی خدا کی مرضی۔'' یہ کہہ کر جمعدار صاحب تھوڑی دیر کے لیے چت لیٹ گئے۔ پیچی کی خوشی کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر خاموش لیٹے رہے پھر ''الا اللہ'' کہہ کے اٹھ بیٹھے۔ باہر گئے۔ پھول محمد آ گیا۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''پھول محمد اب ہم الیکشن میں نہیں کھڑے ہو رہے ہیں۔''

''ارے چاچا!''

''ہاں بچہ۔ اب کیا کریں۔ مسلم لیگ.....''

''چاچا آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔'' یہ کہہ ان سے لپٹ گیا۔ ''ہم بھی تو کہہ رہے تھے۔ مسلم لیگ جندہ باد کہتے کہتے حلق سوکھ گیا۔ اب کیسے اس کے خلاف جائیں گے۔''

''ہاں بچہ۔''

''تو آپ کہہ دیجیے نا۔''

''ہاں بچہ۔''

''ہم سب سے کہہ دیں۔''

''ہاں بچہ۔''

جمعدار صاحب پیٹھ جھکائے کمان بنے بیٹھے تھے۔ پھول محمد بے تاب ہو کے ان کے پاس سے تیر کی طرح نکلا۔ آناً فاناً سارے گاؤں میں، بلکہ اڑوس پڑوس میں بھی خبر پھیل گئی۔ لوہا گاڑا کے مولانا محب الرحمٰن بھی امیدواروں میں تھے۔ برائے نام تو وہ پرجا پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے، لیکن دراصل انھیں کانگریسیوں نے کھڑا کیا تھا۔ انھوں نے جب یہ خبر سنی تو انھیں تھوڑا تعجب تو ہوا، لیکن اس سے زیادہ خوش ہوئی۔ وہ جمعدار صاحب کے یہاں پہنچے۔ بڑے زور سے ''السلام علیکم''

کہا۔ جمعدار صاحب لوگوں سے اس طرح مل رہے تھے جیسے ان کے یہاں غمی ہو گئی ہو اور لوگ پُرسا دینے آرہے ہوں۔ جمعدار صاحب نے دبی ہوئی آواز میں کہا، ''وعلیکم۔''

مولانا، ''سنا اب آپ مقابلہ نہیں کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں، مسلم لیگ۔''

''میں تو ہمیشہ سے یہی کہتا تھا کہ مسلم لیگ میں انصاف نہیں۔''

جمعدار صاحب خاموش رہے۔

''اس کی ناانصافی مٹانے ہی کے لیے میں کھڑا ہوا ہوں۔ مسلم لیگ بڑے لوگوں کے لیے ہے۔ ہم آپ پرجا ہیں، پرجا جیتیں تو پرجا کی حالت سدھرے۔''

پھول محمد اٹھا اور جا کے مولانا مستنصر باللہ کو بلا لایا۔ مولانا کو دیکھ کر مولانا محب الرحمٰن ذرا گھبرا گئے، مگر انھوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ جمعدار صاحب اب بھی خاموش تھے۔

مولانا مستنصر باللہ نے پوچھا، ''کہیے کیسے آنا ہوا۔''

مولانا محب الرحمٰن، ''یوں ہی ملنے آ گیا۔''

''سنا ہے آپ بھی الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔''

''جی ہاں پرجا پارٹی کی طرف سے۔''

''یعنی مسلم لیگ کے خلاف۔''

''جی ہاں، کیا کیا جائے۔''

مولانا، ''مگر ہمیں تو جماعت کا ساتھ دینا چاہیے۔''

''پرجا پارٹی بھی تو جماعت ہے۔''

''مگر مسلمانوں کی نہیں۔''

''ہندو مسلمان سبھی پرجا ہیں، ہم تو پرجوں کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔''

''مگر مولانا مسلمان ہم پہلے ہیں، پرجا بعد میں۔''

''ہم دونوں ساتھ ہیں۔''

''یہ بتائیے کہ کبھی ایسا ہو کہ بحیثیت پرجا کے ہمیں ایک بات کرنی چاہیے، لیکن بحیثیت مسلمان کے دوسری، تو آپ کیا کریں گے۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے، اسلام پرجوں کے حق کا سب سے بڑا محافظ ہے۔''

''یہ تو سچ ہے پرجوں کے حق کا کیا اسلام ہر جائز حق کا محافظ ہے، لیکن پہلے ہمیں اس اسلام کی حفاظت کرنی چاہیے جو ان سبھی کی حفاظت کرے۔''

''اسلام کو اس وقت کون سا خطرہ ہے۔''

''خطرہ نہیں تو ایسے ہی سب مسلمان ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے ہیں۔''

مولانا محبّ الرحمٰن نے بات کا رخ پلٹا۔ کہنے لگے، ''آپ نے کہاں کی بات کہاں پہنچا دی۔ یہاں سوال صرف یہ ہے کہ پنیر میاں خراب آدمی ہیں۔ جمعدار صاحب کے بڑے دشمن، ان کو جھوٹے مقدمے میں کسی طرح پھنسانا چاہتے تھے۔ اگر وہ ممبر ہو گئے تو ہم سب کا ناک میں دم ہو جائے گا۔ خصوصاً جمعدار صاحب کا، یہ موقع اچھا ہے۔ ہم سب مل کے انھیں شکست دے دیں۔''

جمعدار صاحب اب تک خاموشی سے سن رہے تھے۔ قریب قریب خالی الذہن ہو کے، لیکن اب کچھ باتیں ان کے خیال میں آ رہی تھیں اور الفاظ کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''ایسا ہی ہوتا تو میں کیوں بیٹھتے؟''

''آپ بیٹھ گئے تو بیٹھ گئے، لیکن ہم تو کھڑے ہیں۔ ہماری ہی مدد کیجیے۔''

مولانا صاحب، ''آپ اور کوئی بات کہنے سے میں خوشی سے کر نے سکتے تھے۔''

مولانا مستنصر باللہ، ''یہ اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا مسئلہ ہے۔''

''اسلام کی حفاظت کیا اس میں ہے کہ پنیر میاں جیسے خراب آدمی کی حمایت کی جائے۔''

''پنیر میاں تو پنیر میاں اگر مسلم لیگ کسی کیلے کے درخت کو بھی ووٹ دینے کو کہے تو اُس وقت سب مسلمانوں کو دینا چاہیے۔ یہ پنیر میاں یا کیلے کے درخت کو ووٹ دینا تھوڑی ہے، بلکہ مسلم

لیگ کو، مسلمانوں کی طاقت کا راز اسی میں ہے کہ ہم میں ویسی ہی تنظیم ہو جیسی کہ جماعت کی نماز میں ہوتی ہے۔''

جمعدار صاحب، ''مولانا صاحب اگر ایسا بات ہے تو پھر میں بھی پنیر میاں کا ساتھ دیں گے۔''

''ضرور آپ کو دوسروں سے بھی کہنا چاہیے کہ پنیر میاں کو ووٹ دو۔''

''میں کہیں گے۔''

مولانا محب الرحمٰن بغیر کچھ اور کہے وہاں سے چل دئیے۔

جمعدار صاحب پنیر میاں سے بات چیت تو اب بھی نہ کرتے تھے، مگر ہر جگہ ہر ایک سے یہی کہتے تھے کہ پنیر میاں کو ووٹ دو۔ کہتے وقت ان کے چہرے پر ایک بادل سا چھا جاتا، لیکن جہاں انھوں نے دو تین جملے کہے بادل چھٹ جاتا اور اور ان کے چہرے میں ایک خاص روشنی پیدا ہو جاتی۔ وہ روشنی جو کہیں باہر سے نہیں آتی، بلکہ دل کے اندر سے پھوٹتی ہے۔

الیکشن کا نتیجہ ظاہر تھا، پنیر میاں ہزاروں ووٹ سے جیتے اور مولانا محب الرحمٰن کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔

☯......☯......☯

پانچواں باب

بنگال کی فضا بدستور مجسم شعر و نغمہ بنی ہوئی تھی۔ سبزہ ویسا ہی لہلہا رہا تھا۔ درخت ویسے ہی جھوم رہے تھے۔ پھول ویسے ہی کھل رہے تھے۔ تاروں سے آسمان اور جگنو سے زمین ویسے ہی جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چڑیاں ویسے ہی چہچہا رہی تھیں۔ پھل سنگھیاں ویسے ہی اُڑ رہی تھیں۔ چوہیاں اسی طرح دھان چرا رہی تھیں اور لوٹے بدستور اُن کے سروں پر ٹپک رہے تھے۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہو گیا تھا کہ لوٹوں نے بموں کی اور چوہیوں نے انسانوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دوسری جگہ تو بم برس ہی رہے تھے، مگر اب چٹا گانگ اور کلکتہ پر بھی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ بھگدڑ مچ رہی تھی۔ لوگ بھاگ بھاگ کر دیہاتوں میں آ رہے تھے۔ بم زدہ علاقوں سے جو مقام جتنا دور تھا وہاں تباہ کاریوں کی خبر اتنی ہی بڑھ چڑھ کر پہنچ رہی تھی، گھوڑا مارا کے زمیندار بابو کلکتہ سے بھاگ آئے تھے۔ گاؤں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ نگن بابو نے رعایا کی طرف سے معقول نذرانہ پیش کرنے کی بڑی کوشش کی۔ گاؤں کے اتنے بڑے بھاگ کہ زمیندار بابو وہاں بہ نفسِ نفیس بھاگ آئیں۔ رعایا کو اس خوشی میں سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔ یہ بات تو ٹھیک تھی اور پرانے دستور کے مطابق بھی، مگر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ رعایا کے پاس قربان کرنے کے لیے کچھ زیادہ رہا نہ تھا۔ ایک جان تھی اور وہ بھی فاقہ کی نذر ہوئی جا رہی تھی۔ نگن بابو نے تشدد سے بھی کام لیا، مگر سو پچاس سے زیادہ وصول نہ ہو سکا۔ اس سو پچاس میں جمعدار صاحب کے بھی پانچ روپے شامل تھے جو اس وقت ان کے لیے پچاس کے برابر تھے۔

۲

زمیندار بابو کی خدمت میں پنیر میاں حسب دستور حاضر ہوئے، مگر اب وہ ایم ایل اے ہو گئے

تھے، اور وہ بھی مسلم لیگ کی طرف سے۔ اس لیے اب زمیندار بابو کو پرنام کرنا ان کی شایانِ شان نہ تھا۔ اس لیے بجائے پرنام کرنے کے آداب بجالائے۔ زمیندار بابو کو ذرا برا لگا، مگر چپ ہو رہے۔ جب تک کلجگ لگا ہوا ہے انھیں یہ سب بے ادبیاں برداشت کرنی ہی پڑیں گی۔ جب ست جگ آئے گا تب ان نیچ لوگوں کو پتا چلے گا۔ ست جگ کے آنے میں اب زیادہ دیر بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس احساس سے زمیندار بابو دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ انھوں نے احساس کی بڑی بلندی سے پنیر میاں کو دیکھا جیسے کسی اونچے مندر کا کلس اُن اچھوتوں کو دیکھے جن کی مندر کے نیچے بھیڑ لگی ہو اور جنھیں مندر میں گھسنے کی اجازت نہ ہو، تھوڑی دیر اس طرح دیکھنے کے بعد انھوں نے کہا، ''پو نیر میاں! کام کیسا چل رہا ہے۔''

''بابو جی کی آشیرباد سے اچھا ہے۔''

''دیکھو تم لوگ ہندو دھرم کی ذات پات چھوت چھات کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔''

''نہیں تو بابو جی۔''

بابو جی نے جیسے سنا ہی نہیں اور بولے، ''تم لوگ سمجھتے تھے کہ یہ سب چیزیں پرانی ہوگئیں۔ اب نئے زمانے میں نہ چل سکیں گی۔''

پنیر میاں نے پھر وہی کہا، ''نہیں تو بابو جی۔'' اور کہتے بھی کیا، اُن کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ بابو جی یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہیں اور ان کا مطلب کیا ہے۔

بابو جی، ''نہیں تو کیا کہہ رہے ہو۔ ہم خود بھی سمجھنے لگے تھے کہ ذات پات چھوت چھات پراچین دھرم کی چیزیں نہیں۔ بعد میں لوگوں نے ہندو جاتی کو مسلمان جاتی سے بچانے کے لیے بڑھائی ہیں۔ یہ سمجھ کے ہم نے ذات پات چھوت چھات کے بندھن بہت کچھ توڑ ڈالے تھے۔ تم لوگوں کی دیکھا دیکھی انگریزوں کی دیکھا دیکھی، مگر اب جو انگریزوں کا باپ برآمد ہوا تو پتا چلا کہ ذات پات چھوت چھات پراچین دھرم ہی کی خاص چیزیں ہیں۔''

پنیر میاں نہ سمجھے کہ یہ انگریزوں کا باپ کون ہے، بابو جی کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے

لگے۔ بابو جی نے خوش ہو کے قہقہہ لگایا، ''ارے نہیں سمجھے؟ نہیں سمجھے؟ انگریزوں کا باپ (ہی ہی ہی) ہٹلر اور کون۔'' پنیر میاں اپنی کم فہمی پر کچھ جھینپے، مگر بابو جی کا ساتھ دینے کے لیے اخلاقی ہنسی ہنسنے پر مجبور ہوئے۔

''دیکھ نہیں رہے، ہو انگریز کس طرح دم دبا دبا کر بھاگ رہے ہیں اور ہٹلر انھیں ہر جگہ پیٹ رہا ہے۔ دیکھ لینا ایسی مار مارے گا کہ انگلش چینل میں ڈوبتے ہی پناہ ملے گی۔ اسے قیصر نہ سمجھنا، ہٹلر جیت کے رہے گا۔ یہاں دھرم کا معاملہ ہے دھرم کا۔'' پنیر میاں پھر نہ سمجھے کہ ہٹلر کا دھرم سے کیا تعلق۔ بابو جی پھر ہنس پڑے۔ بولے، ''ہاں تم لوگوں کی سمجھ میں ایسی باتیں کاہے کو آنے لگیں۔ تمھارے خلاف جو پڑتی ہیں۔''

پنیر میاں کا چہرہ اب بھی نہ سمجھنے کا اعلان کر رہا تھا۔

بابو جی نے کہا، ''دیکھو ہٹلر کیا کہتا ہے۔ یہی نا کہ آریا جاتی دنیا کی سب جاتیوں سے اونچی ہے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے؟ اور ہمارے رشی منی کیا کہہ گئے ہیں؟ بالکل یہی بات۔ ہماری مانو تو ہٹلر اس زمانے میں ہندو دھرم کا پرچار کر رہا ہے، اپنی توپوں سے ٹینکوں سے، ہوائی جہازوں سے، اور دنیا ماننے پر مجبور ہو رہی ہے۔ دیکھ لینا جیتنے کے بعد ہٹلر تمام دوسروں جاتیوں کو شودر بنا دے گا۔ جس طرح ہمارے رشیوں منیوں نے یہاں کے لوگوں کو بنا دیا تھا۔ تب ساری دنیا ہندو دھرم کی سچائی مانے گی اور ذات پات چھوت چھات کو اچھی چیز سمجھنے لگے گی۔ جس طرح پہلے یہاں کے اچھوت سمجھا کرتے تھے۔ اب جو لوگ اس پر ہنستے ہیں وہ اپنی بیوقوفی پر روئیں گے۔ پنیر میاں، ہم تو کھری کھری بات کہتے ہیں، برا نہ ماننا۔''

پنیر میاں برا کیا مانتے۔ ان کی سمجھ میں بات ہی نہیں آ رہی تھی۔ جیسے وہ تیز روشنی سے یکا یک اندھیرے گھپ کمرے میں آ جائیں اور وہاں کی کوئی چیز نظر نہ آئے۔ جب نگاہیں رفتہ رفتہ عادی ہو گئیں تو اندھیرے میں جو چیزیں موجود تھیں، اُن کی ٹھوس حقیقت ابھرنے لگی۔ پنیر میاں کی الجھن دیکھ کے بابو جی نے کہا، ''یہ بات ہی ایسی ہے کہ تم مسلمانوں کی سمجھ میں مشکل سے آئے گی۔

ہٹلر کالوہامان رہے ہواور نہ بھی مانو تو کیا۔ وہ منوا کے رہے گا۔ ہٹلر آریا جاتی کی بڑائی کا پرچار کر رہا ہے کرنے دو۔ یہ بھی بھگوان کی لیلا ہے کہ جو کام ہندو جاتی سے لینے کا تھا وہ ہٹلر سے لے رہا ہے۔ ہٹلر کے جیتنے کے بعد ہم لوگ اس سے کہیں گے، بچہ کہاں جاتے ہو۔ سنو تو، ہم تم سے بھی اونچے آریا ہیں۔ ہم نے اپنا آریا خون دو تین ہزار برس سے کسی اور جاتی کے بیچ خون سے ملنے نہیں دیا۔ ہمارے برہمنوں کے جیسے خالص آریا تمھارے جرمنوں میں کہاں ہیں۔ اگر ہوں تو لاؤ، نہیں تو ہمیں پرنام کرو۔ ہٹلر کیسا لاجواب ہوگا (ہی ہی ہی ہی) اس دن کا خیال ہی کر کے دل میں ایسی گدگدی ہونے لگتی ہے کہ ہنسنے لگتا ہوں۔''

پنیر میاں اپنے خیالات مجتمع کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ کیا کہیں، مگر بابو جی نے انھیں کہنے کی زحمت نہ دی۔ خود ہی بولے، ''تمھیں اب بھی یقین نہیں آتا کہ نازی ہمارے چیلے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ گرو گڑ ہی رہ گئے اور چیلے شکر ہو گئے۔ ہم جو کچھ کر کے دکھا چکے ہیں وہاں تک پہنچنے میں نازیوں کو بہت دن لگیں گے۔ ہاں ایک چیز اور تم نے دیکھی؟ نازیوں نے اپنا قومی نشان کیا بنایا ہے۔ وہی ہمارا سواستک، مگر الٹا۔ اب بھی نہ مانو گے؟'' یہ کہہ کے بابو جی نے بڑی فخر سے اپنے سونے کے بٹنوں کو دیکھا۔ پنیر میاں کی بھی نظر پڑی۔ ہر بٹن پر سواستک کے نشان بڑی خوب صورتی سے ابھرتے ہوئے تھے۔ اب جو پنیر میاں نے خیال کیا تو انھیں یاد آیا کہ جب سے جرمن جیتنے لگے ہیں تب سے واقعی سواستک کا استعمال ہندوؤں میں بہت بڑھ گیا ہے۔ دکان کے سائن بورڈوں پر، خط کے کاغذوں پر، زیوروں پر، جدھر دیکھو سواستک کی نمائش ہو رہی ہے۔ پنیر میاں کو وحشت سی ہونے لگی۔ بابو جی اگرچہ انھیں ڈانٹ نہیں رہے تھے، بلکہ ان سے بات کر رہے تھے، مگر پھر بھی انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے انھیں بری طرح ڈانٹ پلائی ہو۔ جیسے ہی یہ بوچھاڑ ختم ہوئی، وہ اٹھ کے جانے لگے۔ ان کے جاتے جاتے بابو جی نے شربت کا ایک گھونٹ انھیں اور پلایا۔

''اور سمجھے؟ یہ جمہوریت ومہوریت سب واہیات چیز ہے، انتظام ڈنڈے کے زور سے ہوتا ہے اور یہ ڈنڈے کا زور اونچی جاتیوں کا حق ہے، نیچ کا نہیں، سمجھے؟ مگر تم لوگ کاہے کو سمجھو گے۔ یہ

تمھارے سمجھنے کی بات نہیں۔ بعد میں پتا چلے گا (ہی ہی ہی ہی)۔''

۳

زمیندار بابو کا گھوڑا مارا میں براجمان ہونا گاؤں والوں کی امید کے خلاف بہت مبارک ثابت نہ ہوا۔ گھوڑا مارا کی آب و ہوا مشرقی بنگال کے اور مقامات کی طرح اچھی خاصی تھی۔ ملیریا اس برصغیر میں کہاں نہیں ہوتا۔ جہاں ایک خاص قسم کے مچھر ہوں گے دیوار پر ترچھے بیٹھنے والے، ملیریا وہیں ہوگا، مگر یہاں دریا کی بہتات اور سالانہ سیلاب کی وجہ سے زمین کا غسلِ صحت ہو جایا کرتا تھا۔ غلاظت اور مچھروں کے انڈے بچے بہہ جایا کرتے تھے اور ملیریا کم ہوتا تھا، لیکن اس سال سیلاب کم آیا تھا۔ اس کی وجہ سے مچھروں کی زیادتی ہوئی اور ساتھ ساتھ ملیریا کی بھی۔ کونین ملتی نہ تھی۔ فوج کے لیے جارہی تھی۔ گاؤں میں کیسے پہنچتی، ہر گھر سے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جہاں دیکھیے لوگ دھوپ میں بیٹھے لرز رہے ہیں۔ دانت کٹ کٹ بول رہے ہیں۔ طوفان کے صدمے نے جمعدار صاحب کی جسمانی قوت بہت کم کر دی تھی۔ وہ بے چارے بھی شکار ہو گئے۔ ڈاکٹر کو بلاتے روپیا خرچ ہوتا اس لیے وہ برداشت کرتے رہے، مگر اب بی بی جان بھی پڑ گئیں۔ بے چاری کراہتی اٹھتیں اور جمعدار صاحب کی خدمت کرتیں۔ جمعدار صاحب کے دل کو تکلیف ہوتی، منع کرتے، مگر وہ نہ سنتیں۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''ڈاکٹر بلوا دوں۔''

انھوں نے جواب دیا، ''اپنے لیے تو بلوایا نہیں ہمارے لیے کیوں؟ رہنے دو۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''نہیں ہم بھی دکھائیں گے۔''

بی بی جان نے جواب دیا، ''تو پھر اپنے ہی لیے بلوا لو۔''

جمعدار صاحب چپ ہو رہے، لیکن چھانو کو بھی بخار آ گیا اور بہت تیز۔ جمعدار صاحب پریشان ہو گئے۔ گیدو کی ماں بی بی جان کی خدمت کے لیے آ جایا کرتی۔ جب وہ آئی تو انھوں نے پھول محمد کو بلوایا۔ وہ کئی دن سے نہ آیا تھا۔ بخار میں مبتلا تھا، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ جمعدار صاحب

نے بلوایا ہے تو اپنے جسم کی کپکپی چھپاتا ہوا آیا۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''اَبھے بابو ڈاکٹر کو بلا لاؤ، اور ہاں (ذرا سوچ کے) ڈاکٹر کی فیس اور دوا کے لیے روپیا.... اچھا سرت بابو سے جا کے کہو ہمارا پٹ سن خرید لیں۔''

بی بی جان نے کہا، ''مگر تم تو کہتے تھے کہ پٹ سن ابھی نہ بیچیں گے۔ ابھی دام کم ہیں بعد میں بیچنے سے زیادہ ملیں گے۔''

جمعدار صاحب نے بڑی بے بسی کے لہجے میں جواب دیا، ''کہتے تو تھے، مگر اب کیا کریں۔ اب تو بیچنا ہی پڑے گا۔ قسمت کی بات ہے۔'' پھول محمد چلا گیا۔

اَبھے بابو کسی زمانے میں کمپونڈری کر چکے تھے۔ گاؤں میں آ کر ڈاکٹر بن گئے تھے۔ پہلے ایک روپیا فیس لیتے تھے اب انھوں نے دو روپے کر دی تھی۔ جب سے ملیریا کا زور ہوا تھا ان کی قسمت جاگ گئی تھی۔ وہ خوش خوش آئے۔ پہلے انھوں نے چھانو کو دیکھا پھر بی بی جان کے کہنے سے جمعدار صاحب کو اور جمعدار صاحب کے کہنے سے بی بی جان اور پھول محمد کو۔ اوّل تو انھیں تشخیصِ مرض کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ دوسرے اگر ہوتی بھی تو دوا کہاں تھی۔ انھوں نے کچھ مختلف رنگین پانی کی بوتلیں چینی اور نمک ملا کے بھر رکھی تھیں اور مرض کی کمی یا زیادتی کے لحاظ سے لال نیلے پیلے رنگ کی دوائیں تجویز کر دیتے۔ چیز قریب قریب ایک ہی ہوتی، مگر مریض اور مرض کی حالت کے مطابق دوا کے رنگ مزے اور قیمت میں فرق ہو جاتا۔ چھانو کا مرض خطرناک بتایا۔ اس کی دوا کی قیمت ڈیڑھ روپیا ہوگی۔ جمعدار صاحب کی ایک روپیا بی بی جان کی بارہ آنے اور پھول محمد کی آٹھ آنے۔ جمعدار صاحب نے جوڑا تو پونے چار روپے ہوئے۔ ڈاکٹر کی فیس دو روپے الگ۔ جب ڈاکٹر جا چکے تو انھوں نے پھول محمد سے چپکے سے کہا، ''ہم تو اب اچھے ہو رہے ہیں۔ ہمیں دوا کی ضرورت نہیں۔ خالی چھانو، بی بی جان اور اپنے لیے لے آنا۔ اور ہاں سرت بابو نے کیا کہا۔''

پھول محمد نے بتایا کہ جمعدار صاحب کو غرض مند سمجھ کے وہ بازار کے بھاؤ سے بھی دو چار روپے کم پر خریدنا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کہ جمعدار صاحب کا پٹ سن گھٹیا قسم کا ہے، جمعدار صاحب کو غصہ تو

بہت آیا۔ خصوصاً ان کے پٹ سن کو گھٹیا قرار دینے پر جو درحقیقت بہت اچھے قسم کا تھا، مگر کیا کرتے۔ مجبوری تھی جو دام ملے، لے لیے۔ ایک آہ بھر کے۔

پھول محمد نے چھانو بی بی جان اور جمعدار صاحب کے لیے دوا خریدی اپنے لیے صرف ایک پیسے کی بیڑی لے لی۔ بس دوا اور باقی روپیا چپکے سے بی بی جان کو دے کے چلا گیا۔

۴

جلودھر اور مخلص گھر گھر جا کر بیماروں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ کہیں تیز بخار والوں کے سروں پر بھیگے کپڑے رکھتے۔ کہیں پیاسے مریضوں کو پانی پلاتے کہیں تھوڑی بہت غذا کا انتظام کرتے۔ کہیں ڈاکٹر کو بلاتے۔ کہیں دوا لاتے۔ جمعدار صاحب کے گھر بھی آئے۔ پھول محمد جو اتنا گھوما پھرا تھا اس کی وجہ سے اس کا بخار تیز ہو گیا تھا۔ قیمص کو بھی بخار آ گیا تھا۔ جمعدار صاحب کا جی نہ چاہتا تھا کہ جلودھر اور مخلص کے احسان مند ہوں۔ جب یہ لوگ آئے تو جمعدار صاحب نے اپنی بچی کھچی طاقت سے کام لے کر اپنے کو تندرست ظاہر کرنے کی کوشش کی، لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ موتی کو جو بھوکی تھی، یہ لوگ کھلا پلا آئے ہیں تو قدرے پسیج گئے۔ پھر چھانو کے کراہنے کی آواز نے ان کی رہی سہی قوتِ ارادی بھی ختم کر دی۔ کہنے لگے، جلودھر بابو میں تو اچھا ہوں، مگر ذرا چھانو کو دیکھ لو اور ہاں پھول محمد کو بھی اور قیمص کو بھی.... بی بی جان ذرا پردہ ہو جاؤ۔"

بی بی جان میں اگر چہ اُٹھنے کی سکت کم تھی، مگر پھر بھی بے چاری اپنے کو گھسیٹ کے کوٹھری میں لے گئیں۔ جلودھر نے اندر جا کے چھانو کو دیکھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ اس نے مخلص سے کہا، "تم چھانو میاں کے سر پر پانی رکھو۔ میں پارٹی کے دفتر سے یوڈی کلون لے کے آتا ہوں۔ مخلص کپڑا بھگو بھگو کر چھانو کے سر پر رکھنے اور ایک دفتی سے ہوا دینے لگا۔ جمعدار صاحب اپنے کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھے۔ چھانو کو غفلت میں دیکھ کر بڑی محبت سے انھوں نے پکارا، "بیٹا ابوالبرکات.... میرا شان.... میرا جان.... چھانو بٹیا.... دیکھو ہم ہیں...." ان کی آواز ضعف اور شدت جذبات کی وجہ سے

کانپ رہی تھی۔ مخلص نے کہا، ''چاچا ابھی نہ بلایئے۔ چھانو میاں کو آرام کرنے دیجیے۔'' اتنے میں جلودھر یوڈی کلون لے کے آ گیا اور مخلص کے حوالے کر کے پھول محمد اور قمیص کو دیکھنے چلا گیا۔ مخلص برابر چھانو کے سر پر یوڈی کلون لگاتا رہا۔ یہاں تک کہ چھانو کا بخار کم ہو گیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جمعدار صاحب نے جھک کے بے اختیار اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ اس پیار میں خدا کا شکر اور مخلص کا شکریہ سمٹ آئے تھے۔ اب جمعدار صاحب نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ چت لیٹ گئے اور دھیرے دھیرے کراہنے لگے۔ ان کی جسمانی حالت ان کے دل کی کیفیت کا عکس تھی، یعنی جلودھر اور مخلص نے انھیں بالکل چت کر دیا تھا۔ کہنے لگے، ''مخلص میاں ہم نے تمھیں اور جلودھر بابو کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ معاف کرنا۔''

مخلص، ''چاچا ہم آپ کی بات کا برا تھوڑی مانتے ہیں۔ دیکھیے ہم کہتے ہیں نا کہ اگر گورنمنٹ کا انتظام ٹھیک ہوتا تو بھلا اس طرح غریب لوگ بے دوا علاج پڑے رہتے۔ گورنمنٹ کو اور دھنی لوگوں کو ہم غریبوں کی کیا پروا۔ دیکھیے اس وقت نہ زمیندار بابو نظر آتے ہیں نہ نگن بابو نہ سرت نہ پنیر میاں۔''

جمعدار صاحب، ''ہاں وہ سب اپنے اپنے مطلب کے ہیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک حرام زادے۔''

مخلص، ''اور دیکھیے مسلم لیگ کے والنٹیر بھی نظر نہیں آتے۔ ابھی صاحب لوگ آ جائیں یا کوئی مسلم لیگی لیڈر تو اللہ اکبر اللہ اکبر مسلم لیگ جندہ باد کے نعروں سے گاؤں گونج اٹھے، لیکن اصل کے وقت کوئی نہیں۔''

جمعدار صاحب کو مسلم لیگ پر اعتراض ذرا برا لگا۔ بولے، ''مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ اس سب کام کے لیے تھوڑی ہیں۔''

مخلص، ''کیوں نہیں ہیں؟ اگر مل کی بھلائی چاہتے تو ضرور ہوتے۔''

جمعدار صاحب، ''یہ دوسری بات ہے۔''

مخلص، ''خیر اسے جانے دیجیے۔ یہ دیکھیے کہ گورنمنٹ نے بھی اب تک کوئی ڈاکٹر واکٹر نہیں بھیجا۔ ہمارا کہنا یہ ہے ہر آدمی کا اچھے سے اچھا علاج مفت ہونا چاہیے۔ سرکار کی طرف سے۔''

جمعدار صاحب، ''ایسا ہو تو پھر کیا بات ہے۔''

مخلص، ''روس میں ایسا ہوتا ہی ہے۔''

جمعدار صاحب، ''ہم تو نہیں دیکھا۔''

مخلص، ''ارے آپ روس کہاں گئے۔''

جمعدار صاحب کی خودی کو ٹھیس لگی۔ بولے، ''ہم سب جگہ گئے ہیں۔''

مخلص سمجھ گیا کہ تردید کرنا مناسب نہیں، بولا، ''تو پھر یہ آپ کے وہاں سے ہو آنے کے بعد کی بات ہے۔''

جمعدار صاحب، ''ہاں ایسا کہو۔''

مخلص، ''غریبوں نے عاجز آ کے امیروں سے حکومت چھین لی اور تب سے ایسا انتظام کیا کہ وہاں کے غریبوں کی حالت یہاں کے امیروں سے اچھی ہو گئی۔''

''تب تو بہت اچھا ہے۔''

''ہم لوگ بھی یہاں ایسا ہی کر سکتے ہیں اگر آپ کے ایسے آدمی مدد کے لیے تیار ہو جائیں۔''

''ہم تیار ہیں۔''

''واہ چاچا'' کہہ کے مخلص نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ''اب دیکھیے گا کہ ہم لوگ ایک دن زمیندار بابو، نگن، ہسرت اور پنیر کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ٹھائیں ٹھائیں گولی مار دیں گے، آپ کا جی چاہے تو آپ ماریے گا۔''

جمعدار صاحب اُٹھ بیٹھے۔ ''ارے ہم تو ان سب کو کچا کھا جائیں، مگر ترس کھا جاتے ہیں۔''

''یہ ہم پر ترس نہیں کھاتے ہم ان پر کیوں کھائیں۔ سانپ کو ڈسنے کا موقع ہی نہ دینا چاہیے اور یہ تو ایسے سانپ ہیں کہ غریبوں کو ہر وقت ڈسا کرتے ہیں۔''

''سچ کہتے ہو بھیا، مگر تم ہی مارنا اب ہم کہاں اپنی عاقبت خراب کریں گے۔''

''چاچا عاقبت کی جانے دیجیے۔ عاقبت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے اسی دنیا کی زندگی ہے، مر گئے تو سب ختم۔''

جمعدار صاحب چکرائے۔ بولے، ''مخلص بھیا تم لوگوں کی یہی سب باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ آخر پھر روح کہاں جاتی ہے۔''

''کہیں نہیں، روح کوئی چیز ہی نہیں۔''

''کیسی بات کر رہے ہو؟ یہ تو بڑے گناہ کی بات ہے، توبہ توبہ۔''

''چاچا آپ بڑی دقیانوسی بات کر رہے ہیں۔ گناہ بھی کوئی چیز نہیں۔''

''ارے کیا کہہ رہے ہو، خدا سے ڈرو۔''

''خدا بھی کوئی چیز نہیں۔''

''توبہ استغفار، بھیا رہنے دو ہمارا سر چکر کھا رہا ہے۔''

مخلص نے سوچا کہ آج کے لیے دوا کی اتنی ہی خوراک کافی ہے۔ بعد میں اور خوراکیں پلا کے جمعدار صاحب کے دل و دماغ سے مذہب کی بیماری کے جراثیم دور کر دیے جائیں گے۔''

۵

پھول محمد بیمار پڑا تو گھر مین کسی نے کوئی خیال نہ کیا۔ جمیر باپ کو اپنے کام اور کلثوم کو اپنے بچوں سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ آج کل عمدہ میاں بھی غیر معمولی طور پر مصروف تھے، اب تک تو وہ دو بچوں کے فرضی باپ بنے پھرتے تھے، مگر اب اس فراخ دلی کا خدا نے انھیں انعام دیا، یعنی وہ بہ یک وقت سچ مچ دو بچوں کے باپ بن گئے۔ عمدہ بیوی واقعی بڑی عمدہ نکلیں۔ انھوں نے دو بچے یک ساتھ

پیدا کر دیے۔ جس میں ایک لڑکا تھا دوسری لڑکی۔ اگر چہ یہ گاؤں کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی اور کئی لوگوں کے بھی جڑواں بچے پیدا ہو چکے تھے، مگر پھر بھی عمدہ میاں کی خوشی قابل دید تھی۔ اس زبردست زچگی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ زبردست دوڑ دھوپ بھی کریں۔ چنانچہ ان کا ایک پاؤں گھر کے اندر رہتا تو ایک باہر۔ جب دیکھیے سرِ افتخار اٹھائے مونچھ کے چند بالوں کو زبردستی تاؤ دیتے ہوئے زمین کے سخت سینے کو اپنے ہلکے پھلکے پاؤں سے روندتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی دائی کے گھر کا چکر ہے کبھی اسپتال کا، کبھی بازار کا، کبھی یہ خرید رہے ہیں کبھی وہ۔ لوگوں کو زبردستی سلام کر کے مبارک بادیں قبول کر رہے ہیں۔ یہاں پھول محمد کا یہ حال تھا کہ گھر کے باہر برآمدے میں جہاں وہ سویا کرتا تھا وہیں ایک گٹھری اوڑھے پڑا رہتا۔ بخار آتا اُتر جاتا۔ نہ کسی کو آنے کی خبر ہوتی نہ اترنے کی۔ اسے سرسام بھی ہو گیا اور کسی کو پتا نہ چلا۔ جب جلودھر آیا تو پھول محمد سرسامی حالت میں کہہ رہا تھا، ''کبڈی کبڈی.... کبڈی.... بڈ بڈ بڈ.... چاچا..... چھانو..... قیمص..... بڈ، بڈ، بڈ۔'' جلودھر نے تالاب سے پانی لا کے فوراً اس کا سر دھلایا۔ یوڈی کلون میں کپڑا بھگو کے دیر تک سر پر رکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ اُس کو ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ جلودھر کو اپنے سرہانے بیٹھا دیکھا، پھول محمد نے اپنے ذہن میں ایک پارٹی قائم کر رکھی تھی جس کے جسم گویا جمعدار صاحب تھے اور روحِ رواں وہ خود۔ جلودھر کو وہ مخالف پارٹی کا آدمی سمجھتا تھا۔ یہ دیکھ کے اسے تکلیف ہوئی کہ جلودھر اس کی تیمارداری کر رہا ہے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ جلودھر بدستور بیٹھا رہا اور سر پر بھیگا ہوا کپڑا رکھتا رہا۔ پھول محمد نے کپڑا ہٹا دیا اور کہا، ''اب ہم اچھے ہیں۔ آپ جایئے۔''

جلودھر نے کہا، ''بھیا آدمی آدمی کے کام آتے ہیں، جمعدار صاحب بے چارے تو بیمار پڑے ہیں۔''

''ان ہی نے ہمیں تمھارے پاس بھیجا ہے۔''

''چاچا نے بھیجا ہے؟''

''اور کیا؟''

''چاچا کی یہی بات تو ہمیں اچھی نہیں لگتی۔''

''کیوں؟''

''اب کیا بتائیں، اپ اپنے گھر جایئے، اب ہم اچھے ہیں۔''

''ہم یہ کہتے ہیں بھیا، کہ ہم غریبوں کا دیکھنے والا کوئی نہیں۔ گورنمنٹ دیکھتی نہیں۔ ہمیں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں۔'' پھول محمد خاموش رہا۔

''اور دیکھو اپنے چچا، جمیر باپ کو، تمھارا باپ مر گیا۔ اس کی زمین دبائے بیٹھا ہے اور اتنا بھی نہیں ہوتا کہ تمھاری دوا درمن کرائے، پنیر میاں کے یہاں کام بھی کرتا ہے، کتنا کماتا ہے۔''

پھول محمد کو برا لگا کہ اس کے چچا پر غیر کیوں اعتراض کرے۔ بولا ''جلودھر بابو ہمارے سر میں درد ہو رہا ہے، آپ گھر جایئے۔''

جلودھر، ''ہم سوچتے ہیں ہم سب مل جائیں تو گاؤں میں ہم لوگوں کا راج ہو جائے اور امیر لوگوں کو مزہ چکھادیں۔ پنیر میاں تو گاؤں چھوڑ کے بھاگیں۔ تم ہمارے بہت کام آسکتے ہو۔''

پھول محمد، ''آپ تو اُن کے نوکر ہیں۔''

جلودھر، ''اس سے کیا ہوتا ہے؟''

''بھیا، اب ہم سوئیں گے۔''

اتنے میں قیمص آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا، وہ لوٹ پوٹ کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

جلودھر نے کہا، ''کمیچ ہم تو تمھیں دیکھنے آرہے تھے۔ تم نے اور کچھ خبر سنی۔ جاپانی بڑھتے آرہے ہیں، مگر ہاں تمھیں تو خبر سننا منع ہے۔ غریب آدمی خبر بھی نہ سنیں، کہیں یہ جان کر کہ دنیا میں اور جگہ کے غریب لوگ کس طرح امیروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں کے لوگ بھی ایسا ہی نہ کرنے لگیں۔''

پھول محمد کھسیا کر، ''جلودھر بابو آپ سے کہہ دیا اب جایئے، ہمارے سر میں بڑا درد ہے۔ اب ہم سوئیں گے۔''

جلودھر اُٹھ کے جانے لگا، ابھی اٹھا ہی تھا کہ میاں عمدہ آ گئے۔

جلودھر نے کہا، ''عمدہ میاں دیکھو بھائی پھول محمد میاں اتنے بیمار ہیں اور تم خبر ہی نہیں لیتے، اپنے ہی بیوی بچوں میں لگے ہو۔''

عمدہ میاں، ''ارے ہم کو تو خبر ہی نہیں ہوئی، کیا ہوا؟''

پھول محمد، ''کچھ نہیں۔''

جلودھر، ''کچھ نہیں کیسے، ان کو بہت بخار ہے۔ جب میں آیا تو بے ہوش تھے۔ بڑی مشکل سے ہوش آیا۔''

عمدہ نے بدن پر ہاتھ رکھا تو جل رہا تھا۔ اس نے کہا، ''ارے بھیا نے بھی خبر نہ لی، چلو ہمارے گھر۔''

پھول محمد کے دل کو تکلیف ہوئی، اس نے کہا، ''نہیں ہم اب اچھے ہیں (جلودھر سے مخاطب ہو کے) اب آپ جائیے۔ ہمیں نیند آ رہی ہے، جلودھر نے پھول محمد کا یہ رنگ دیکھ کے اٹھ کر چلا جانا ہی مناسب سمجھا اور ''اچھا اچھا'' کہہ کے چلا گیا۔

۶

مخلص کے چلے جانے کے بعد جمعدار صاحب بڑی الجھن میں پڑ گئے۔ کبھی اُٹھتے کبھی بیٹھتے کبھی چت لیٹ جاتے، لیکن دماغی الجھن میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور باوجود نقاہت کے وہ مولانا مستنصر باللہ کے پاس اُٹھ کے جانے لگے۔ بی بی جان نے کہا، ''کہاں جا رہے ہو؟''

بولے، ''کہیں نہیں، ابھی آتے ہیں۔''

''سنا ہے گیدو کی ماں بیمار ہے، اس کے پاس کچھ کھانے کو نہیں، کچھ بھجوا دو۔''

جمعدار صاحب کھسیا کے بولے، ''یہاں ہم خود مر رہے ہیں، تمھیں گیدو کی ماں ہی کی پڑی

ہے" اور باہر چلے گئے۔ دیکھا کہ مولانا مستنصر باللہ کے پاس ایک نورانی صورت کے بزرگ تشریف فرما ہیں اور مولانا بڑے ادب سے ہاتھ باندھے، نگاہیں نیچی کیے دو زانو بیٹھے ہیں۔ جمعدار صاحب نے ان بزرگ کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، مگر سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو کوئی بہت پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ لہٰذا خود بھی بہت زیادہ مؤدب ہو کے بیٹھ گئے۔ مولانا نے اپنے پیر صاحب سے اُن کا تعارف کرایا، جمعدار صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا کے پیر و مرشد ہیں تو وہ سراپا عجز و نیاز بن گئے اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ جون پور کے ہیں تو بے اختیار قدم چومنے کے لیے بڑھے، مگر پیر صاحب نے روک دیا۔ جمعدار صاحب اپنی جگہ پر واپس چلے گئے اور پہلے سے بھی زیادہ مؤدّب ہو گئے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں اور کیسے کہیں۔ بڑی کوشش کے بعد ذہن میں ایک جملہ ترتیب دے پائے اور ڈرتے ڈرتے بولے،

"حضور کا مزاج تو اللہ کا فضل ہے۔"

پیر صاحب، "خدا کا شکر ہے، آپ کا مزاج کیسا ہے، آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔"

پیر صاحب کے جواب نے جمعدار صاحب کو موقع دیا۔ ذرا رک کے بولے، "جی حضور، میں ذرا پریشان ہیں۔ آپ سے ایک بات پوچھنا مانگتے ہیں...."

"فرمایئے۔"

"جلودھر.... مولانا صاحب جانتا ہے.... کافر ہے..... اس سے بھی ایک برا چیز ہوتا ہے.... میں نام بھول گئے۔ وہ ہے، وہ مخلص کو بھی اپنی طرح بنالیا ہے۔ آج دونوں آ کے میرے..... صاحب زادے..... ابوالبرکات.... کا دیر تک دیکھ بھال کیا..... اس کو بہت بخار تھا۔ سر پر پانی رکھا.... مگر کوئی ہمارا مسلمان بھائی ایسا نہیں کیا.... کا ہے؟"

پیر صاحب، "انھوں نے اچھا کام کیا، مسلمانوں کا سا— مسلمان بھائیوں نے برا کیا مسلمانوں کی شان کے خلاف۔"

جمعدار صاحب، "مگر حضور..... وہ لوگ تو بولتا ہے.... روح کچھ نہیں..... گناہ ثواب کچھ

نہیں۔ نعوذ باللہ.....اللہ بھی کچھ نہیں.....اور پھر بھی اچھا کام کرتا ہے اور ہم.....ہم لوگ سب کچھ مانتا ہے پھر اچھا کام نہیں کرتا۔''

پیر صاحب، استغفر اللہ، مگر آپ کا اس سے مطلب کیا ہے؟''

''مطلب کچھ نہیں.....بس.....میں پریشان ہیں۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں، غور سے دیکھیے تو ہم میں ان میں فرق کیا ہے۔ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ خدا کو مانتے ہیں، لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟ اگر ہم سچ مچ خدا کو مانتے تو یہ سمجھتے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ سب خدا دیکھتا ہے، اس لیے کوئی بات ایسی نہ کریں جو اس کے حکم یا مرضی کے خلاف ہو، بلکہ ایسی باتیں کریں جس سے وہ خوش ہو، ہم جو ایسا نہیں کرتے تو اس کے یہی معنی ہوئے نا کہ ہم زبان سے چاہے کچھ کہیں، لیکن دل سے یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی ہمارا پیدا کرنے والا اور مارنے والا بھی ہے، جس کے آگے ہمیں ایک دن اپنے اعمال کا جواب دینا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ یا تو ہم اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں یا منافقت کر رہے ہیں، تو جہاں تک خدا کو ماننے نہ ماننے کا تعلق ہے، ہم میں ان میں کوئی خاص فرق نہیں۔''

جمعدار صاحب بڑے غور سے سنتے رہے۔ پیر صاحب کا ایک ایک حرف ان کے دل میں اُترا جا رہا تھا۔ اب جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جلودھر اور مخلص ان سے اچھے انسان ہیں۔ کم سے کم منافقت تو نہیں کرتے۔ ان کو اپنی گزشتہ زندگی مکر و فریب کا ایک سراب نظر آنے لگی۔ ان پر ایک مبہم سا خوف طاری ہونے لگا۔ پسینہ چھوٹنے لگا۔ رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اپنی حالت کو وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں صرف ''جی حضور'' کہہ کے ظاہر کر سکے۔ دوسرے لفظ نہ ان کے خیال میں آئے نہ زبان پر۔

پیر صاحب، ''ایک بات یہ بھی ہے کہ جو لوگ زبان سے اقرار کرتے ہیں رہتے ہیں، ان کے لیے ایک دن دل سے بھی اقرار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اب رہا نیک کام کرنے کا سوال، تو وہ آدمی طبیعت کے تقاضے سے بھی کر سکتا ہے یا کسی مقصد کے لیے، جلودھر اور مخلص کے پاس ایک مقصد

ہے، اپنی پارٹی کے اثر کو بڑھانا، اپنے خیالات کو پھیلانا، جب مسلمانوں کے پاس بھی ایک مقصد تھا جو جلودھر اور مخلص کی پارٹی کے مقصد سے کہیں بڑا تھا تو اس وقت کی اور ہی بات تھی۔ انھوں نے جیسے جیسے بڑے کام کیے اور جیسے جیسے بڑے لوگ پیدا کیے ویسے دنیا کی کسی اور قوم نے اب تک نہیں کیے۔ دور کیوں جائیے یہی دیکھیے کہ یہاں بنگال میں کتنے مسلمان ہیں، اتنے کہ دنیا میں کہیں اور نہیں، آخر انھیں کس نے مسلمان بنایا۔ یہ ہمارے ان بزرگوں کا کام ہے جو گھربار چھوڑ کر سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھا کے یہاں محض خدا کا نام پھیلانے کے لیے آئے۔ ان بزرگوں میں سوائے چند ایک کے کسی کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، کیا یہ لوگ ذاتی نام و نمود کے لیے کام کرتے تھے؟ نہیں، بلکہ خدا کی خوشنودی کے لیے۔ یہی سچے مسلمان کی شان تھی۔"

جمعدار صاحب حیرت سے پیر صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کی ڈھارس بندھ رہی تھی۔ طوفان چھٹ رہا تھا۔ بادِ مراد چلنے لگی تھی۔

پیر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے، لیکن ان کی نگاہیں جمعدار صاحب پر گڑی رہیں۔ پھر انھوں نے ایک خاص توجہ سے دیکھ کے کہا، "اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں میں کچھ خدا کے بندے ایسے مل جائیں گے جن سے اچھے انسان کسی اور قوم میں نہ ہوں گے۔ اگر چاہیں تو آپ خود ویسے ہی ہو سکتے ہیں۔"

جمعدار صاحب کے دل و دماغ کی ڈوبتی ہوئی کشتی ابھر آئی۔ جیسے کسی نے مضبوط ہاتھوں سے کھینچ کر اسے کنارے پر لگا دیا ہو۔ باوجود جسمانی ضعف اور نقاہت کے انھیں روح میں ایک توانائی محسوس ہونے لگی اور اس توانائی میں ایک خاص قسم کی لذت، وہ آئے تو تھے کراہتے اور لڑکھڑاتے، لیکن اٹھے سپاہیانہ انداز سے۔ پہلے نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اب اٹھی ہوئی۔ پہلے زمین دوز تھیں اب فلک شگاف۔ جمعدار صاحب مضبوط قدموں اور مسکراتے چہرے کے ساتھ لوٹے، سامنے موتی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پاس کچھ کھانے کو نہ تھا۔ جمعدار صاحب خود اپنے ہاتھ سے پوال اُٹھا کے لائے۔ قیس نے دیکھا تو دوڑا، جمعدار صاحب نے بڑی نرمی سے کہا، "قیس بچہ تمھاری طبیعت اچھی نہیں ہے۔

ابھی آرام کرو۔'' قیس کو جمعدار صاحب کے لہجے اور طرزِ عمل میں کچھ نئی بات معلوم ہوئی جسے وہ سمجھ نہ سکا، جمعدار صاحب گھر میں داخل ہو کے سیدھے بی بی جان کے پاس گئے۔ دیکھا انھیں بدستور بخار ہے، انھیں یکایک گیدو کی ماں کا خیال آیا۔ بی بی جان سے بولے، ''ارے سنتی ہو، تم گیدو کی ماں کو کچھ بھیجنے کو کہہ رہی تھیں؟''

''کہہ تو رہی تھی، مگر تم نے کچھ سنا ہی نہیں۔''

''اس وقت میں بہت پریشان تھے۔ کچھ گھر میں ہو تو دے آؤں۔''

''خود کیا جاؤ گے تمھاری طبیعت آپ اچھی نہیں ہے۔ بھجوا دو۔''

''بتاؤ تو۔''

''ہے تو کیا، دھان چاول سب ختم ہو رہا ہے۔ تم نے تو کتنا بیچ ڈالا۔ تھوڑا سا ہوگا، مٹکے میں رکھا ہے۔ اچھا اُٹھ کے نکال دیتی ہوں۔''

''نہیں ہم خود نکال لیں گے، تم تو ہم سے بھی کمزور ہو۔''

یہ کہہ کے جمعدار صاحب مٹکے پاس گئے، اس میں چار پانچ سیر چاول تھے، ایک ٹوکری میں آدھا نکال لیا۔ چپکے سے اپنی دوا کی شیشی بھی اٹھا لی۔ اس طرح کہ بی بی جان کو کچھ خبر نہ ہو اور گیدو کی ماں کے گھر گئے۔ گیدو کی ماں پڑی کراہ رہی تھی۔ جمعدار صاحب کو دیکھ کے وہ گڑبڑا کے اٹھنے لگی۔ جمعدار صاحب نے بہت منع کیا، مگر وہ کسی نہ کسی طرح اُٹھ ہی گئی۔

جمعدار صاحب نے پہلے ایک خوراک دوا پلائی پھر چاول دیا اور شیشی اس کے پاس چھوڑ کے چلے آئے۔ واپسی میں انھیں خیال آیا کہ اسے دوا کون پلائے گا، چاول وہ کیسے پکائے گی، انھیں چاند شیخ کی بیوہ کا خیال آیا۔ اس کے ہاں گئے۔ وہ جمعدار صاحب کو دیکھ کے ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''ہاجرہ بی بی، گیدو کی ماں بہت بیمار ہے، بے چاری کا کوئی دیکھنے والا نہیں۔ تم نہ ہو کچھ دن اس کے پاس رہو۔ اس کی دیکھ بھال کرو۔ خدا تمھیں اس کا نیک بدلہ دے گا۔ ہم سے بھی جو ہو سکے گا تمھاری مدد کریں گے۔ لو یہ ایک روپیا۔''

ہاجرہ جمعدار صاحب کے نرم لہجے سے پسیج گئی اور وہ اسے گیدو کی ماں کے پاس پہنچا آئے۔ گھر واپس آئے تو بی بی جان کو بدستور بخار تھا۔ اور وہ بے چین سی تھیں۔ جمعدار صاحب نے انھیں پانی پلایا اور باوجود سخت منع کرنے کے ان کا سر بھی دھلایا۔

بی بی جان نے کہا، ''مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ تم میری اس طرح خدمت کرو گیدو کی ماں کی تو طبیعت خراب ہے، ہاجرہ ہی کو بلا دو۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''میں تمھارے کام نہ آؤں گا تو کون آئے گا۔''

بی بی جان، ''بس رہنے دو ہاجرہ کو بلا دو۔''

''نہیں، اسے کیا بلاؤں، اچھا نہیں لگتا۔''

''آخر کیوں؟'' جمعدار صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ ان کے اندر کسی نئی چیز نے انھیں یہ کہنے سے روک دیا کہ وہ ہاجرہ کو گیدو کی ماں کی خدمت کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔

۷

رات کو لیٹے لیٹے جمعدار صاحب کو ہری منڈل کے کھیت کا خیال آیا جس پر وہ اپنا قبضۂ مخالفانہ جمائے بیٹھے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی ان کی نیند اڑ گئی۔ کروٹیں بدلتے رہے۔ انھوں نے بی بی جان سے پکار کر کہا، ''سو رہی ہو؟'' بی بی جان کی نیند کتے بلی کی نیند تھی۔ انھوں نے جواب دیا، ''کیا ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے؟ پانی پیو گے؟ پیشاب لگا ہے؟'' جب سے جمعدار صاحب بیمار پڑے تھے۔ بی بی جان انھیں اکثر پیشاب کرانے لے جاتیں، اسی طرح جس طرح کبھی گیدو کی ماں گیدو کے باپ کو لے جایا کرتی تھی۔ جمعدار صاحب نے جواب دیا، ''نہیں، ذرا سنو۔ اچھا ہمیں آتے ہیں، تمھاری طبیعت اچھی نہیں۔''

بی بی جان نے کہا، ''نہیں میں اچھی ہوں'' اور اپنی چوکی سے اُٹھ کر جمعدار صاحب کی چوکی پر آ کے بیٹھ گئیں۔

جمعدار صاحب نے کہا، ''وہ کھیرے کھنڈے کا کھیت....''

بی بی جان، ''میں نے تو خود کئی بار پوچھا تھا، مگر تم ٹال گئے، کیا بات ہے۔''

جمعدار صاحب، ''کیا بتائیں.....وہ ہمارا کھیت نہیں۔''

''میں تو کہتی ہی تھی، کیا کسی دوسرے کے کھیت سے تم لاتے رہے ہو۔''

''ہاں ایسا ہی سمجھو۔''

''یہ تو تم نے بڑا برا کیا۔''

''ہاں، مگر ہم کسی دوسرے کے کھیت میں نہیں گئے۔ دوسرے کا کھیت ہمارے پاس آ گیا۔''

''کیسے؟''

''طوفان بہالایا تھا۔''

''تمھیں مالک کا پتا نہیں چلا؟''

''وہ خود لینے کو آیا تھا۔''

''پھر؟''

''ہم نے نہیں دیا۔''

''کیوں؟''

''خود غرضی....''

''تم نے حرام مال کھایا، میرا جی متلا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے قے کر ڈالوں۔''

''میرا بھی یہی جی چاہ رہا ہے۔''

''تمھیں کیا ہو گیا تھا۔ تم تو ایسے نہ تھے۔''

''بی بی جان ایسا نہ کہو، تم مجھے جیسا آدمی سمجھتی ہو ویسا نہیں ہوں۔ میں تمھارے قابل نہیں۔''

''ایسی بات نہ کرو، میں گناہ گار خود تمھارے قابل نہیں (تھوڑے وقفے کے بعد) مالک کا نام ٹھکانا معلوم ہے؟''

''ہاں لوہا گاڑا کا ہری منڈل۔''

''تو پھر جاکے واپس کرآؤ۔ ہم نے اُس کا حق مارا ہے..... بندے کا حق تو خدا بھی معاف نہیں کرتا۔ بندہ ہی معاف کرے تو کرے۔ اب تک جتنا ہم لوگوں نے کھایا ہے اس کی قیمت دے کے اس سے قصور معاف کراؤ۔''

''یہ تو ٹھیک ہے، مگر ایک بات اور بھی ہے، اس نے پنچایت میں نالش کی ہے۔ پنچایت نے ہمیں بلایا تھا۔ ہم نہیں گئے۔ اب جاکر کھیت واپس کریں گے، اور معافی مانگیں گے تو وہ یہی سمجھے گا کہ ڈر گئے۔ بڑی بھد ہوگی۔''

''ہونے دو، عاقبت تو خراب نہ ہوگی۔''

(تھوڑا سوچ کے) ''سچ کہتی ہو..... مگر ایک بات اور بھی ہے..... ہری منڈل اچھوت تو ہے، لیکن جس طرح اور اچھوت مسلمانوں کے ساتھ ہیں، اس طرح وہ نہیں ہے۔ مہا سبھائی ہے جو مسلمانوں کے دشمن ہیں۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے..... تم نے اس کا حق مارا ہے تم اس کے بھی گناہ گار ہو اور خدا کے بھی۔''

جمعدار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

بی بی جان نے کہا، ''تم جب تک اس کا کھیت واپس نہ کرآؤ گے اور اس سے قصور معاف نہ کراؤ گے میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی، فاقہ کرکے مر جاؤں گی۔''

جمعدار صاحب اُٹھ بیٹھے، انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی پیر مرشد نے اپنے گمراہ مرید کو سیدھا راستہ دکھا دیا۔ کہنا تو بہت کچھ چاہتے تھے، لیکن صرف اتنا ہی کہہ سکے کہ ''بی بی جان تم تو جنت کی حور ہو۔'' اس ایک جملے میں روحانی انبساط، شکریہ اور مریدانہ عقیدت مندی کے جذبات سمٹ

آئے تھے۔

تہجد کا وقت آ گیا تھا۔ جمعدار صاحب نے بہت دنوں کے بعد تہجد کی نماز پڑھی۔ بی بی جان پانچ وقت کی نماز پڑھتیں، لیکن تہجد نہ پڑھتیں۔ آج انھوں نے بھی پڑھی۔ دونوں کا یہ حال تھا کہ نہ محض سر سجدے میں تھا، بلکہ دل بھی۔ جس وقت میاں بیوی نماز پڑھ کے اٹھے اس وقت دونوں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ تہجد کے بعد ہی جمعدار صاحب گھر سے باہر نکلے، ہری منڈل کے کھیت میں پہنچے اور اُسے کھول کے کھینے لگے۔ کھیت کا وزن بہت زیادہ تھا اور کم از کم دو کھینے والوں کی ضرورت تھی، مگر جمعدار صاحب ذوق شوق کے عالم میں کھیتے چلے جا رہے تھے۔ فجر کی نماز بھی انھوں نے کھیت ہی میں پڑھی۔ ہری منڈل کے گھر نو بجے پہنچے۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جمعدار صاحب اس کے انتظار میں کھڑے رہے۔ جب وہ واپس آیا تو انھوں نے اس کا کھیت اسے بڑی لجاجت کے ساتھ واپس کیا۔ وہ مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو، آخر سیدھے ہوئے نا۔ جمعدار صاحب نے اس طنزیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا اور اس سے دریافت کیا کہ اتنے دنوں جو کھیت ان کے پاس رہا تو اس کا کتنا نقصان ہوا ہوگا۔ اُسے تو کھیت ملنے کی بھی امید نہ تھی تاوان درکنار، وہ جمعدار صاحب کے سوال پر چونک پڑا۔ جمعدار صاحب نے بڑی سنجیدگی سے پھر پوچھا، اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ جمعدار صاحب نے خود حساب لگایا۔ ان کے حساب سے ان پھلوں کی قیمت جو انھوں نے استعمال کیے تھے، قریب تیس پینتیس روپے کی ہوتی تھی۔ انھوں نے احتیاطاً اُسے پچاس کر دیا۔ روپیا کہاں تھا جو دیتے، ایک کھیت رہ گیا تھا۔ اسے ہر منڈل کو سال بھر کے لیے بطور رہن بالقبض کے حوالے کیا۔ ہری منڈل منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی۔ البتہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جمعدار صاحب نہ محض بزدل ہیں، بلکہ بیوقوف بھی۔

جمعدار صاحب واپس گئے تو دیکھا پھول محمد کھڑا ہے، جمعدار صاحب کو دیکھ کے کہنے لگا،

''چاچا کہاں گئے تھے۔ ہم اتنی دیر سے پریشان ہیں، دیکھیے ہری منڈل کھیت چرا لے گیا۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''نہیں بچہ چور تو ہم تھے، ہم اس کا کھیت واپس کر آئے۔''

پھول محمد نے پہلے تو ''ارے'' کہا پھر اتنا خوش ہوا کہ باوجود نقاہت کے قلابازیاں کھانے لگا۔

اس کا بخار کل شام ہی کو اترا تھا۔ صبح کو اٹھا تو اس کا جی گھبرا رہا تھا۔ جمعدار صاحب کے ہاں جی بہلانے آیا تھا، چلنے پھرنے اور قلابازیوں کی وجہ سے اسے چکرانے لگا اور چپکا پڑ رہا۔

جمعدار صاحب، ''بچہ طبیعت کیسی ہے؟''

پھول محمد نے کہا، ''چاچا ہم بہت خوش ہیں، مارے خوشی کے تھک گئے۔''

جمعدار صاحب مسکراتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔

☯......☯......☯

چھٹا باب

ابھی تک گھروں سے کراہنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اب رونے پیٹنے کی بھی آنے لگیں۔ ایک رات کو دو بجے کے قریب پھول محمد کو خواب میں ایسا محسوس ہوا کہ اس کی چچی کلثوم بی بی چیخ رہی ہے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ چیخ کے اٹھ بیٹھا۔ سچ مچ گھر کے اندر کہرام مچا ہوا تھا۔ گرتا پڑتا اندر گیا۔ چچی اپنے بال نوچے جارہی تھی۔ سامنے اس کی تین سال کی بچی اینٹھی پڑی تھی، عمدہ بی بی بھی کھڑی رو رہی تھی۔ ججیر باپ ڈاکٹر کو بلانے گیا تھا۔ جب اس کے آنے میں دیر ہوئی تو عمدہ میاں بھی گیا۔ تھوڑی دیر میں ججیر باپ ابھے بابو کو لیے واپس آیا۔ پیچھے پیچھے عمدہ میاں بھی تھا۔ ابھے بابو نے دیکھ کے بتایا کہ بچی مر چکی ہے۔ یہ سن کر کلثوم بی بی پچھاڑیں کھانے لگی۔ ججیر باپ بھی بلند آواز سے رونے لگا، اور عمدہ میاں بھی، بلکہ عمدہ میاں کی آواز زیادہ بلند تھی۔ پھول محمد کے بھی آنسو نکل آئے۔ ابھے بابو نے فیس کا مطالبہ کیا۔ پھول محمد نے حیرت سے دیکھ کے کہا، فیس کاہے کی، مگر ابھے بابو بغیر فیس لیے نہ ٹلے۔ روتے دھوتے صبح ہوگئی۔ ججیر باپ کفن دفن کے لیے روپے کا انتظام کرنے کے لیے نکلا۔ پنیر میاں شہر گئے تھے۔ سرت ساہا نے قرض دینے سے انکار کر دیا۔ نگن بابو بھی تال مٹول کرنے لگے۔ زمیندار بابو تک رسائی نہ ہوسکی۔ منہ لٹکائے ہوئے خالی ہاتھ واپس ہوا۔ عمدہ میاں کو پتا چلا تو اس نے پانچ روپے دیے۔ ابھی وہ روپیا دے ہی رہا تھا کہ جمعدار صاحب آگئے۔ پیچھے پیچھے اوڑھے لپیٹے بی بی جان بھی تھیں۔ ان کا اس طرح آنا نئی بات تھی۔ انھوں نے گھر میں جا کر کلثوم بی بی کو تسلی و تشفی دی۔ جمعدار صاحب کو جب روپے کی تنگی کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اطمینان دلایا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، سب انتظام ہو جائے گا۔ چپکے سے انھوں نے تھوڑا سا اور پٹ سن بیچا اور بچی کی تجہیز و تکفین کرائی۔ ابھی اس کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ عمدہ میاں کا اپنا بچہ چل بسا۔ وہ بچے کی ماں سے بھی زیادہ

پچھاڑیں کھانے لگے۔ جتنا لوگ سمجھاتے وہ اتنا ہی زیادہ روتے پیٹتے ،خوب بین کر کر کے، اس بچے کے کفن دفن کے اخراجات میں بھی جمعدار صاحب نے خاموشی سے مدد کی۔ جب پھول محمد کو پتا چلا تو اُسے بڑی تکلیف ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جو روپیا انھوں نے اس کے بھتیجے بھتیجی کی تجہیز و تکفین پر خرچ کیا ہے وہ گویا اس پر بطور قرض کے ہے۔

گاؤں کے لوگ زمیندار بابو کی خدمت میں حاضر ہوئے، دوا اور من کے انتظام کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے میں جلودھر پیش پیش تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ زمیندار بابو کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ زمیندار بابو نے کچھ تو رحم دلی کی وجہ سے اور کچھ خاندانی روایات کا بھرم قائم رکھنے کے لیے پچاس روپے دینے کا وعدہ کیا، مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔

اس دوران میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی طرف سے سینٹری انسپکٹر ابیناش بابو کچھ 'میپا کرین' کی گولیاں اور کچھ خشک دودھ کے ڈبے لے کے پہنچ گئے اور پنیر میاں کے یہاں ٹھہرے۔

بات تو تھی مفت تقسیم کرنے کی، مگر لوگ تھے کہ گولیوں کے خریدنے کے لیے بے قرار نظر آ رہے تھے۔ بھلا ابیناش بابو ان کی دل شکنی کیسے کرتے، ایک آنہ دو آنے۔ چار آنے آٹھ آنے فی گولی کے حساب سے انھوں نے بیچنا شروع کر دیا۔ جیسا بیمار ویسا دام، ڈبے کا دودھ بھی امیر لوگوں کے یہاں قیمتاً پہنچنے لگا۔ پنیر میاں کو البتہ مفت ملتا، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ابیناش بابو کی آمدنی میں پنیر میاں کا بھی حصہ ہے۔ جلودھر نے مجید صاحب کو تفصیلی رپورٹ لکھ کے بھیج دی۔ ایک دن دیکھتا کیا ہے کہ مجید صاحب بلا علم و اطلاع چلے آ رہے ہیں۔ صاحب کے گھر کے لوگوں نے خود گھر گھر جا کے تیمارداری کی۔ مریضوں کا سر دھلایا۔ انھیں دوا کھلائی۔ ڈبے کا دودھ بنا کے پلایا، لوگوں کو بڑا اچنبھا ہوا۔ جمعدار صاحب بڑے خوش ہوئے۔ سینٹری انسپکٹر کی قلعی کھل گئی۔ اس نے بڑی معافی مانگی، مگر صاحب نے معاف نہیں کیا اور اس کی خلاف تادیبی کارروائی شروع کی۔ صاحب نے گولیوں اور دودھ کی تقسیم کے لیے گاؤں میں دو مرکز قائم کیے۔ ایک نگن بابو کے یہاں جو یونین بورڈ کے پریزیڈنٹ تھے۔ دوسرا جمعدار صاحب کے گھر پر۔ پنیر میاں اب چونکہ ایم ایل اے تھے، اس لیے ان کا

خیال تھا کہ یہ کام سوائے ان کے اور کسی کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایسا نہ ہوا تو ان کی شکایتیں مجید صاحب کے خلاف اور بڑھ گئیں۔ جلودھر یہ سمجھتا تھا کہ اگر پنیر میاں کے ہاں مرکز قائم ہوا تو اس کے چلانے کی ذمے داری اسی پر عائد ہوگی، اور اس طرح لوگوں میں کام کرنے کا اسے اور موقع ملے گا۔ مجید صاحب نے یہ موقع بھی اس سے چھین لیا۔ واقعی بڑے بڑے آدمی ہیں، بغیر انھیں نکلوائے کام نہ چلے گا۔ اب دوا اور دودھ؛ واقعی مفت تقسیم ہونے لگے۔ کم سے کم جمعدار صاحب کے گھر سے جمعدار صاحب خود دودھ تیار کرتے اور خود بانٹتے۔ وہ اس دودھ میں سے چھانو تک کو نہ دیتے۔ اینا ش بابو کی یوں تو مجید صاحب کے خلاف کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی، مگر اس نے دیکھا کہ پنیر میاں اور جلودھر کی قیادت میں ایک محاذ قائم ہو رہا ہے۔ اس لیے وہ بھی اس میں شریک ہو گیا۔ پنیر میاں نے ایک گم نام خط لکھ کے وزرا اور حکام بالا کے نام بھجوا دیا کہ سینٹری انسپکٹر سے صاحب کا آدھا ساجھا ہے۔ پھر ایک سینٹری انسپکٹر سے صاحب کے نام لکھوایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ غریبوں کی حالت دیکھ کے اس کا دل اتنا پسیج گیا ہے کہ اب وہ قیمتاً دودھ اور گولیاں بیچ نہ سکے گا، اس لیے صاحب کو بھی حصہ دینے سے قاصر ہے۔ اس خط کی تاریخ صاحب کے وہاں پہنچنے کے ایک دن پہلے کی ڈالی۔ خط پڑھ کے صاحب کا خون کھولنے لگا۔ ابھی وہ فیصلہ نہ کر سکے تھے کہ اس گستاخی کی کیا سزا دیں کہ انھیں ایک اور خط ملا جس میں گزشتہ خط کا حوالہ دے کے لکھا تھا کہ جو تادیبی کارروائی صاحب کر رہے ہیں وہ ذاتی عناد کی بنا پر ہے اور محض اس وجہ سے کہ اس نے صاحب کے لیے غریبوں کا مزید خون چوسنے سے انکار کر دیا ہے، اس لیے اگر انھوں نے تادیبی کارروائی منسوخ نہ کی تو مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ اپنی مدافعت میں کچا چٹھا بیان کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ صاحب کے غصے اور نفرت کی کوئی انتہا نہ رہی اور بجائے بزدلی سے تادیبی کارروائی ختم کرنے کے انھوں نے اسے اور شدت سے چلانے کا فیصلہ کیا۔

۳

کچھ تو مپا کرین اور دودھ کی معقول تقسیم کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ ملیریا کے جراثیم

نے لوگوں کے جسم میں اپنے مدمقابل آپ پیدا کر لیے تھے۔ بیماری کا زور کم ہوگیا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے اثرات چھوڑ گئی ہے۔ پھولے ہوئے چہرے اور سوجے ہوئے ہاتھ پاؤں جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی ملیریا کی وبا جب آتی تھی تو ایسا ہوا کرتا تھا، مگر اس وقت پیٹ بھی پھولا کرتے تھے جسے تلی بڑھنے کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔ اب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ پیٹ دھنسے ہوئے تھے اور اتفاق ایسا کہ انھی کے پیٹ دھنسے تھے جن کے یہاں فاقہ پڑ رہا تھا، لوہا گاڑا میں ملیریا کا اتنا زور نہ ہوا تھا، مگر وہاں کے لوگوں کا بھی وہی حال تھا۔ کچھ پھولے ہوئے پیٹ کے مریض بھی ضرور تھے خاص کر بچوں میں، مگر وہ زیادہ تر پرانے روگی تھے۔ اس وبا کے شروع ہونے سے پہلے بھی ان کی یہی حالت تھی۔ زمیندار بابو نگن سرت اور پنیر میاں کو اس نئے قسم کے ملیریا میں بھگوان کی لیلا یا خدا کی قدرت نظر آتی تھی، مگر اس لیلا کو دیکھ دیکھ کے اور اس کا ذکر سن سن کے انھیں وحشت ہوتی تھی۔ کچھ لوگ دبی زبان سے کہہ رہے تھے کہ کال پڑ رہا ہے، کال کے لفظ سے سب ڈرتے تھے، مگر یہ چیز ہوتی کیا ہے اس کا علم کسی کو نہ تھا، اور ہوتا بھی کیسے؟ کسی نے پہلے دیکھا بھی تو نہ تھا۔ بڑے بوڑھوں نے بھی اپنے بڑے بوڑھوں تک سے اس کا ذکر نہ سنا تھا۔ بھلا بنگال اور کال؟ یہ ہریالی، یہ شادابی اور یہاں انسان بھوکوں مرے؟ اس لیے جب کال پڑنے کا ذکر ہوتا تو پنیر میاں وغیرہ کا غصہ حق بجانب ہوتا۔ ابھی اس نئی قسم کی بیماری اور اس کی نوعیت پر غور وخوض ہو ہی رہا تھا کہ موت کی خبریں بھی آنے لگیں۔ لوہا گاڑا میں ایک بھیک مانگنے والی بوڑھیا جس کے ہاتھ پاؤں چہرہ معمول سے زیادہ سوج گئے تھے۔ صبح کو سرِ راہ مری ہوئی ملی، اس کا پیٹ اتنا دھنس گیا تھا کہ پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ جیسے پیٹ میں انتڑیاں ہی نہ ہوں۔ یہ عجیب بیماری تھی کہ انتڑیوں تک کو کھا جاتی تھی، پنیر میاں کے ہاں اچھے بابو بلائے گئے۔ مشورے میں اینا ش بابو سینٹری انسپکٹر، سرت اور نگن بھی شریک تھے، سبھی ایک سے ایک بجھکڑ تھے، مگر لال بجھکڑ اچھے بابو ہی نکلے، ان کی رائے تھی کہ ہو نہ ہو یہ بیماری ہی ہے اور نہایت موذی قسم کی۔ ان کے تجربے میں زیادہ تو نہیں، مگر دو تین کیس پہلے بھی آ چکے تھے۔ تین چار سال آ گئے۔ دو ایک ان کے علاج سے اچھے بھی ہو گئے تھے اور دو ایک جن کا مرض بڑھ گیا تھا۔ بہت دوا علاج کرنے

پر بھی مر گئے۔ اس موذی مرض کی دوا ظاہر ہے کہ مہنگی ہوگی۔ عموماً دو تین روپے شیشی سے کم میں تیار نہیں ہوتی، مگر ابھے بابو ڈیڑھ دو روپے تک میں ایک شیشی دے سکیں گے۔ اس وقت اتفاق سے ان کے پاس روپے کی کمی ہو گئی تھی۔ انھیں حال میں کچھ کھیت خریدنے پڑ گئے تھے جس میں ایک کھیت جمعدار صاحب کا بھی تھا۔ الغرض دوا منگانے کے لیے انھیں روپے کی ضرورت تھی۔ سو پچاس میں کام چل جائے گا۔ پنیر میاں، نگن، سرت نے ابھے بابو کو مشورے کے لیے بلایا تھا۔ روپے مانگنے کے لیے تو نہیں، مگر ابھے بابو نے وہی رائے دی تھی جو یہ لوگ چاہتے تھے، یعنی کال نہیں پڑ رہا ہے، بلکہ بیماری پھیل رہی ہے۔ آخر اس رائے کی بھی تو کوئی قیمت تھی اور جب ان کی تشخیص کے مطابق یہ بیماری قرار پائی تو پھر اس کی دوا کیوں نہ منگائی جاتی، الغرض پچاس تو نہیں، مگر بیس ضرور اُن کی نذر کرنے پڑے، اس بیس میں دس پنیر میاں کے تھے، اور پانچ پانچ نگن اور سرت کے۔

۴

اگر چہ یہ مرض بہت غریب نواز واقع ہوا تھا، یعنی غریبوں ہی کو ہو رہا تھا، تاہم پنیر میاں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ فوراً سے پیشتر شہر چلے جائیں، آخر مرض ہی تو ٹھہرا کون جانے کب ارادہ بدل دے اور امیروں پر بھی عنایت کرنے لگے۔ وہ اب تک ہفتے میں چار پانچ دن شہر میں رہتے تھے اور دو تین دن گاؤں میں، مگر اب وہاں کچھ دنوں کے لیے چلے جانا انھیں مناسب معلوم ہوا۔ پنیر میاں تو شہر چلے گئے۔ وہ وکالت ہی وہاں کرتے تھے، مگر سرت نگن وغیرہ کیسے جا سکتے تھے، انھیں تو گھوڑا مارا ہی میں جینا مرنا تھا، جلودھر اور مخلص نے کھلے بندوں کہنا شروع کیا کہ امیر لوگ بیماری کہہ کے اصل حالت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہیں تا کہ ان پر الزام نہ آئے، مگر سچ بات یہ ہے کہ بیماری اماری کچھ نہیں، لوگ بھوکوں مر رہے ہیں اور کال پڑ رہا ہے، اس وقت جن جن لوگوں کے پاس غلہ ہے اُن کا فرض ہے کہ بجائے چھپا کر رکھنے کے بھوکوں کو مفت دیں یا کم سے کم سستے داموں بیچیں۔ سرت بابو کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا، غصہ اتنا تیز تھا کہ اس میں گھبراہٹ چھپ گئی تھی یا شاید چھپی ہوئی گھبراہٹ ہی نے غصہ تیز

کر دیا تھا۔ وہ فوراً نگن بابو کے پاس گئے اور انھیں صورتِ حال سے مطلع کیا۔ نگن بابو کو بھی بہت غصہ آیا، جس دن کے لیے اتنی تیاریاں کی تھیں اور اتنا روپیا لگایا تھا وہ آ پہنچا تھا۔ روپیا کمانے کا یہی وقت تھا، چند مہینوں میں اتنا منافع ہو جائے گا کہ ان لوگوں کا شمار بڑے مہاجنوں میں ہونے لگے گا، مگر یہ فتنہ پرداز ان کی ساری امیدوں کو خاک میں ملانا چاہتے تھے۔ آخر کس حق سے؟ خود روپیا لگایا ہوتا تو پتا چلتا، بدمعاش کہیں کے، لیکن خالی غصہ اور گلی گلوچ سے تو دشمن کا زور ٹوٹا نہیں کرتا، نگن بابو جب غصہ کر چکے تو انھیں دور اندیشی کی سوجھی، معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی انھوں نے صلاح دی۔ نگن بابو کی رائے یہ تھی کہ نہ ہو ''دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ'' پر عمل کر کے تھوڑا بہت چاول خیرات کر دیا جائے۔ سرت بابو کو شدید اختلاف تھا۔ اگر ایک دفعہ چاول خیرات کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر رکنے کا نہیں۔ ان کی رائے یہ ہوئی کہ اگر دینا ہی ہے تو بجائے چاول کے روپیا چندہ کر کے خیرات دے دیا جائے۔ اس روپے سے لوگ چاول خریدیں گے۔ دام تیزی سے بڑھ ہی رہا ہے، کیا عجیب ہے کہ جتنا خیرات میں دیا جائے وہ سب بڑھے ہوئے منافع کی شکل میں واپس مل جائے۔ نگن بابو کو یہ رائے اتنی پسند آئی کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ سرت بابو کو لپٹا لیں، لیکن ایسا کرنا ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ اس لیے انھوں زور سے پیٹھ ٹھونک کر اپنی خوشی کے اظہار پر اکتفا کی۔ پنیر میاں کو اس تجویز کی اطلاع دی گئی، انھوں نے بھی اس پر صاد کیا۔ پچاس روپیا چندہ زمیندار بابو سے لیا اور پندرہ پندرہ روپے نگن اور سرت نے دیے اور بیس روپے پنیر میاں نے، سو روپے گاؤں میں تقسیم کیے گئے۔ اس کارِ خیر کی اطلاع مجید صاحب اور وزرا کو فوراً بھیجی گئی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ قلم نے رو میں ایک صفر بڑھا دی تھی جس کی وجہ سے سو کی بجائے ہزار پڑھا جاتا تھا۔ جو چیز رو میں آ جائے جائز ہے۔ پھر یہ کب ضروری ہے کہ لکھنے والے کی نظر ایک زائد صفر پر زبردستی پڑ ہی جائے۔

۵

ہاتھ پاؤں پھولنے اور پیٹ دھنسنے کی یہ بیماری بھی عجیب تھی۔ پھیلتی ہی جاتی تھی۔ ابھی

بابو نے دوا تیار کرلی تھی۔ دوسری دواؤں میں نمک چینی اور رنگ کا مختلف مقدار میں امتزاج ہوا کرتا تھا۔ اس دوا میں کالا نمک بھی انھوں نے بڑھا دیا اور حسبِ وعدہ انھوں نے قیمت بھی کم ہی رکھی، یعنی ڈیڑھ روپیا شیشی، مگر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ جس کے پاس اتنا روپیا ہوتا وہ اس سے دوا خریدنے کی بجائے چاول خریدنا زیادہ پسند کرتا، نگن بابو کو دوا ایک مصیبت کے ماروں پر دیا بھی آئی اور انھوں نے اپنی طرف سے دوا بھی دلوائی، مگر ایسا معلوم ہوتا کہ موت کو اس دوا سے خاصا بیر ہے، دوا پیتے ہی پیٹ اتنی تیزی سے چلنے لگتا کہ بیمار موت کی منزل پر چند گھنٹوں میں ایڑیاں رگڑتا پہنچ جاتا، کچھ لوہا گاڑا اور گھوڑا مارا پر ہی موقوف نہ تھا۔ گاؤں گاؤں یہ بیماری پھیل رہی تھی، ایسے بابو کی دوا کی مدد کے بغیر بھی لوگ زندگی آخری منزل پر پہنچتے جاتے تھے۔

۶

جمعدار صاحب کے یہاں کچھ کھانے کو نہ تھا۔ بی بی جان نے کہا، ''کہیں سے قرض لے آؤ۔'' جمعدار صاحب سرت ساہا کے یہاں گئے، وہاں خریداروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سرت ساہا، جمعدار صاحب کے پتلے حال سے واقف تھا۔ اُس نے اپنے پرانے ''کاکا'' کا نوٹس بھی نہ لیا۔ جمعدار صاحب کے دل کو تکلیف تو ضرور ہوئی، مگر بہت زیادہ نہیں۔ اب وہ ایسے تجربوں اور تکلیفوں کے عادی ہوتے جارہے تھے، جب ان کی باری آئی تو انھوں نے بہت ہچکچا کے پانچ سیر چاول مانگے۔ سرت ساہا نے پہلے دام مانگے۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''ابھی نہیں ہیں بعد میں دے دیں گے۔'' سرت ساہا نے جواب دیا، ''تو پھر چاول بھی بعد ہی میں لینا۔'' جمعدار صاحب کو یاد آیا کہ یہ وہی سرت ساہا ہے جو اپنی دکان کو کہتا تھا کہ اُن کی ہے۔ اب وقت پڑنے پر چاول بھی قرض نہیں دیتا۔ انھوں نے بہت ضبط سے کام لیا اور کہا، ''بھیا، ہوتا تو دے دیتے۔'' اُس نے جواب دیا، ''زمین تو ہے، گائے تو ہے، اسے بیچ دو۔'' جمعدار صاحب نے بتایا کہ اب کوئی کھیت نہیں رہ گیا۔ موتی کو بیچنے کا انھیں خیال بھی نہ آیا تھا، کون موتی؟ وہ جوان کے گھر کی بچھیا تھی، وہ جواُن کی اتنی دلاری تھی، وہ جس پر ان کا چھانوا اپنی جان

چھٹر کتا تھا اور جو چھانو کو بڑی محبت سے چاٹتی تھی، وہ ان کے خاندان کے ایک فرد کی طرح تھی۔ وہ اور بیچی جائے؟ جمعدار صاحب کا سر چکرانے لگا۔ سرت ساہا نے پوچھا،''اور گائے؟'' جمعدار صاحب بغیر جواب دیے چلے آئے۔ بی بی جان سے حال بتایا۔ انھیں بھی بڑا غصہ آیا کہ سرت ساہا نے موتی کے بیچنے کا کیسے ذکر کیا۔ انھوں نے اپنی ملمع کی ہوئی چاندی کی بالیاں اتار کر دے دیں۔ جمعدار صاحب انھیں بیچ کے تھوڑے سے چاول لے آئے۔

۷

جلودھر اور مخلص جمعدار صاحب کے یہاں آئے۔ دو تین دفعہ پہلے بھی آ چکے تھے، مگر جمعدار صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ دن کو آئے تو وہ باہر گئے ہوئے تھے۔ رات کو آئے تو عبادت میں مشغول تھے۔ آج وہ لوگ صبح صبح پہنچے، دیکھا کہ جمعدار صاحب پانی میں کھڑے ہیں اور کچری پانا (نرگس آبی) کے تیرتے ہوئے پودوں کو پانی سے نکال نکال کر کنارے پر ڈال رہے ہیں۔ قیس اٹھا اٹھا کر اوپر لے جا رہا ہے۔ اچھا بھی تھوڑی بہت مدد کر رہا ہے۔ صاحب سلامت تو ہوئی، لیکن جلودھر اور مخلص کو جمعدار صاحب میں وہ گرم جوشی نظر نہ آئی جس کی انھیں امید تھی، اب وہ لوگ بڑی حد تک انھیں اپنا ہم خیال سمجھ رہے تھے اور یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ وہ بہت جلد پارٹی کے بہت بڑے کارکن بن جائیں گے۔ انھیں جمعدار صاحب کی سرد مہری پر تعجب ہوا۔ پوچھا،''کاکا یہ کیا کر رہے ہو؟'' جمعدار صاحب نے سرسری طور پر جواب دیا،''موتی کے لیے کچھ کھانے کو نہیں ہے۔'' جلودھر نے ہمدردی کے انداز میں کہا،''کیسی اچھی گائے تھی، کیسی ہو گئی۔ ہڈی چمڑا رہ گیا ہے کچری پانا کھا کے کہاں سے طاقت آئے گی۔''

مخلص،''بھیا اب تو آدمی بھی کچری پانا کھا رہے ہیں۔ تمھیں گائے ہی کی پڑی ہے۔''

جمعدار صاحب،''آدمی کچری پانا کھا رہے ہیں؟''

مخلص،''اور کیا، چاچا، کل ہم ہاجرہ بیوہ کے یہاں گئے تو دیکھا ہانڈی میں کچھ پکا رہی ہے،

گیدو پاس بیٹھا ہے بڑھ بڑھ کے ہانڈی میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ ہاجرہ ہٹا ہٹا دیتی ہے کہ کہیں ہاتھ جل نہ جائے۔ ہم نے پوچھا ہاجرہ کیا پکا رہی ہو؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم نے بڑھ کے ہانڈی میں دیکھنا چاہا تو اس نے ٹالنے کی کوشش کی، مگر ہم نے ڈھکنا الٹ دیا۔ چاچا یقین مانیے اس میں کچری پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔"

جمعدار صاحب پانی سے نکل آئے اور تیز تیز ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ جلودھر اور مخلص بڑھ کے ساتھ ہو لیے۔

جلودھر نے کہا، "کاکا اب دیکھا آپ نے؟"

جمعدار صاحب سناٹے کے عالم میں تھے جیسے سنا ہی نہیں۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

جلودھر، "بھلا اس طرح ہم لوگ کب تک جییں گے۔"

جمعدار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد بولے، "تو پھر کیا کریں۔"

جلودھر نے کہا، "کاکا ہم تو کہتے ہیں اس طرح بھوکوں مرنے سے تو گولی کھا کے مرنا اچھا ہے۔ آیئے ہم لوگ تمام گاؤں کے لوگوں کو لے کر چلیں اور سرت ساہا کی دکان لوٹ لیں۔"

جمعدار صاحب خاموش رہے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔

مخلص نے کہا، "چاچا سوچتے کیا ہیں، آپ ہاں کیجیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ گولی دولی سچ مچ تھوڑی چلے گی، اور اگر چلی بھی تو کیا، ہمارے پاس بھی پستول ہے، ہم بھی گولی چلائیں گے۔ ہم آپ کو بھی ایک پستول دیں گے، مگر بہت چھپا کے رکھیے گا۔ کسی کو خبر نہ ہو۔ بی بی جان کو بھی نہیں۔ دیکھیے آپ کی بدولت کچھ دن گاؤں کے غریب پیٹ بھر کے کھانے کو پائیں گے۔"

جمعدار صاحب بدستور خاموش رہے۔ جلودھر کی امید بندھی۔ اس نے اصرار سے کہا، "ہاں کاکا ہاں۔"

جمعدار صاحب نے بالآخر جواب دیا، "جلودھر بابو آپ اُس دن کی بات بھول جایئے۔ اب ہم آپ کے ساتھ نہیں۔"

جلودھر (چونک کر) ''کیوں؟''

جمعدار صاحب، ''آپ لوگ خدا رسول کو نہیں مانتے گناہ ثواب نہیں مانتے، ہم سے آپ سے کیا واسطہ؟''

مخلص، ''آپ بھی ایک دن ہماری طرح ہو جایئے گا۔''

جمعدار صاحب ''خدا ہو جب نا۔''

''یہ کفر کی بات ہے، ہم ایسی باتیں نہیں سن سکتے، ان کا سننا بھی گناہ ہے۔ آپ لوگ چلے جایئے۔''

جلودھر نے مخلص کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جمعدار صاحب سے مخاطب ہو کے بولا، ''کا کا مذہب کے بارے میں آپ ہماری بات نہیں مانتے تو نہ مانیے۔ ہم بھی اس کا ذکر نہ کریں گے۔ آپ ابھی گناہ کا ذکر کر رہے تھے۔ اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی تو آرام سے اور دوسروں کو ننگا بھوکا رہنے دے، اگر وہ بیمار پڑے تو اُسے بے علاج مرنے دے۔''

مخلص، ''خاص کر جب اس کا دھن حرام کی کمائی ہو جیسے سرت ساہا کی ہے۔ آپ جانتے ہیں اس نے کس طرح سے سارے گاؤں کا دھان جمع کر رکھا ہے۔ جن لوگوں سے اس نے ایک روپے میں خریدا تھا ان ہی کو دس روپے میں دے رہا ہے۔ آپ سے خود اس نے کتنا دھان خریدا ہے، بتایئے آپ سے کس دام میں خریدا اور اب آپ خریدنے جاتے ہیں تو آپ ہی کا دھان آپ کو کس دام میں بیچتا ہے؟''

جلودھر، ''اسے اس بات سے مطلب نہیں کہ آپ کے یہاں کھانے کو نہیں ہے، چھانو میاں بھوکے ہیں، بی بی جان بھوکی ہیں، موتی بھوکی ہے اور آپ کی حالت کی سے کیا ہو گئی ہے، اگر چھانو، بی بی جان، موتی، آپ بلکہ سارا گاؤں بھوکوں مر جائے تب بھی سرت ساہا کے کان پر جوں نہ رینگے گی، اسے تو روپیا سے مطلب ہے روپیا سے۔ روپیا اس کا دیوتا ہے۔ روپیا خدا ہے۔''

مخلص، ''یہ ظلم اور گناہ نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسے آدمی کو ظلم و گناہ سے روکنا سب سے بڑا

ثواب ہے۔ جلودھر بابو تو خالی دھان لوٹنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اسے گولی ماردینی چاہیے۔"

جمعدار صاحب پھر سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے دماغ میں نئے پرانے خیالات کا ایک گدڑی بازار سا لگ گیا۔ ان کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھ کے جلودھر اور مخلص کو خوشی ہوئی۔ انھوں نے کہا، لوہا گرم ہے۔ اسی وقت ہتھوڑے مار کر سیدھا کر لینا چاہیے۔

جلودھر نے کہا، "کاکا زیادہ سوچنے سے کیا فائدہ۔ آیئے ہمارے ساتھ، ہم لوگ گھر گھر جا کے بھوکوں کو جمع کریں اور آج رات ہی کو سرت ساہا کی دکان لوٹ لیں۔"

جمعدار صاحب نے کہا، "نہیں مجھے سوچنے دو۔"

مخلص، "نہیں نہیں نہ کیجیے، آیئے بھی۔"

"نہیں ابھی نہیں۔"

"پھر کب؟"

"دو ایک روز میں جواب دوں گا۔"

"دو ایک روز میں تو معلوم نہیں چھانو میاں کا کیا حال ہو جائے گا۔ بس آپ آج ہی شام تک طے کر لیجیے ہم لوگ تب سے گاؤں کے لوگوں کو تیار کرتے جاتے ہیں۔"

۸

جلودھر اور مخلص چلے تو گئے، مگر جمعدار صاحب کو ایک عجیب کشمکش میں ڈال گئے۔ انھوں نے چھانو کو دیکھا۔ اس کے بیٹھے ہوئے گال اب پہلے سے زیادہ بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ موتی پر نظر پڑی۔ اس کی ہڈیاں پہلے سے زیادہ ابھری ہوئی معلوم ہوئیں۔ وہ کچری پانا کے پتوں کو آہستہ آہستہ چبا رہی تھی، جیسے جبراً قہراً کھا رہی ہو۔ کچری پانا دیکھ کے انھیں ہاجرہ کا خیال آیا اور اس کے بچے گیدو کا چاند کا ہنستا گاتا چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ وہ ہاجرہ کو کتنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے لیے

کس محبت سے پیتل کے بندے خریدے تھے۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو بھلا ہاجرہ اور گیدو کو کچڑی پانا کھانے دیتا۔ اس کی وہ عین جوانی میں موت، آخر اس کی ذمے داری بھی تو انھیں پر عائد ہوتی تھی۔ وہ فوراً ہاجرہ کے یہاں گئے۔ دیکھا، نہیں ہے۔ گیدو کی ماں کے گھر گئے۔ وہ بھی نظر نہ آئی۔ آخر سب کہاں گئیں۔

جمعدار صاحب اپنی تاڑ والی ناؤ میں بیٹھ کر تلاش کرنے نکلے۔ وہ اتنی ہلکی پھلکی ناؤ کو بھی چلانے میں تھکے جا رہے تھے۔ تمام گاؤں چھان مارا، صرف نگن بابو کا ٹیلہ رہ گیا۔ وہاں جانے کو اُن کا جی نہ چاہتا تھا۔ جس دن نگن بابو نے لگان کا تقاضا سب کے سامنے کیا تھا۔ اس دن سے وہ وہاں نہ گئے تھے، مگر شاید ہاجرہ اور گیدو کی ماں وہیں گئی ہوں۔ وہاں جانے سے ان کی خودداری تو مجروح ہوتی تھی، مگر وہ اپنی خودداری کو دیکھیں یا اپنے فرض کی ادائیگی کو، بالآخر وہاں گئے۔ دیکھا کہ ایک مجمع لگا ہوا ہے۔ اس میں ہاجرہ بی بی بھی کھڑی ہے اور گیدو کی ماں کی ماں بھی ہاجرہ ایک ہاتھ سے لیدو کو اپنے کولھے پر سنبھالے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا برتن لیے ہے۔ گیدو کی ماں کے ہاتھ میں اپنی وہی پرانی بید کی ٹوکری ہے جس میں وہ کبھی گڑ چوڑا بیچا کرتی تھی، مگر وہ آج خالی تھی۔ معلوم ہوا کہ زمیندار بابو کی طرف سے خیرات میں چاول بانٹا جا رہا ہے۔ نگن بابو بانٹ رہے تھے۔ جمعدار صاحب کو دیکھ کے پہلے تو انھیں حیرت ہوئی۔ یہ وہی جمعدار صاحب تھے جو کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اپنے آپ کو بڑا طرم خان سمجھتے تھے۔ انھیں کی وجہ سے نگن بابو پر الٹا مقدمہ قائم ہوا تھا۔ ان کے گال بیٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں ڈگ ڈگا رہی تھیں۔ وہ کتنے مجبور ہوں گے کہ خیرات لینے آئے۔ اس خیال سے نگن بابو کا دل بھر آیا۔ مقدمہ معاملے کا قصہ بھول گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کا جی چاہا کہ فوراً جمعدار صاحب کے پاس جا کے ان کو الگ لے جائیں اور انھیں اتنا چاول دیں کہ وہ کچھ دن تک کھا سکیں۔ وہ ان کی طرف بڑھے، مگر خیرات چاہنے والوں کی بھیڑ نے انھیں بڑھنے نہ دیا۔ انھوں نے پکار کے جمعدار صاحب سے کہا کہ سامنے والی کوٹھری میں جا کے جتنا جی چاہے چاول لے لیں۔ جمعدار صاحب کے دل میں جیسے گولی سی لگی۔ وہ چکرا کے گرنے لگے۔ پھر انھوں نے اپنے آپ کو

سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر تو گم سم رہے۔ پھر حواس مجتمع کر کے بولے، "بابو جی میں تو ہاجرہ اور گیدو کی ماں کو ڈھونڈنے آیا تھا۔" یہ کہہ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ انھوں نے ہاجرہ اور گیدو کی ماں کو الگ بلایا اور ان سے ساتھ آنے کو کہا۔ وہ لوگ چاہتی تھیں کہ چاول مل جائیں تو جائیں، مگر جمعدار صاحب کے کہنے کو ٹال بھی نہ سکتی تھیں، چلی آئیں۔ جمعدار صاحب نے راستے میں کہا کہ جب تک وہ زندہ ہیں۔ اس وقت تک ان لوگوں کو کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ گیدو کی ماں چھانو کو اپنے بیٹے کے برابر سمجھتی تھی اس لیے وہ چھانو کی ماں کے برابر ہوئی۔ ہاجرہ کا تو ان پر پورا پورا حق ہی ہے۔ وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ دونوں سن کے چپ ہو رہیں۔ وہ کس دل سے کہتیں کہ انھوں نے جان بوجھ کر جمعدار صاحب کے یہاں جانا چھوڑ دیا تھا۔ حال میں وہ ایک دفعہ گئی تھیں تو انھوں نے دیکھا تھا کہ بی بی جان چاول کی پیچ میں نمک ملا کے کھا رہی ہیں۔ تھوڑا سا پکا ہوا چاول چھانو کے لیے اور جمعدار صاحب کے لیے الگ رکھا ہوا ہے۔ اب یہ لوگ کیا مانگتیں۔ اُٹھ کے آنا چاہتی تھیں کہ بی بی جان نے اصرار کر کے انھیں بٹھایا اور پیچ اٹھا کے دینی چاہی۔ ان لوگوں نے انکار کیا، مگر وہ نہ مانیں۔ بہت کہنے سننے کے بعد تینوں نے ایک ایک حصہ اس پیچ کا کھایا جو ایک آدمی کا پیٹ بھرنے کو بھی کافی نہ تھی۔ اس دن سے یہ لوگ جمعدار صاحب کے یہاں نہ گئی تھیں۔ گھر پہنچ کر جمعدار صاحب نے وہ تھوڑا سا چاول جو بی بی جان نے ان کے لیے پکا کے الگ رکھ دیا تھا، گیدو کی ماں اور ہاجرہ کے سامنے رکھ دیا۔ وہ جمعدار صاحب اور بی بی جان کا منہ دیکھنے لگیں۔ دونوں فاقے کی تصویر تھے۔ باوجودیکہ ان عورتوں نے تین وقت سے کچھ نہ کھایا تھا اور ان کا پیٹ جل رہا تھا، لیکن پھر بھی ان کا جی کھانے کو نہ چاہا۔ جمعدار صاحب نے بڑا اصرار کر کے کھلایا تو ان کے گلے میں نوالہ پھنسنے لگا۔ تین چار نوالے سے زیادہ نہ کھا سکیں۔ تھوڑی دیر بعد بیس سیر چاول کی ایک بوری جمعدار صاحب کے یہاں پہنچی۔ نگن بابو نے بھیجی تھی۔ جمعدار صاحب نے ضبط کرنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اپنے آنسو نہ روک سکے۔ ان کا جی چاہا کہ فوراً واپس کر دیں، مگر جب ان کی نظریں ہاجرہ اور گیدو کی ماں کے بھوکے چہرے اور اُس سے زیادہ بھوکی آنکھوں پر پڑیں تو رک گئے، اگر انھوں نے بوری رکھ لی اور چاول ان غریب عورتوں کو دے دیا تو نگن بابو یہ سمجھیں گے کہ

انھوں خیرات قبول کرلی، سمجھیں تو سمجھیں، غریبوں کا تو بھلا ہوگا۔ انھوں نے آدھا آدھا چاول دونوں کو بانٹ دیا اور نگن بابو کو شکریہ کا خط بھیج دیا۔

ہاجرہ اور گیدو کی ماں نے چاول لینے کو تو لے لیا، لیکن اُن کا دل خوش نہ ہوا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ جمعدار صاحب اپنے لیے بھی کچھ رکھ لیتے۔

۹

ہاجرہ اور گیدو کی ماں کے چلے جانے کے بعد جمعدار صاحب نے بی بی جان سے کہا،

''کیوں بی بی جان تمھاری کیا رائے ہے، سرت ساہا کی دکان لٹوالیں؟''

بی بی جان نے کہا، ''تمھیں کیا ہوگیا ہے۔ کیسی بات کررہے ہو؟''

''ہم تم سے پوچھتے ہیں۔''

''تمھیں ایسا خیال ہی کیسے آیا؟ تم نے پوچھا کیسے؟''

''پہلے بات تو سنو، گاؤں کے لوگ بھوکے مررہے ہیں۔ سرت ساہا کے ہاں چاول کا انبار لگا ہوا ہے۔ وہ اس پر سانپ کی طرح بیٹھا ہوا ہے۔ اسے اس کا کیا حق ہے؟''

''اس نے خریدا ہے، تمھیں اس کے لینے کا کیا حق ہے؟ تمھاری چیز ہے؟''

''ہماری تو نہیں، لیکن گاؤں والوں کو زندہ رہنے کا بھی تو حق ہے۔''

''تو پھر سب لوگ چوری کریں، ڈاکے ماریں؟''

جمعدار صاحب چکرا گئے۔ کہنے لگے، ''آج جلودھر بابو اور مخلص آئے تھے۔ کہتے تھے سرت ساہا کی دکان لوٹ کر غلہ غریبوں کو تقسیم کردینا چاہیے۔ ہم سے کہتے تھے ہم بھی ان کے ساتھ چلیں۔ ہم نے کہا، ہم سوچ کے بتائیں گے۔ اسی لیے تم سے پوچھتے ہیں۔''

''مجھے زیادہ باتیں تو آتی نہیں، مگر اتنا جانتی ہوں کہ مجھے فاقوں مرنا منظور ہے، مگر چوری ڈاکا منظور نہیں۔ وہ لوگ جاتے ہوں تو جائیں، تم نہ جانا۔''

''تو تمھاری یہی رائے ہے۔''

''ہاں۔''

''میرا بھی دل یہی کہتا تھا، مگر میں سوچ میں پڑ گیا تھا کہ شاید جلودھر اور مخلص ٹھیک کہتے ہوں۔ اب تمھاری بات سے مجھے یقین ہو گیا کہ میرا دل ٹھیک کہتا تھا، خدا تمھیں خوش رکھے۔''

۱۰

شام کو پھول محمد آیا اور اس نے جمعدار صاحب سے پوچھا کہ وہ سچ مچ سرت ساہا کی دکان لوٹنے جائیں گے۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''نہیں۔'' پھول محمد کچھ اور کہنے والا تھا کہ جلودھر اور مخلص بیس پچیس گاؤں والوں کے لے کر آ دھمکے۔ اُن میں عمدہ میاں بھی تھا اور بڑھ چڑھ کے باتیں کر رہا تھا۔ جلودھر اور مخلص جمعدار صاحب کو ایک طرف لے گئے اور انھیں چپکے سے ایک پستول دیتے ہوئے بولے، ''اسے جیب میں چھپا کے رکھ لیجیے۔'' کہنے کو تو جمعدار صاحب توپ بندوق سبھی کچھ چلا چکے تھے، مگر واقعہ یہ تھا کہ انھوں نے کبھی پستول نہ چلایا تھا۔ اس لیے ان کا جی چاہا کہ وہ اسے لے لیں، لیکن اس کے یہ معنی ہوں گے کہ یا تو وہ سرت ساہا کی دکان لوٹنے میں شریک ہوں یا پھر جلودھر اور مخلص کو دھوکا دیں۔ یہ دونوں باتیں انھیں منظور نہ تھیں۔ اس لیے انھوں نے پستول واپس کر دیا اور اپنے فیصلے سے مخلص اور جلودھر کو اطلاع دی۔ جمعدار صاحب کے لہجے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پکا فیصلہ کر چکے ہیں اور اس سے تلنے والے نہیں۔ ان لوگوں نے مزید بحث فضول سمجھی اور واپس آ کے مجمعے سے کہا کہ جمعدار صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آج نہ جا سکیں گے، جمعدار صاحب خاموش رہتے تو اس سے ان کی بہادری کا بھرم قائم رہتا، لیکن اس سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی اس لیے انھوں نے تردید مناسب سمجھی اور نہ جانے کی اصل وجہ بتائی۔ جلودھر اور مخلص کو بہت برا لگا۔ ان کا بنا بنایا کھیل بگڑ رہا تھا۔ انھوں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن مجمعے میں انتشار پیدا ہو چکا تھا، اور سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ پھول محمد نے کہا، ''چاچا بھوک تو ہمیں بھی بہت لگی ہے اور سرت ساہا ہے بھی

بہت بدمعاش۔ جی چاہتا ہے اسے کچا کھا جائیں، مگر آپ کی بات سن کے ہمارا پیٹ خوشی کے مارے بھر گیا۔ بیٹا جلودھر اور مخلص خوب کھسیار ہے ہوں گے۔''

11

جمعدار صاحب کے یہاں کی ناکامی کے بعد جلودھر اور مخلص نے ہمت نہ ہاری۔ چپکے چپکے اپنا کام جاری رکھا۔ لوگ بھوکے مر ہی رہے تھے۔ جلودھر اور مخلص کی بات ان کے دل کو لگی۔ آہستہ آہستہ بھوکے مرنے سے ایک دم گولی کھا کر مرنا اچھا تھا۔ پھر بقول جلودھر اور مخلص کے گولی چلنے کا امکان بھی بہت کم تھا۔ چنانچہ ایک رات کو چالیس پچاس آدمی اکٹھا ہو ہی گئے اور چپکے سے کشتی میں بیٹھ کر سرساہا کے ٹیلے کے نیچے پہنچے۔ تین بجے رات کو دھاوا بولا گیا۔ عمدہ میاں لیڈر بنے ہوئے تھے۔ دیکھا سرت ساہا کی دکان پر پولیس کا پہرہ ہے۔ اسے ان لوگوں کے ارادے کی اطلاع مل گئی تھی اور پنیر میاں کی مدد سے پولیس کا انتظام کیا گیا تھا۔ پولیس کو بندوق تانے دیکھ کر مجمع سٹپٹایا۔ عمدہ میاں نے مڑ کر دیکھا تو جلودھر اور مخلص مجمعے کی پیچھے سے اس طرح رکھوالی کر رہے ہیں جس طرح گدڑیے بھیڑوں کی کرتے ہیں۔ جلودھر نے نعرہ لگایا ''بھات دو یا گولی۔'' مخلص چلایا، ''چھین لو بندوق۔'' پولیس نے بندوق تان لی۔ ان کے افسر نے کہا، ''گولی چاہتے ہو، لو۔'' لوگ آئے تو تھے اسی لیے کہ بھات کھائیں گے یا گولی، لیکن جب دیکھا کہ سچ مچ گولی کھانے کو ملنے والی ہے تو کسی کا جی گولی کھانے کو نہ چاہا۔ آہستہ آہستہ بھوکے مرنا ایک دم سے گولی کھا کے مرنے سے اچھا معلوم ہوا۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے۔ اتنے میں جلودھر نے ایک پیڑ کے پیچھے سے پستول داغ دیا۔ پھر کیا تھا، پولیس نے باڑ مار دی۔ جن کے سر پیر سلامت رہے وہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے، جلودھر اور مخلص آگے آگے بھاگنے والوں کو راستہ دکھاتے جا رہے تھے۔ بے چارے عمدہ میاں حملہ کرنے والوں کی سب سے آگے کی صف میں تھے۔ سمجھے تھے خالی شور شغب سے حسب معمول کام چل جائے گا اور بہادروں کی صف میں ان کا شمار ہوگا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ سچ مچ گولی چل جائے گی۔ وہ بندوق کے سامنے پڑ گئے۔ ان کا پیٹ گولی سے

ہمیشہ کے لیے بھر گیا۔ ان کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور بس۔ انھیں اتنا سوچنے کی بھی فرصت نہ ملی کہ ان کی عمدہ بیوی اور اور بچوں پر جس میں ایک ان کا اپنا بھی بچہ تھا ان کے بعد کیا گزرے گی، ان کی ساری امیدوں، ترنگوں، حوصلوں اور ولولوں کا یک بیک خاتمہ ہو گیا۔ وہ یوں ہی شوقیہ چلے آئے تھے۔ وہ کمیونسٹ امیونسٹ خاک نہ تھے۔ پیٹ تو ان کا بھی خالی رہتا تھا، مگر اتنا نہیں کہ اسے گولی سے بھرنے کی ضرورت ہو۔ عمدہ بی بی کے کھیت کا تھوڑا دھان موجود تھا۔ دن میں ایک وقت کھانے کو تھوڑا بہت مل جایا کرتا تھا۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ وہ اس علاقے میں سب سے پہلے دوسروں کے شگون کی خاطر اپنی ناک کٹوانے کے بجائے اپنی جان ہی گنوا بیٹھے۔ جب چاروں سے طرف سے لوگ کچھ نہ کھانے کی وجہ سے مر رہے ہوں تو کسی کا گولی کھا کے مرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوتی۔ پھر بھی عمدہ میاں کے مرنے سے گاؤں کی زندگی میں ایک کمی سی محسوس ہونے لگی۔ عمدہ بیوی کو تو خیر غم ہوا ہی۔ جمعدار صاحب کے دل کو بھی تکلیف پہنچنی لازمی تھی۔ پھول محمد کو غالباً سب سے زیادہ صدمہ پہنچا۔ ان کا مدتوں کا ساتھی بچھڑ گیا تھا، لیکن پنیر میاں کو بھی بڑا افسوس ہوا۔ مانا کہ عمدہ میاں انھیں چکمے بھی دے دیا کرتے تھے، مگر پھر بھی ان کی چالاکی میں سادگی اور سادگی میں چالاکی کچھ اس طرح ملی جلی رہتی تھی کہ آدمی ان سے زیادہ دن خفا نہ رہ سکتا تھا، بلکہ ان سے کچھ نہ کچھ اُنس محسوس کرنے لگتا تھا۔ اگر وہ کچھ کچھ کام بگاڑ دیتے تھے تو کچھ بنا بھی دیتے تھے، مر کے بھی انھوں نے یہی کیا۔ مرے تو وہ تھے تن تنہا، مگر ان کی موت سینکڑوں موتوں کے برابر بن گئی۔ خبر جو پھیلی تو کوئی کہتا کہ "دس بارہ مارے گئے۔" کوئی کہتا، "پچیس تیس۔" کوئی، "ارے بہت مارے گئے۔" کوئی، "معلوم نہیں کتنے مارے گئے۔" یہاں تک کہ کچھ اخبار اس حادثے کو جلیاں والا باغ کے واقعے کے برابر ٹھہرانے لگے۔ اخباروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنگال کے تمام غریب لوگوں عمدہ میاں بن کے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ان کے خون کا قصاص لے کے رہیں گے، مگر خود گھوڑا مارا اور آس پاس کے دیہاتوں میں یہ عالم تھا کہ جیسے لوگوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر ایک پر دہشت طاری تھی، جو لوگ زخمی ہوئے تھے، وہ اپنے زخم چھپائے پھرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ باتیں کرتے جیسے ڈرتے ہوں کہ کوئی سن نہ لے، لوٹ مار کا

خیال ان کے دماغوں سے اس طرح غائب ہوگیا تھا جیسے عمدہ میاں اس دنیا سے، لیکن عمدہ میاں کے مرنے اور اس کی وجہ سے جو چیخ پکار ہوئی اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ حکومت کے کان کھڑے ہوگئے۔ صورتِ حال کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا، حکامِ ضلع کو ہدایتیں کی گئیں کہ وہ قحط کا اعتراف تو نہ کریں، مگر قحط کا انتظام ضرور کریں۔

☯......☯......☯

ساتواں باب

بنگال کی فضا اب بھی مسکرا رہی تھی، آسمان مسکرا رہا تھا، زمین مسکرا رہی تھی، گھٹائیں جھوم جھوم کر آ رہی تھیں۔ بجلیاں لہرا رہی تھیں۔ کلیاں مسکرا رہی تھیں، پھول ہنس رہے تھے، چڑیاں چہچہا رہی تھیں، دریائے پدما مستانہ وار بہہ رہا تھا۔ اڑیل خان کی ان بان میں بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔ انسان کی زندگی بھی انھی دریاؤں کی طرح بہی جا رہی تھی۔ البتہ اس میں بھنور زیادہ پڑنے لگے تھے۔ ہر بھنور گھڑیال کی طرح منہ کھولے معلوم ہوتا تھا، لوگوں کو کھینچ کھینچ کر ڈبو رہا تھا۔ کچھ لوگ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ کچھ بغیر پاؤں مارے ہی ڈوبے جا رہے تھے۔ عمدہ میاں تو ڈوب ہی چکے تھے۔ ججیر باپ بھی غوطے کھانے لگے، بنیر میاں اب تو شہر میں رہنے لگے تھے۔ انھیں اب ججیر باپ کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ انھوں نے اسے برطرف کر دیا۔ ججیر باپ کی حالت یوں ہی سقیم ہو رہی تھی اب اور ہو گئی۔ بنیر میاں نے مدد کے خیال سے اس کے کھیت رہن رکھ لیے تھے جس میں پھول محمد کا بھی حصہ شامل تھا۔ اب اس کے پاس کوئی کھیت باقی نہ رہ گیا تھا۔ گھر میں جو تھوڑا بہت غلہ بچا کھچا تھا وہ بھی ختم ہو رہا تھا۔ کئی کھانے والے تھے۔ پانچ چھ بچے، بیوی، پھول محمد، مہینوں سے آدھا پیٹ سب کھاتے تھے اور پیٹ میں جو آگ جل رہی تھی، اس کی تپش سے رفتہ رفتہ جھلستے جاتے تھے۔ جمعدار صاحب بے چارے کیا کرتے، ان کی آپ ہی حالت تباہ تھی۔ پھول محمد کو دیکھ کے ان کا دل اور کڑھتا، اب وہ چپ چاپ سا رہنے لگا تھا۔ بعض وقت کھویا کھویا سا رہتا، اسے دیکھ کے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ وہی پھول محمد ہے جس کا ہنستا ہوا شوخ چہرہ دلوں کی کلیاں کھلا دیا کرتا تھا۔ جس کی شوخی و شرارت خود زندگی کی قدر و قیمت بڑھا دیتی تھی۔

جمعدار صاحب پوچھتے، ”بچہ تمھیں کیا ہو گیا ہے، بہت دنوں سے تم ہنسے نہیں۔“

پھول محمد جواب دیتا، ''چاچا کچھ تو نہیں، ہنستے تو ہیں۔'' یہ کہہ کے زبردستی کی ہنسی ہنسنے لگتا، اس ہنسنے سے تو اچھا تھا کہ وہ روتا ہی۔ اس سے جمعدار صاحب کے دل کو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ وہ پھول محمد کو اپنے کھانے میں شریک کرتے۔ کھانا کیا ہوتا زیادہ 'پیچ' اس میں تھوڑے سے چاول اور بہت سا نمک، جس سے بھوک کم ہو جاتی اور پیاس زیادہ لگتی، پانی پی پی کے پیٹ بھر لیا جاتا، پھول محمد ذرا سا کھا کے ہاتھ کھینچ لیتا۔ اسے اپنے چچا کے بچوں کا خیال آنے لگتا، جمعدار صاحب یہ دیکھ کے کچھ سوچ میں پڑ جاتے، ایک دن انھوں نے بی بی جان کو جبیر باپ کے گھر بھیجا، بی بی جان نے دیکھا کہ بچے رو رہے ہیں اور کلثوم اپنی بھوک کا غصہ ان پر اتار رہی ہے اور انھیں اس طرح مار رہی ہے جیسے مار کھا کھا کے ان کا پیٹ بھر جائے گا۔ بی بی جان نے روکا تو کلثوم کھسیا کے رونے لگی، بی بی جان نے آ کے وہاں کا حال جمعدار صاحب سے بتایا، جمعدار صاحب کچھ کھو سے گئے۔ ہاتھ پر سر رکھ کے سوچنے لگے۔ پٹ سن ختم ہو گیا تھا۔ کوئی زمین بھی باقی نہ رہی تھی جسے بیچتے۔ قرض کہیں سے ملتا نہ تھا، سوچا سرت ساہا کے یہاں پھر جائیں، شاید کچھ چاول اُدھار دے ہی دے۔ سرت ساہا نے پھر موتی کے بیچنے کا سوال اٹھایا، جمعدار صاحب غم زدہ ہو کے لوٹ آئے۔ رات بھر نیند نہ آئی۔

۲

جلودھر اور مخلص کو عمدہ میاں کے مرنے کا غم تو تھا، لیکن اس سے زیادہ اس بات کا افسوس تھا کہ جمعدار صاحب اُن کے ساتھی بنتے بنتے رہ گئے تھے۔ اگر وہ ان کے ساتھ ہو جاتے تو نقشہ ہی دوسرا ہوتا، پارٹی کے مرکزی دفتر کو برابر اطلاعیں بھیجی جاتی تھیں۔ اس بات کی اطلاع بھی بھیجی گئی تھی کہ جمعدار صاحب پر جادو چل گیا ہے اور غالباً وہ عنقریب پارٹی کے پرجوش کارکن ہو جائیں گے۔ ناکامی کی ابھی اطلاع بھیجی گئی وہاں سے تفصیلی رپورٹ طلب ہوئی۔ جلودھر نے پورا پورا حال لکھ دیا۔ کوئی بات چھپائی نہیں، چھپاتا کیسے، ایسا کرنا پارٹی کے قانون کے مطابق بہت بڑا جرم تھا۔ مرکز نے اس رپورٹ پر بڑا غور خوض کیا اور یہ ہدایت کی کہ آئندہ سے مذہبی سوال ہرگز نہ اٹھایا جائے، بالخصوص

مسلمانوں نے۔ صرف اقتصادی مسائل پر باتیں کریں۔ تکلیفوں کا جائزہ لیا جائے۔ ان تکلیفوں کے دور کرنے کا انھیں خیال دلایا جائے۔ ان کی ہمت بڑھائی جائے۔ طرح طرح سے ان کی ہمدردی حاصل کی جائے۔ اور انھیں یہ بتایا جائے کہ ان کی ساری مشکلات کا حل اشتراکیت میں ہے، اگر کوئی دوسرا شخص مذہب کا سوال اٹھائے بھی تو اسے ٹال دیا جائے اور یہ ہرگز ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ اشتراکی خدا کو نہیں مانتے یا مذہب کی مخالفت کے معاملے میں شدت پسند ہیں۔ جلودھر نے یہ ہدایتیں پارٹی کی میٹنگ میں پیش کیں۔ اختلاف رائے کا کوئی سوال نہ تھا۔ مرکزی احکام کی تعمیل لازمی تھی۔ اس لیے مخلص کو بھی چپ رہنا پڑا، حالانکہ وہ مذہب کی مخالفت کے معاملے میں شدت پسند واقع ہوا تھا۔

کچھ عرصے سے پارٹی والوں کو اپنی پارٹی میں ایک بڑی کمی محسوس ہو رہی تھی، پارٹی میں کیا، ان کی زندگی ہی میں ایک 'خلا سا تھا۔ یہ بات یہ تھی کہ اب تک کوئی لڑکی ان کے شریکِ کار نہ ہوئی تھی، سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اگر کوئی اچھی خوب صورت لڑکی انھیں مل جائے تو پارٹی کے کام کو فوراً زیادہ دلچسپ بنادے۔ پارٹی کے اثرات کو گھر گھر پھیلائے، بعض وقت جو کام مردوں سے انجام نہ پاسکے وہ اس کے ذریعے سے پورا ہو، لیکن مشکل یہ تھی کہ گھوڑا مارا کے لوگ ذرا پرانے خیال کے واقع ہوئے تھے، مسلمان خاص طور سے۔ پنیر میاں کے یہاں بھی سخت پردہ تھا ان کی لڑکیاں پڑھتی تو تھیں، لیکن باہر کے لوگوں کے سامنے نہ آتی تھیں، ہندو لڑکیاں تعلیم یافتہ قسم کی ضرور تھیں، ایک تو سرت ساہا کی ہی لڑکی تھی، نگن بابو کے خاندان میں بھی دو تین پڑھی لکھی لڑکیاں تھیں، خود زمیندار بابو کی لڑکی ایف اے میں پڑھتی تھی، لیکن انھیں کس طرح اپنایا جائے۔ یہ سوال ذرا ٹیڑھا تھا اور اس میں بڑی پیچیدگیاں تھیں، بہر حال جلودھر اور مخلص کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اس مسئلے کے جملہ پہلوؤں پر غور کر کے آئندہ میٹنگ میں اپنی رپورٹ پیش کریں۔

۳

صبح کو جمعدار صاحب جب باہر آئے تو دیکھا کہ موتی منہ باندھے کھڑی ہے، اس کے پاس کچھ کھانے کو نہیں، جمعدار صاحب نے ''قیص بچہ قیص'' کہہ کے پکارا، آواز میں وہ پہلی سی گرج تھی نہ تڑپ، نہ آواز زیادہ دور گئی نہ کوئی جواب ملا۔ جمعدار صاحب چپ ہو گئے۔ اپنے ہاتھ سے درختوں کے پتے توڑ توڑ کر موتی کو دینے لگے۔ اُسے محبت سے سہلاتے جاتے تھے اور پتے کھلاتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں پھول محمد آیا، جمعدار صاحب نے پوچھا، ''بچہ تم نے قیص کو کہیں دیکھا ہے۔ صبح سے وہ لاپتا ہے۔'' پھول نے کہا، ''چاچا ہم نے اسے کئی دفعہ جلودھر بابو کے ساتھ دیکھا ہے۔ اسے ہم نے منع بھی کیا ہے، اس دن جلودھر بابو کے ساتھ جارہا تھا۔ ہمیں دور سے دیکھ کے چھپ گیا۔ شاید وہیں گیا ہوگا۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''نہیں وہاں کیا جائے گا۔'' اور یہ کہہ کے سوچ میں پڑ گئے۔ قیص کہیں سچ مچ وہیں نہ چلا گیا ہو۔ اگر گیا تو کیوں، بھوک کے مارے گیا تو خیر کوئی ہرج نہیں، لیکن اُسے شروع سے خبروں سے دلچسپی تھی، کہیں جلودھر کے اثر میں نہ آ گیا ہو، کہیں لامذہب نہ ہو گیا ہو۔ جمعدار صاحب پریشان ہو گئے۔ بولے، ''اچھا دیکھ آؤ، مگر تم کیا جاؤ گے۔ تم آپ ہی اتنے کمزور ہو، ہمیں جاتے ہیں۔'' پھول محمد نے کہا، ''نہیں ہم دیکھ آتے ہیں۔'' یہ کہہ کے چل کھڑا ہوا، قدم زمین پر تیز بھی تھے اور مضبوط بھی جیسے خاص طور سے جمعدار صاحب کو دکھا رہا ہے کہ ہم ابھی کتنے مضبوط ہیں، تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ جمعدار صاحب سے بولا، ''چاچا ہم ٹھیک کہتے تھے، وہ وہیں ہے، ہمیں دیکھ کے دور سے بھاگ گیا، کیا بتائیں ہماری طبیعت آج کل اچھی نہیں۔ نہیں تو ہم سے کہاں بھاگ کے جاتا بٹیا کو ہم پکڑ لاتے۔ اور ہاں چاچا ہم نے عمدہ بچا کے مرنے کے بعد اسے لنگڑا لنگڑا کے چلتے دیکھا تھا، پاؤں میں پٹی بھی باندھے تھا، ہمارا خیال ہے وہ بھی سب کے ساتھ گیا تھا، پاؤں میں زخم کھا کے آیا تھا۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''تم فکر نہ کرو ہم دیکھ لیں گے۔'' اور خود فکر کرنے لگے، اگر وہ

لا مذہب ہو گیا تو اس کی ذمے داری ان پر بھی آئے گی، مگر وہ اسے پیٹ بھر کھانا کیسے دیتے، کہاں سے دیتے، لیکن مذہب کی باتیں تو انھیں بتانی چاہیے تھیں، جمعدار صاحب کا چہرہ یوں ہی زرد ہو گیا تھا، اب اور زرد پڑ گیا۔ انھیں خیال آیا کہ کہیں اسی طرح جگیر باپ بھی جلودھر کے اثر میں نہ آجائے۔ وہ موتی کو بیچ ہی ڈالیں کیا۔ کتنا روپیا ملے گا۔ بہت ملے گا تو بیس پچیس، مگر یہ روپیا کتنے دن چلے گا۔ نہیں وہ موتی کو نہیں بیچیں گے۔ موتی ان کی پیاری موتی۔ ان کے گھر کی بچھیا، انھوں نے ایسا خیال کیسے کیا، انھیں پسینہ چھوٹنے لگا۔ اتنے میں ایک موٹا تازہ آدمی آیا۔ کئی چھوٹی بڑی تیز چھریاں ایک رسّی میں بندھی اس کے ہاتھ میں تھیں۔ قصائی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا، ''ڈانگر بیچو گے؟''

جمعدار صاحب کو کاٹو تو خون نہیں، جیسے ان پر بجلی گر پڑی، جیسے انھیں سکتہ سا ہو گیا۔ ان کی نگاہیں چھریوں کی چمکتی ہوئی دھار پر پڑیں اور اُن کی آنکھیں خود بخود ہو گئیں۔ ان کے غم و غصہ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یہی بات کیا کم تکلیف دہ تھی کہ ان کی پیاری موتی کو قصائی خریدنا چاہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ اُسے ڈانگر قرار دے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ایسی بات سن کے وہ جانے کیا کر ڈالتے، مگر اس وقت ان کے منہ سے ایک ویسی ہی آواز نکل سکی جیسی کہ گائے کے حلق سے ذبح ہوتے وقت نکلتی ہے۔ قصائی نے کہا، ''سیدھے سے بات کیوں نہیں کرتے، اتنا غصہ کسے دکھاتے ہو، جاتے ہیں۔'' جاتے جاتے اتنا اور کہتا گیا، ''اسے بھوکوں مارنا چاہتے ہو۔ اچھا۔''

۴

ایک صبح کو پھول محمد نہیں آیا، جمعدار صاحب حال دریافت کرنے اس کے گھر گئے، گھر میں کچھ خاموشی خاموشی سی تھی، معلوم ہوا کہ جگیر باپ کا پانچ چھ برس کا بچہ، چھانو کا ہم عمر جس کے ہاتھ پاؤں کئی دن سے پھولے ہوئے تھے اور پیٹ دھنسا ہوا تھا۔ رات کو مر گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ کوئی رو دھو نہیں رہا تھا۔ اس کی ماں لاش کے پاس کچھ بیگانی بیگانی سی بیٹھی ہوئی تھی، جیسے اس کا بچہ ہی نہیں، جیسے اسے ایک مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔ جگیر باپ کا بھی یہی حال تھا، پھول محمد کی آنکھوں میں

البتہ کچھ سوکھے سے آنسو تھے، بجیر باپ خاموشی سے اٹھا۔ جمعدار صاحب کے یہاں سے پھاوڑا لے آیا، اور مکان کے چھوٹے سے صحن میں گڑھا کھودنے لگا۔ جمعدار صاحب سے پوچھتے نہ بنا کہ قبر خود کیوں کھود رہا ہے، گورکن کو کیوں نہیں بلاتا۔ گورکن مفت تو آتا نہ۔ اسے روپیا دینا پڑتا۔ روپیا کہاں تھا اور ہوتا بھی تو اسے مردوں پر خرچ کرنے کی بجائے زندوں پر کیوں نہ خرچ کیا جاتا، یہ بات، بغیر بتائے خود بخود جمعدار صاحب کے ذہن میں آ گئی اور جمعدار صاحب نے خاموشی سے اٹھ کے بجیر باپ کے ہاتھ سے پھاوڑا لے لیا۔ وہ شل ہو رہا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سنے چپکے سے بڑھا دیا۔ جمعدار صاحب نے پانچ چھ ہاتھ چلائے، پھر تھک کر بیٹھ گئے۔ پھول محمد نے بھی دو تین اُچٹتے ہوئے ہاتھ مارے، پھر ہانپ کر گر پڑا۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں باری باری تینوں نے تھوڑا تھوڑا کھودا، قبر کھودنے کی ان میں سے کسی کو نہ مشق تھی نہ سکت۔ بڑی مشکل سے اتنا گڑھا کھدا کہ جسم اس میں چھپایا جا سکے، بجیر باپ چاہتا تھا کہ بچہ جس طرح ننگا دھڑنگا مرا پڑا تھا اسی طرح دفن کر دیا جائے۔ جمعدار صاحب سے اب نہ رہا گیا، پوچھا، ''کفن کا کیا انتظام کیا ہے؟'' بجیر باپ نے کہا، ''کچھ نہیں۔'' اس ''کچھ نہیں'' میں بڑی تلخی طنز اور بے بسی سمٹ آئی تھی، جیسے وہ کہہ رہا ہو، ''قبر کو لاش چاہیے کہ کفن''۔ جمعدار صاحب گھر سے اپنے اوڑھنے کی دھلی ہوئی چادر لے آئے۔ ماں نے بچے کو اپنے ہاتھ سے نہلایا۔ نہلاتے وقت بھی بیگانگی کا انداز قائم رہا۔ جب بچے کو چادر میں لپیٹ کر اٹھایا جانے لگا تو اس وقت ایک چیخ اس کے منہ کو چیرتی ہوئی نکلی جیسے اسے دفعتاً بچے کے مرنے کا احساس ہوا ہو۔ اس کے بعد نڈھال ہو کے پڑ گئی، منہ آنچل میں چھپا کے۔ لاش دفن کر دی گئی، دفن کیا گئی تھوڑی سی مٹی سے ڈھانک دی گئی۔ سامنے ایک بلی ایک اپنی گندگی چھپا رہی تھی، بجیر باپ نے ایسے منظر پہلے بھی دیکھے تھے، مگر نہ دیکھنے کے برابر، اور ان کا خیال بھی نہ کیا تھا، لیکن آج اسے بڑا غصہ آیا اور اُس نے بلی کو ایک ڈنڈا کھینچ کے مارا۔ جمعدار صاحب ایک سناٹے کے عالم میں گھر واپس ہوئے۔ وہ بچہ بھی چھانو ہی کی عمر کا تھا۔ انھوں نے چھانو کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی سوجے نظر آئے۔ کہیں پریشانی کی وجہ سے ان کی نگاہیں تو انھیں دھوکا نہیں دے رہی تھیں۔ انھوں نے ہاتھ سے چھوا، بدن تو

ایسا خاص گرم نہ تھا، لیکن جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے انگلی انگارے پر پڑ گئی۔ ہاتھ پاؤں پر واقعی سوجن تھی۔ جمعدار صاحب سر پکڑ کر چوکی پر بیٹھ گئے۔ نہ ہو موتی کو بیچ ہی ڈالیں، مگر نہیں۔ اچھا یہ چوکی دو کی انھوں نے کیوں رکھ چھوڑی ہے۔ آخر کس دن کام آئے گی۔ اسے کیوں نہ بیچ ڈالیں۔ سونے کا کیا، زمین پر سو رہا کریں گے۔ آخر کتنی مخلوقِ خدا کے لیے زمین ہی تخت و پلنگ کا کام دیتی ہے۔ سرت ساہا کے ہاں گئے۔ وہ بری مشکل سے دس روپے دینے پر راضی ہوا۔ دس روپے کے اس کے عوض میں سات سیر چاول حوالے کیے۔ جمعدار صاحب نے تین سیر چاول ججیر باپ کے ہاں پہنچا دیے۔ ایک ایک سیر گیدو کی ماں اور ہاجرہ کو دیا اور دو سیر گھر کے لیے رکھا۔

۵

جلودھر اور مخلص اس اہم معاملے پر غور کرنے بیٹھے جو اُن کے سپرد کیا گیا تھا۔ بڑی مشکل یہ نظر آئی کہ جلودھر کو ہر شخص پکا کمیونسٹ سمجھتا تھا۔ جہاں جہاں قابلِ ذکر لڑکیاں تھیں۔ وہاں وہاں جلودھر کا آنا جانا نہ تھا، اور اب وہ کسی بہانے سے جا بھی نہ سکتا تھا۔ مخلص کا جی تو چاہ رہا تھا کہ اس پر لطف فرض کو وہ خود انجام دے، اور زمیندار بابو کے ہاں سے شروع کر کے سرت ساہا تک اپنی خدمت بحیثیت پرائیویٹ ٹیوٹر کے پیش کرے، شاید کہیں قسمت لڑ جائے، لیکن دل کی بات زبان پر نہ آ سکی۔ اس نے حدیث دیگراں کے طور پر سلطان میاں کا ذکر چھیڑ دیا۔ اگر انھیں اس کام میں لگایا جائے تو کیسا رہے گا، دونوں کی یہ رائے ہوئی کہ ''چھلتان میاں'' پر نہ تو ان لوگوں کی صحبت کا زیادہ اثر ہوا ہے نہ اشتراکیت کا، ان کی دقیانوسیت بدستور قائم ہے اور کم سے کم عورت کے معاملے میں وہ بلا شرکت غیرے کے قائل ہیں۔ اشتراکیت کے نہیں، زن مرید بھی واقع ہوئے ہیں اور مذہبی بھی، یعنی کسی غیر عورت کی طرف توجہ کرنا گناہ سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ اس کام کے نہیں، اس کے بعد موقع تھا کہ مخلص اپنا ذکر چھیڑے، مگر بات زبان تک آ آ کے رہ گئی۔ بات دراصل یہ تھی کہ جلودھر ہندو مسلمان کے فرق کو تو چنداں نہ مانتا تھا اور مخلص کو کچھ ایسا مسلمان بھی نہ سمجھتا تھا، مگر معلوم نہیں کیوں اسے یہ بات پسند نہ تھی

کہ مخلص ان ہندو لڑکیوں سے ربط پیدا کرے اور مخلص کو بھی اس کا احساس تھا، تھوڑی دیر تک یہ لوگ پاس پاس خاموش بیٹھے رہے جیسے ایک دوسرے کے دل کی کتاب پڑھ رہے ہوں، پھر ''مہا مشکل'' کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جلو دھر نے کہا، ''کوئی لڑکی ساتھ ہوتی تو ضرور اچھا تھا، مگر....''

جلو دھر کے بجائے مخلص نے جملہ پورا کیا، ''مگر اب کیا کیا جائے۔''

جلو دھر نے کہا، ''پارٹی ہماری محبوبہ ہے، ہمیں کسی اور محبوبہ کی ضرورت نہیں۔''

اب تک کسی لڑکی ضرورت کا ذکر بحیثیت پارٹی کے کارکن کے آتا تھا۔ جلو دھر نے اس وقت پہلے پہل محبوبہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ شادی بے خیالی میں، اس کا مطلب پارٹی سے رہا ہوگا۔ لڑکی سے نہیں۔

۶

مولانا مستنصر باللہ کے پیر صاحب اکثر دورے پر رہتے، کئی سال پہلے وہ اس دھوم دھام سے دورے پر جاتے۔ جیسے بارات جاتی ہو، اس بارات کے دولھا وہ خود ہوتے اور باراتی مریدانِ خوش عقیدت، ایک شاندار بجرا خاص ان کا ہوتا۔ اس کے علاوہ متعدد بجرے اور کشتیاں انواع واقسام کی اجناس چرند پرند اور میووں سے دی پھندی ساتھ ہوتیں۔ ایک دفعہ وہ دورہ کرتے کرتے سلہٹ پہنچے۔ حضرت شاہ جلال کے مزار پر حاضر ہوئے، وہاں ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔ اس میں بظاہر کوئی خاص بات معلوم نہ ہوتی تھی۔ سوائے اس کے کہ اس میں کوئی تصنع نہ تھا۔ لباس صاف اور سادہ تھا اور جسم پاکیزہ۔ چہرے پر ایک بشاشت ہر وقت کھیلتی رہتی تھی اور بات کم کرتا۔ پیر صاحب کا جلوس جب مزار کی طرف بڑھ رہا تھا تو ہٹو بچو کے انداز میں مرید راستہ صاف کرتے چل رہے تھے۔ وہ شخص بھی راستے میں پڑ گیا، اسے مریدوں نے ہٹانا چاہا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگا۔ انھوں نے کہا، ''اے مسکراتے کیا ہو، ہٹو، پیر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔''

وہ مسکرا کے علیحدہ ہٹ گیا۔ پیر صاحب جب پاس سے گزرے تو اس نے قران شریف کی ایک آیت [لا تمش فی الارض مرحا.] تلاوت کی جس کے معنی تھے کہ ''زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ کیا زمین کا سینہ پھاڑ دو گے یا پہاڑ کے جتنے اونچے ہو جاؤ گے؟'' پیر صاحب چونک پڑے۔ پوچھا یہ کون ہے؟ مریدوں نے کہا، ''ایک بے ادب آدمی۔'' پیر صاحب آگے تو بڑھ گئے، مگر اب ان کی چال میں نرمی تھی۔ اس شخص کی آواز ان کے کانوں میں ہر وقت گونج رہی تھی۔ جب وہ مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے تو اس وقت بھی یہ آواز ان کے کانوں میں گونجتی رہی۔ فاتحہ جب ختم کر کے واپس ہوئے اس وقت بھی وہ شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پیر صاحب پر اس نے ایک نظر ڈالی اور مزار کی طرف چل پڑا۔ پیر صاحب نے ایک نئی قسم کی کشش محسوس کی اور مزار کی طرف واپس ہوئے۔ مرید حیرت سے دیکھنے لگے، پیر صاحب نے مریدوں کو تخلیے کا حکم دیا اور تنہا مزار کے گنبد میں داخل ہوئے، وہاں پیر صاحب برآمد ہوئے تو اُن کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ اس دن سے پیر صاحب کی کایا پلٹ گئی، انھوں نے جملہ طمطراق کو خیر باد کہا اور بڑی مسکینی سے اپنی اور دوسروں کی اصلاح میں لگ گئے۔ وہ اپنے ساتھ ان مریدوں کے علاوہ جو زیرِ تربیت ہوتے کسی کو نہ لیتے، ایک وقت سے زیادہ کی دعوت قبول نہ کرتے اور اس میں بھی یہ اصرار کرتے کہ روزمرہ کے کھانوں کے علاوہ کچھ نہ ہو، مولانا مستنصر باللہ کے پاس بھی وہ ہدائیت کے طور پر آئے تھے۔ جمعدار صاحب جس دن سے ان سے ملے تے، اُن کے دل میں ایک لگن سی لگ گئی تھی اور وہ اکثر ان کے پاس جا کر بیٹھا کرتے۔ ایک دفعہ جمعدار صاحب جو گئے تو دیکھا کہ پیر صاحب بیٹھے مولانا کو سورۂ رحمٰن کا درس دے رہے ہیں۔ جمعدار صاحب سلام کر کے مؤدب بیٹھ گئے۔ سورۂ رحمٰن کا آہنگ جمعدار صاحب کو بہت بھایا۔ ''فبای الآء ربکما تکذبان'' کی تکرار سے انھیں لطف آنے لگا۔ پیر صاحب معنی سمجھا رہے تھے اور خدا کی نعمتوں کی تفصیل بتا رہے تھے، نہ محض آرام و آسائش نعمتیں ہیں، بلکہ آلام و آزمائش بھی۔ پس انسان اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائے گا۔ جمعدار صاحب محسوس کرنے لگے کہ آلام و آزمائش کو نعمت سمجھنا تو درکنار وہ اکثر آرام و آسائش کو بھی معمولی چیز سمجھتے آئے ہیں۔ پیر صاحب ''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ

يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَام" پر پہنچے اور اس کے معنی سمجھانے لگے۔ پر پہنچے اور اس کے معنی سمجھانے لگے۔ ہر چیز کو فنا ہے ہر وہ چیز جو پیدا ہوئی ہے ایک دن فنا ہو جائے گی اور بقا صرف رب العزت کو ہے۔ جو صاحب جلال بھی ہے اور صاحب اکرام بھی جس نے اپنے اکرام سے انسان کو نعمتیں بخشی ہیں، وہ نعمتیں جنھیں وہ نعمتیں نہیں سمجھتا اور جھٹلاتا جاتا ہے۔ پیر صاحب کا روئے سخن اگرچہ مولانا مستنصر باللہ کی طرف تھا، لیکن جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پیر صاحب براہِ راست اُن کے دل سے گفتگو کر رہے ہیں اور اُن کا دل سن سن کے لرز رہا ہے، جب درس ختم ہوا تو پیر صاحب کی آنکھیں نم تھیں۔ مولانا کے رخسار پر آنسو ڈھلک رہے تھے اور جمعدار صاحب کے کرتے کا دامن تر بہ تر تھا۔

۷

قحط کی مار ہری منڈل پر بھی پڑی۔ جمعدار صاحب کے رہن بالقبض والے کھیت میں اب تک کوئی فصل نہ ہوئی تھی، خود اُس کا کھیت بھی مرجھا چکا تھا۔ ایک رات یہ کھیت پھر غائب ہو گیا۔ اس رات کو طوفان آیا تھا نہ آندھی، مگر پھر بھی کھیت غائب تھا، کوئی ضرور چرا لے گیا تھا۔ ہری منڈل بے چارہ ہر طرف مارا مارا پھرا، لیکن کھیت کا سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ ہری منڈل تو ہم پرست آدمی تھا، اسے وہم ہوا کہ جمعدار صاحب نے اسے کوئی سراپ نہ دی ہو۔ کھیت انھیں کے پاس رہتا تو اچھا تھا، آخر کوئی دوسرا چرا لے گیا نا۔ ہری منڈل کے بچے بھی قحط کا شکار ہونے لگے۔ بیٹھے بیٹھے گال، دھنسی دھنسی آنکھیں، ابھری ابھری پسلیاں اس کے گھر میں بھی رینگنے لگیں۔ ہری منڈل گھبرایا ہوا جمعدار صاحب کے پاس آیا۔ اس نے انھیں کچھ ہی مہینے پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ فاقہ زدہ تھے، مگر اب قحط زدہ نظر آئے۔ اُن کی حالت دیکھ کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا، "کاکا آپ اپنا کھیت واپس لے لیں۔"

جمعدار صاحب یہ سن کے سناٹے میں آ گئے۔ سمجھے شاید اسے ان کی خستہ حالی کی خبر ہو گئی

ہے اور وہ ان پر ترس کھا کے کھیت واپس کر رہا ہے، ان کی رگِ حمیت جوش میں آئی۔ کھوئی ہوئی نگاہیں سکیٹر کے گھورنے لگیں۔ کمزور آواز میں بچی کچھی طاقت کھنچ آئی۔ انھوں نے گھٹی ہوئی چیخ کے انداز میں پوچھا، ''کیوں؟''

ہری منڈل، ''بس چاچا لے لیں۔''

''ہم پر ترس کھا رہے ہو؟''

''نہیں چاچا نہیں۔''

''ہم سال بھر سے پہلے کھیت واپس نہیں لے سکتے۔''

''چاچا بڑی دیا ہوگی کھیت واپس لے لیں۔ اپ کا کھیت ہمیں پھلا نہیں، جب سے ہم نے لیا ہے ہمارا گھر تباہ ہو رہا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جمعدار صاحب کچھ کھو سے گئے۔ تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے، ہری منڈل آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور سر جھکائے جانے لگا۔ جمعدار صاحب نے جب دیکھا تو کچھ دور جا چکا تھا۔ انھوں نے آواز دے کے اسے واپس بلایا اور کہا، ''ہمارا اس کھیت پر ابھی کوئی حق نہیں، ہمیں تو وہ اور بھی نہیں پھلے ہم نہیں لے سکتے۔''

''تو آپ اپنی سراب واپس لے لیجیے۔''

''کیسی سراپ؟— کہہ کیا رہے ہو؟''

''تو آپ نے سراپ نہیں دی۔''

''ہمیں سراپ دینی ہوتی تو ہم کھیت کیوں دیتے۔''

ہری منڈل واپس چلا، راستے بھر جمعدار صاحب کی شخصیت اس کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ وہ اب تک یہی سمجھتا تھا کہ مسلمان بہت برے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ جمعدار صاحب جو اتنے اچھے آدمی ہیں وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہیں یا باوجودِ مسلمان ہونے کے۔

۸

عمدہ میاں کے مرنے کا مولوی نورالابصار کو بھی بڑا غم تھا۔ عمدہ میاں نے انھیں اپنے حصے کی مسجد کا امام مقرر کیا تھا۔ یہ خیال کر کے خاص طور سے ان کا دل دکھتا تھا کہ عمدہ بیوہ کچھ دن دوبارہ عمدہ بیوی رہنے کے بعد پھر عمدہ بیوہ ہوگئی تھیں۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کے انھیں برابر قریب قریب پیٹ بھر کے کھلاتی رہی تھیں۔ ان کے احسان کے بوجھ سے وہ دبے جاتے تھے۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح اس احسان کا بدلہ چکا سکیں۔ ان کا جذبۂ احسان ان کی آواز میں حل ہوا جارہا تھا۔ اب اس آواز میں بڑی مٹھاس پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اذان بڑے سریلے پن سے دینے لگے تھے۔ جگیر باپ کے حصے کی مسجد بند ہو چکی تھی۔ اس کے مؤذن صاحب جا چکے تھے۔ مولوی نورالابصار کے بھائی مولوی نورالانوار بھی اپنے گھر نواکھلی چلے گئے۔ جمعدار صاحب کے یہاں سے انھیں کھانا برابر ملتا رہا تھا، مگر اس سے ان کا پیٹ آدھا ہی بھرتا تھا۔ وہ کب تک اس تکلیف کو برداشت کرتے۔ پھر انھیں یہ احساس بھی ستاتا تھا کہ جمعدار صاحب اپنا اور اپنے بیوی بچے کا پیٹ کاٹ کے انھیں کھلا رہے ہیں۔ اگر وہ چلے جائیں تو یہی کھانا دوسروں کے کام آئے گا۔ چنانچہ وہ ایک دن جمعدار صاحب سے گھر میں کام کا بہانہ کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ جمعدار صاحب اپنی مسجد میں خود اذان دینے لگے تھے، مگر ان کی آواز میں جان باقی نہ تھی، مسجد سے باہر اذان کی آواز بمشکل جاتی۔

اب مولوی نورالابصار ہی کے سر اس ٹیلے پر اللہ کا نام بلند کرنے کی ذمے داری آن پڑی تھی وہ اسے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے، ان کی لہکتی اور للکارتی ہوئی آواز سارے ٹیلے پر پانچوں وقت گونجتی، خاص طور سے فجر اور عشا کے وقت تو دور دور تک جاتی۔ عمدہ بیوہ اس خیال سے خاص طور سے متأثر تھیں کہ مولوی نورالانوار کے چلے جانے کے باوجود مولوی نورالابصار نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا تھا، ان کے بچوں کو کھلاتے بھی وہی تھے، گھر کا سودا سلف بھی وہی لاتے اگر وہ بھی اپنے بھائی کی طرح چلے جاتے تو عمدہ بیوہ کیسی مشکل میں ''گر جاتیں۔'' ایک دن عمدہ بیوہ نے بانس کی دیوار

کی آڑ سے کہا، ''مولوی صاحب ہم آپ کا احسان نہیں بھول سکتے۔'' مولوی صاحب کا چہرہ جواب دیتے وقت سرخ ہوگیا۔ ''بولے، ''میں تو آپ کا غلام ہوں۔'' بات چیت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مولوی صاحب وقتاً فوقتاً قال اللہ وقال الرسول کے بعد یہ کہا کرتے تھے کہ زندگی ایک گاڑی ہے جس کے دو پہیے ہوتے ہیں، ایک مرد ایک عورت ایک مرد۔ جب تک دونوں پہیے نہ ہوں گاڑی نہیں چل سکتی۔ عمدہ بیوہ کے دل کو یہ بات لگی۔ وہ خود بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھیں۔ عمدہ میاں کے مرنے کے بعد سے ان کی زندگی کی گاڑی کا ایک پہیہ گر گیا تھا۔ اگر مولوی نورالابصار اس پہیے کی جگہ اپنا کندھا نہ لگا دیے ہوتے۔ تو گاڑی کب کی گر گئی ہوتی۔ الغرض تھوڑی بہت شرما شرمی کے بعد مولوی صاحب اس گاڑی کا باضابطہ پہیہ بن گئے اور گاڑی بہت عمدگی سے ازسرِ نو چلنے لگی۔ مولوی صاحب منتظم آدمی تھے۔ انھوں نے عمدہ بیوی کے کھیتوں کا معقول انتظام کیا۔

ان کھیتوں میں اب عمدہ میاں کے کھیت بھی شامل تھے۔ پہلی فصل اپنی ذاتی نگرانی میں بوائی۔ کھانا اتنا پکنے لگا کہ مولوی صاحب کو دو وقت کھانے کے بعد پیٹ سہلانے اور ڈکار لینے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس قسم کی ڈکار جیسی سرت ساہا، نگن بابو اور پنیر میاں لیا کرتے تھے۔

۹

ایک ہفتے کے اندر اندر جگیر باپ کے تین بچے تابڑ توڑ مر گئے۔ گیدو کی ماں کے بھی ہاتھ پاؤں پھول آئے۔ ایک دن وہ بی بی جان کے پاس ائی۔ دونوں ایک دوسرے کے حال پر تھوڑی دیر تک چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں، کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ بالآخر بی بی جان ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی اٹھیں اور تھوڑی سی پیچ لے آئیں۔ گیدو کی ماں کھاتے وقت سر جھکائے رہی۔ جیسے وہ اپنے جذبات چھپانا چاہتی ہے۔ کھانے کے بعد اس نے بہت سا پانی پیا اور پڑ رہی۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی تو وہ چھانو کے پاس گئی۔ چھانو لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پہلے سے بھی زیادہ پھولے ہوئے

تھے۔ گیدو کی ماں کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ اس نے اسے لپٹا کے پیار کیا، پہلے تو وہ گیدو کی مان کو دیکھتے ہی گڑ چیوڑا مانگا کرتا، مگر اب اتنے دنوں سے گڑ چیوڑا کا سلسلہ بند تھا کہ اس نے مانگنا چھوڑ دیا تھا۔ گیدو کی ماں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا، ''میاں گڑ چیوڑا لوگے؟''

چھانو کی آنکھوں میں مسکراہٹ آ گئی اور اس نے بڑی بے تابی سے پوچھا، ''کہاں ہے؟'' گیدو کی ماں نے کہا، ''یہ لو۔'' اُس کے دامن کے کھونٹ میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کھولی تو تھوڑا سا چیوڑا نکلا اور ذرا سا گڑ۔ بی بی جان نے کہا، ''رہنے دو۔ وقت بے وقت کام آئے گا۔'' گیدو کی ماں نے کہا، ''چھانو میاں سے بڑھ کر کون کھانے والا ہے۔'' اور چھانو کو تھما دیا۔ چھانو نے جھٹ سے منہ میں رکھ لیا۔ گیدو کی ماں بڑی محبت سے دیکھتی رہی۔ پھر ایک پیار کر کے چلی گئی۔

۱۰

مسلسل فاقے کی وجہ سے جمعدار صاحب کا جسم تو گھل ہی رہا تھا، لیکن اس صدمے سے ان کی روح بھی گھلی جا رہی تھی کہ جھیر باپ کے بچے یکے بعد دیگرے مرے جا رہے ہیں، گیدو کی ماں کا بھی چل چلاؤ معلوم ہوتا ہے۔ پھول محمد کملایا جا رہا ہے، ہاجرہ کا حال بھی سقیم ہے۔ خود چھانو کی حالت جھیر باپ کے بچوں کی سی ہو رہی ہے۔ چھانو کا خیال آتے ہی اُن کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ گرتے پڑتے سرت ساہا کی دکان پر پھر پہنچے اور بولے، ''سرت بابو دیکھو ہم پھر تمھارے ہاں آئے ہیں۔''

سرت، ''بڑی دیا کی۔''

جمعدار صاحب کو دھکا سا لگا۔ بولے، ''نہیں بھیا دیا تم کرو۔ ہمیں پانچ سیر چاول اُدھار دے دو۔ ہمارے گھر میں فاقہ پڑ رہا ہے۔ چھانو کے ہاتھ پاؤں پھول آئے ہیں۔ ہم تمھارا ادھار واپس کر دیں گے۔''

سرت، ''آج کل ادھار کہاں ملتا ہے۔ آج کل نقد کا سودا ہے نقد کا، میاں صاحب۔''

''بھیا نقد نہیں ہے۔''

''تو ہم کیا کریں۔''

''دیا کرو۔''

''دیا کریں گے تو دیا بھر ہی کے ہو جائیں گے۔ سُرگ باشی پتا جی کہا کرتے تھے کہ لکشمی جی اسی پر دیا کرتی ہیں جس کے دل میں دیا نہیں ہوتی۔''

جمعدار صاحب، ''اچھا ہمارا ایک کھیت ہری منڈل کے پاس رہن ہے تھوڑے دن کے بعد چھوٹے گا تو تم لے لینا۔''

''جب چھوٹے گا تب آنا۔''

جمعدار صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کہیں اور کیا کریں۔ تھوڑی دیر خاموش کھڑے رہے۔ سرت ساہا نے کہا، ''گھر میں اور بھی چیزیں تو ہوں گی بیچ کیوں نہیں ڈالتے۔''

''بھیا اب کیا ہے سب تو بیچ ڈالا، بی بی جان کے زیور، گھر کے برتن، جن چوکیوں پر سوتے تھے وہ بھی بیچ دیں۔ اب پھٹے پرانے کپڑے رہ گئے ہیں، خریدو تو انھیں بھی بیچ دیں۔''

''اور کچھ نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''کیا موتی کو بھی بیچ ڈالا؟''

''نہیں۔''

''پھر؟''

جمعدار صاحب کچھ جواب نہ دے سکے، سخت پریشانی کی حالت میں واپس ہونے لگے۔ سرت ساہا نے کہا، ''دام لے آؤ تو تھوڑا سا لیمن چوس بھی لے جاؤ۔ چھانو کے لیے تازہ تازہ آیا ہے۔''

جمعدار صاحب رک گئے۔ امید بھرے انداز میں بولے، ''اچھا تھوڑا سا لیمن چوس ہی دے دو۔ دام بعد میں دے دیں گے۔''

سرت ساہا نے کہا، ''تم بھی بڑے بے حیا ہو۔''

جمعدار صاحب کے دل میں گھونسا سا لگا، اگر انھیں بانس کے کھمبے کا سہارا نہ مل گیا ہوتا تو وہ ضرور گر پڑتے، سرت ساہا نے اگر پہلے کبھی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ اس کی جان لے لیتے، مگر وہ پہلے کہتا ہی کیوں۔ جمعدار صاحب صرف ''اچھا بھیا'' کہہ سکے اور چلے آئے۔ جب غم و غصہ کم ہوا تو انھوں نے کچھ کچھ سوچنا شروع کیا انھیں سچ مچ موتی کو بیچنا ہی پڑے گا کیا۔ نہیں، کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

بی بی جان کو انھوں نے سب حال بتایا۔ بی بی جان کو بھی موتی کے بیچنے کے خیال سے سخت تکلیف ہوئی۔ پھر چھانو کا خیال آیا، اسے کتنا صدمہ ہوگا۔ جمعدار صاحب گھبرا کے باہر چلے گئے۔ پھول محمد آج اب تک نہ آیا تھا۔ دوپہر ہو رہی تھی۔ وہ سیدھے اس کے گھر گئے دیکھا، قمیص لپ سے نکلا اور نو دو گیارہ ہو گیا۔ پھول محمد لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ورم تھا۔ جمعدار صاحب نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ پوچھا، ''طبیعت کیسی ہے بچہ۔''

''اچھی ہے چاچا، ذرا کمزوری ہے بس۔''

''کچھ کھایا پیا ہے؟''

''پھول محمد چپ رہا۔

''بتاؤ۔''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''ہمیں خالی پیاس لگی تھی پانی پی لیا۔''

جمعدار صاحب کے دل پر چوٹ لگی اٹھ کر جانے لگے۔

پھول محمد نے کہا، ''چاچا بیٹھیے نا، ہماری طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

''اچھا بچہ۔''

جمعدار صاحب بیٹھ کے پھول محمد کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ انھوں نے کہا، ''ہم نے قمیص کو یہاں سے جاتے دیکھا تھا، تمھارے پاس آیا تھا؟''

''ہاں چاچا۔''

''اچھا، کیا کہتا تھا۔''

''اس کی بات جانے دیجیے۔''

''نہیں بتاؤ۔''

''وہ جلودھر کے دَل میں مل گیا ہے۔ اسی سب کی بات کرتا تھا۔ ہاں چاچا یہ دَل تو بڑا کام کرتا ہے۔ اس دَل کے لوگ اپنے آرام کا خیال نہیں کرتے، بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتے ہیں قربانیاں کرتے ہیں، دَل جو حکم دیتا ہے اُسے ایسا سمجھتے ہیں جیسے نماز روزہ، ہر وقت پبلک کی بھلائی کے کام میں لگے رہتے ہیں، اور چاچا سنیے، ہم تو سن کے حیران رہ گئے۔ یہ لوگ جو کماتے ہیں سب دَل کو دے دیتے ہیں اور وہاں سے صرف بیس روپے لیتے ہیں، اسی میں کام چلاتے ہیں۔ دَل کا ممبر ہر ایک تھوڑی ہو سکتا ہے۔ بہت دن تک آدمی کو امیدوار رہنا پڑتا ہے اور اپنے کام سے ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہ ممبر بننے کے لائق ہے، تب کہیں جا کے ممبر بنایا جاتا ہے۔ چاچا یہی سب باتیں ہم لوگ مسلم لیگ میں کیوں نہیں کرتے۔''

''مسلم لیگ جانے، ہیں تو میں بھی مسلم لیگ لیکن ابھی تو میں خالی ووٹ دے سکتے ہیں۔ جیسے پنیر میاں کو دیا، بس۔ (پھر تھوڑا سوچ کے) یہ سب کہنے سے قمیص کا مطلب کیا تھا۔''

''قمیص نے یہ سب بات آج ہی تھوڑی بتائی، برابر بتایا کرتا ہے اور ہم بھی پتا لیا ہے۔''

''مگر قمیص کا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم کو بھی ملانا چاہتا تھا۔''

جمعدار صاحب سوچنے لگے آخر کیا کہتا ہوگا۔ یہی نا کہ جمعدار صاحب کے پاس کھانے کو نہیں اور جلودھر کے پاس ہے؟ جمعدار صاحب نے جی کڑا کر کے پوچھا، تو تم نے کیا کہا۔''

''چاچا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، جایئے ہم آپ سے نہیں بولتے۔''

١١

جمعدار صاحب سرت ساہا کی دکان پر کھڑے کہہ رہے تھے، ''سرت بابو، سرت بابو۔''

سرت کوئی نوٹس نہ لے رہا تھا۔ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ تھا، جمعدار صاحب کے کئی دفعہ پکارنے کے بعد ذرا غصے کے لہجے میں بولا، ''کیا ہے، دام لائے؟''

''ہم کہتے ہیں.....''

''ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔ دام چاہتے ہیں۔ دام ہو تو بڑھاؤ۔ ورنہ راستہ ناپو۔''

''سنو تو بھیا۔''

''ہمارے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔''

''ہم یہ کہنے آئے ہیں کہ ہم موتی بیچ رہے ہیں، خریدو گے؟''

''اب وہ کس کام کی ہے۔ ہڈی چمڑا رہ گیا ہے۔ اب تو اس کا بچنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ سال بھر کھلاؤ تب کہیں جا کے چھٹانک بھر دودھ دے۔''

جمعدار صاحب کو برا لگا۔ ان کی موتی کو چھٹانک بھر دودھ دینے والی گائے سمجھ رہا ہے۔ کہنے لگے، ''نہیں بھیا سیر دو سیر دودھ دیتی تھی۔''

''دیتی رہی ہو گی، اب کیا بات کرو اب کی۔''

''تم ہی تو خریدنے کو کہہ رہے تھے۔''

''ہم خود خریدنے کو تھوڑی کہہ رہے تھے، مطلب یہ تھا کہ اسے بیچ کے ہمیں دام دو۔''

''اور کون لے گا۔''

''ہم کیا ٹھیکے دار ہیں، گاؤں میں دیکھو نا۔''

جمعدار صاحب تمام گھومے پھرے، مگر کوئی خریدنے پر راضی نہ ہوا۔ سب وہی کہیں جو

سرت ساہا نے کہا تھا، جمعدار صاحب گھر واپس ہوئے۔ بی بی جان سے حال بتایا۔ سینے پر پتھر رکھ کے وہ بیچنے پر راضی ہوئی تھیں، مگر اب جو سنا کہ کوئی خریدنے پر تیار نہیں تو انھیں کچھ مایوسی ہوئی۔ پوچھا، ''پھر کیا کرو گے؟'' بولے، ''کیا بتائیں۔'' اور چپکے سے لیٹ رہے۔ جب ذرا آنکھ لگتی تو چھریاں تمام چم چم چمکتی نظر آتیں۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک چھریاں ہی چھریاں بھر گئی ہیں۔ کبھی گائے بھینسیں ذبح کی ہوئی دکھائی دیتیں، ان کی موتی بھی ٹانگ بندھی ہوئی پڑی نظر آتی۔ اس کی آنکھیں خوف سے نکل پڑتیں، ایک موٹا سا آدمی اسے دبا کے بیٹھتا، ایک اور بھیانک سا آدمی چٹ پٹ چھری تیز کرتا، انگلی سے دھار کی تیزی دیکھتا۔ موتی کے گلے پر چھری پھیرنے کے لیے بڑھتا، جمعدار صاحب کی گھبرا کے آنکھ کھل جاتی۔ پھر تھوڑی دیر میں آنکھ لگتی۔ دیکھتے آدمی ذبح کیے جا رہے ہیں۔ خود جمعدار صاحب کو بھی ہاتھ پاؤں باندھ کے ڈال دیا گیا ہے۔ اور......اور چھانو کو بھی، چمکتی ہوئی چھری ان کے گلے کی طرف بڑھتی اور وہ دہشت زدہ ہو کے اٹھ بیٹھتے، صبح ہوتے ہوتے جمعدار صاحب کی حالت ایسی تھی کہ زندہ کم تھے اور مردہ زیادہ، باہر جا کے لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر میں چھانو لڑکھڑاتا ہوا آیا۔ جمعدار صاحب سے پوچھنے لگا، ''موتی کہاں ہے؟''

جمعدار صاحب ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے۔ دیکھا موتی غائب ہے، کیا ہو گئی، کوئی چرا تو نہیں لے گیا۔ کہیں وہی قصائی نہ لے گیا ہو۔ جمعدار صاحب یکا یک اس طرح کانپنے لگے۔ جیسے انھیں ملیریا ہو گیا ہے، اتنی دیر میں موتی بین بین کرتی لہولہان آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ رات کو چھٹ گئی تھی اور کسی کا کھیت چر رہی تھی، کسی نے بے دردی سے مارا تھا، گنڈا سے سے۔ چھانو اس سے لپٹ گیا۔ جمعدار صاحب بھی اسے سہلانے لگے۔ قصائی پھر آتا نظر آیا۔ جمعدار صاحب کا ایک جی چاہا گھر کے اندر چلے جائیں، مگر گئے نہیں۔ کھڑے رہے۔ جیسے اس کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آیا تو مگر اس نے جمعدار صاحب کی طرف رخ نہ کیا۔ بات کرنا تو دور کنار، ایک کنارے سے گزرنے لگا۔ جمعدار صاحب اسے دیکھتے رہے دیکھتے رہے کہ اب شاید کچھ کہے، مگر اس نے اب کہا نہ تب۔ جب وہ نظر سے غائب ہونے لگا تو جمعدار صاحب کے منہ سے نکلا، ''او بھائی۔'' قصائی نے مڑ کے دیکھا۔

''ذرا سنو۔''

''کیا ہے؟''

''سنو تو۔''

وہ ان کے پاس آیا۔ پوچھا، ''تو اب بیچنے پر راضی ہوئے؟'' جمعدار صاحب نے کہا، ''مگر تمھارے ہاتھ نہیں، اگر کوئی گھر گرہست لینا چاہے تو ہم بیچ دیں گے، تم کسی کو جانتے ہو؟''

قصائی تجربے کار آدمی تھا۔ اس نے جمعدار صاحب کو سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر موتی کی طرف بڑھا یہ کہتا ہوا، ''اچھا دوسرے ہی کے ہاتھ بیچ دیں گے، لاؤ۔'' اس نے جمعدار صاحب کے ہاتھ میں پندرہ روپے کے نوٹ بڑھا دیے۔ موتی کا مول بھاؤ کرنے کو جمعدار صاحب کا جی نہ چاہا۔ زبان پر جیسے تالے لگ گئے۔ انھوں نے بغیر کچھ کہے روپیا لے لیا۔ قصائی موتی کو ہنکا کے لے جانے لگا۔ چھانو موتی سے لپٹ گیا۔ جمعدار صاحب نے ''نہ بیٹا'' کہہ کے اُسے گود میں اٹھالیا۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اپنے آنسو ضبط کیے اور کہا، ''مت رو بیٹا۔ ابھی موتی اچھی ہو کے آجائے گی، ہاں۔ آجائے گی۔ ہاں بیٹا ہاں۔'' جمعدار صاحب بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ دل سے اُمڈے ہوئے آنسوؤں کی آواز میں اٹڈر ہے تھے۔ انھوں نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیے اور چھانو کو زور سے لپٹا لیا۔ قصائی موتی کو لیے جا رہا تھا۔ موتی نے جاتے جاتے مڑ کے ایک نظر دیکھا، اس کی نگاہوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ جمعدار صاحب اس سے آنکھیں نہ ملا سکے۔ خود بخود نگاہیں جھک گئیں۔ قصائی کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھریاں بدستور جھول رہی تھیں۔ جمعدار صاحب نے آنکھیں بند کر لیں، لیکن چھریاں جیسے آنکھوں کے اندر گھس گئیں۔ ان کی چمک اور بڑھ گئی۔ ان کی دھار اور تیز ہو گئی، اتنے میں موتی کی بیں بیں کی آواز بھی جمعدار صاحب کے کانوں سے اتر کے دل کو چیر گئی۔ آواز رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ ہوتے ہوتے اتنی مدھم ہو گئی جیسے دبے ہوئے ضمیر کی آواز جب آواز مٹ گئی تو جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور وہ چھانو کو سینے سے لپٹائے اک دم سے لیٹ گئے۔

۱۲

پہلے کا زمانہ ہوتا تو جمعدار صاحب پندرہ روپیا پاتے ہی نہ جانے کیا کیا کر ڈالتے، مگر اب وہ روپیا پھینک نہ سکتے تھے۔ انھوں نے پانچ روپے موتی کی یادگار کے طور پر رکھ دیا۔ وقت بے وقت کے لیے۔ آخر موتی بھی تو وقت بے وقت کام آیا کرتی تھی۔ دس روپے کا چاول اور چھانو کے لیے تھوڑا لیمن چوس لائے۔ چھانو ”موتی موتی“ کی رٹ لگائے تھا اور روئے جا رہا تھا۔ جمعدار صاحب نے کہا، ”لو بیٹا موتی نے لیمن چوس بھیجا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی۔ لیمن چوس دیکھتے ہی چھانو مسکرا دیا اور اُسے بجائے چوسنے کے کرر کرر کھانے لگا۔ جمعدار صاحب کے چہرے پر بہت دنوں کے بعد مسکراہٹ آئی۔ تھوڑا تھوڑا چاول ہاجرہ اور گیدو کی ماں کو بھی دینے لے گئے۔ ہاجرہ نے سر جھکا کے لے لیا۔ گیدو کی ماں لاپتا تھی۔ اڑوس پڑوس میں کہہ آئے کہ جب وہ آئے تو اسے خبر کر دیں۔
رات کو رکابی بھر پکا چاول لے کے مولانا مستنصر باللہ کے پاس گئے۔ مولانا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں جانے والے ہیں۔ جمعدار صاحب نے جب رکابی پیش کی تو مولانا نے کہا، ”نہیں جمعدار صاحب یہ اب ہمارے لیے اکل حلال نہیں۔ ہم نہیں کھا سکتے۔ قحط کی وجہ سے مدرسہ بند ہے۔ کوئی پڑھنے نہیں آتا۔ آج ہم نے اسے باضابطہ بند کر دیا۔ جب حالت بہتر ہو جائے گی تو ان شاء اللہ پھر چلائیں گے۔“

”آپ کہیں جانے مانگتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”آپ ہمیں چھوڑ کے جانے سے تو مشکل ہوگا۔“

”ہم نے سوچا تھا کہ یہیں محنت مشقت کر کے کچھ روز کمائیں گے، مگر اب دیکھتے ہیں کہ یہاں ممکن نہیں۔“

”پھر؟“

''ہم شہر جا رہے ہیں۔ دیکھیں وہاں خدا کیا بندوبست کرتا ہے۔''

''میں بھی چلیں۔''

''مگر آپ سب کو چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہیں۔''

''جی، میں بھی یہی سوچتے ہیں، پیر صاحب ہونے سے میں کوئی تعویذ مانگتے۔ آپ کوئی تعویذ دے سکتے ہیں؟''

''پیر صاحب جو تعویذ مجھے دے گئے ہیں، وہی میں اپ کو دے سکتا ہوں۔''

''حضور کا بڑا مہربانی۔''

''آپ مجھے حضور کیوں کہتے ہیں۔''

''آپ پیر صاحب کی جگہ ہیں میرا دل حضور بولنا مانگتا ہے۔''

''پیر صاحب بتا گئے ہیں کہ یہاں کی زندگی چند روز کی ہے، اصل زندگی عاقبت کی ہے۔''

''اسی سے تو میں یہ زندگی چھوڑ دینے مانگتے ہیں، جی چاہتا ہے جنگل میں چلے جائیں جہاں نہ کوئی جاننے والا ہو نہ پوچھنے والا۔ سچ حضور میں اس زندگی سے بہت تنگ آ گئے ہیں۔''

''مگر یہ مسلمان کی شان نہیں، اس کی تو دنیاوی زندگی بھی عبادت ہے۔ سانس لینا تک عبادت ہے۔''

''حضور میں سمجھے نہیں۔''

''عاقبت کی زندگی تب ہی سنورتی ہے جب دنیا کی زندگی سنورے، خدا نے زندگی سنوارنے کے طریقے بھی بتا دیے ہیں۔ ان طریقوں پر چلنا ہی عبادت ہے۔''

''میں نماز روزہ تو کرتے ہیں، مگر بہت بیشی غریب ہیں۔ پنیر میاں دغا بازی کرتا، مگر امیر ہے۔''

''خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ غریبی بھی آزمائش ہے اور امیری بھی۔ خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے امیر بندے امیری کے عیش و آرام میں پڑ کے اسے بھول تو نہیں جاتے اور اس کے

غریب بندے غریبی کی مصیبتوں سے گھبرا کر سچائی اور ایمان داری کا راستہ تو نہیں چھوڑ دیتے۔ خوف سے، بھوک سے، جان و مال کے نقصان سے ان کے پاؤں تو نہیں ڈگمگاتے، یہ قحط جو پڑ رہا ہے۔ یہ بھی اس کی آزمائش ہے، اور ہاں اس بات کی یاددہانی بھی ہے کہ ہم سیدھے راستے سے دور ہو گئے ہیں۔ اسی لیے مصیبتوں اور پریشانیوں کے جنگل میں پھنس گئے ہیں۔ اپ نے ایک بات تو دیکھی ہو گی۔"

"حضور میں اتنا دیکھ چکے ہیں کہ اور کچھ دیکھنا نہیں مانگتے، میں بہت دفعہ آنکھ بند کر لیتے ہیں۔"

"میں اور بات کا ذکر کر رہا تھا، آپ نے کبھی کسی کیڑے مکوڑے چڑیا چڑنگل کو فاقہ زدہ دیکھا ہے؟ سب موٹے تازے ہوتے ہیں۔"

"حضور ہمارا موتی تو بھوک کے مارے مرا جا رہا تھا۔"

"اسے تو آپ نے پالا تھا، ایسی چیزوں کو بتایئے جو اپنی غذا تلاش کرنے میں آزاد ہیں۔"

جمعدار صاحب نے تھوڑا بہت خیال دوڑایا، "جی حضور سب چیز موٹا تازہ رہتا ہے۔"

"مگر آدمی کا حال دیکھیے، قحط نہیں پڑتا تب بھی کتنے بھوکے رہتے ہیں۔"

"جی حضور بہت۔"

"کیوں۔"

"حضور میں کیا بتائیں۔"

"حضور میں کیا بتائیں۔"

"دیکھیے خدا جو اصلی رزق دینے والا ہے وہ تو ہر جاندار کی غذا اس کے پیدا ہونے سے پہلے مہیا کر دیتا ہے۔ بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے چاہے آدمی کا چاہے جانور، کا، اس کے لیے فوراً دودھ اُتر آتا ہے۔"

''جی حضور موتی کے جب بچہ ہوتا تھا، اس کے بہت دودھ اُترتا تھا۔''

جمعدار صاحب کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ مولانا نے کہا،''اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کے لیے رزق بہت ہے۔''

''حضور مگر کھانے کو تو نہیں ملتا۔''

''تو یہ کس کا قصور ہے، ہمارا ہی ہوا نا؟ کچھ لوگ ضرورت سے زیادہ رزق دبا بیٹھتے ہیں دوسروں کے لیے کم پڑ جاتا ہے۔''

''جی ہاں حضور سرت ساہا کتنا دبائے بیٹھا ہے۔''

''دنیا میں معلوم نہیں کتنے سرت ساہا ہیں اور کتنے پنیر میاں۔''

''نہیں حضور پنیر میاں ایسا آدمی ہم بیشی نہیں دیکھا۔''

مولانا صاحب نے دیکھا کہ اگر پنیر میاں کا قصہ چھڑ گیا تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ اس لیے انھوں نے کہا،''ایک بات سوچیے۔''

''حضور میں آج کل بالکل سوچنے نہیں سکتے ہیں۔ سوچنا مانگتے ہیں تو تمام سفید سفید کا کالا نظر آنے لگتا ہے، ایسے خراب خراب خواب دیکھتے ہیں کہ ڈر کے مارے سونا نہیں مانگتے ہیں۔''

''آپ نے آدمیوں اور دوسری جاندار چیزوں میں جو فرق ہے، اُس پر غور کیا ہے؟''جی! غور تو میں نہیں کرنے سکے، مگر فرق بہت ہے، ہم ادمی ہیں وہ جانور۔''

''دیکھیے دوسری جان دار چیزیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک تو وہ جنھیں اپنی زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے لیے اپنے ہم جنسوں کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے گائے بکری، کتا بلی۔ وہ اپنی ضرورتیں آپ پوری کر لیتی ہیں، اس لیے انھیں صرف اپنے آپ سے مطلب ہوتا ہے۔ نہ وہ کسی کی مدد کرتے ہیں نہ کوئی اُن کی مدد کرتا ہے۔''

''نہیں حضور موتی تو ہماری بہت مدد کرتا تھا، میں بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ معنی جب تک کرنے سکتے تھے، اسی کا تو ہم کو افسوس ہے کہ میں اس کا مدد جیسا دل مانگتا تھا نہیں کرنے سکے اور میں

اسے بیچ دیا۔" جمعدار صاحب کا دل بھر آیا اور وہ اپنے دامن سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگے۔ مولانا نے کہا، "میں آدمی کی مدد کا ذکر نہیں کر رہا تھا، بلکہ اپنے ہم جنسوں کی مدد کا، ایک گائے کو تو دوسری گائے کی مدد سے کھانا نہیں ملتا، دوسری قسم ان کی ہوتی ہے جو بغیر ایک دوسرے کی مدد کے، زندہ ہی نہیں رہ سکتیں۔ جیسے شہد کی مکھیاں، چیونٹیاں، ان کا نظام ایسا مکمل ہوتا ہے کہ کسی نے قاعدے کے خلاف کوئی کام کیا اور اسے فوراً قتل کر دیا گیا۔"

"حضور ایسا بات؟ اللہ کا شان۔"

"جی ہاں، مگر آدمی میں دونوں باتیں ہیں۔ وہ ایک حد تک اپنی ضروریات آپ بھی پورا کر سکتا ہے۔ یہ بات اسے خودغرضی سکھاتی ہے، کتے بلی کی خودغرضی، لیکن اپنے ہم جنسوں کی مدد کی اسے ضرورت بھی پڑتی ہے۔ ان کی محنت کی کمائی کے بغیر اس کا کام بھی نہیں چلتا، اس لیے وہ اس کمائی کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر اپنی خودغرضی کی وجہ سے اس کے بدلے میں وہ اپنی کمائی کم سے کم دینا چاہتا ہے، چونکہ ہر ایک یہی چاہتا ہے۔ اس لیے گڑبڑ پیدا ہوتی ہے، دنیا کے سارے قانون اسی گڑبڑ کو دور کرنے یا کم کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں، خدا کا قانون اسی لیے بنا ہے اور اسی کو مذہب کہتے ہیں۔"

"اچھا حضور ایسا بات۔ اب ہم سمجھے۔"

اتنے میں مخلص آ گیا۔ جمعدار صاحب کو بڑا برا لگا۔ کیسی اچھی باتیں ہو رہی تھیں کہاں یہ بے وقت پہنچ گیا۔ جیسے دودھ میں یکا یک مکھی آ کے کود پڑے۔ پھر خیال آیا یہ ان سے بڑی مذہبی بحث کیا کرتا تھا۔ اب مولانا صاحب کی بات سے تو پتا چلے۔ مخلص سے مخاطب ہو کے بولے، "بھیا خوب آئے۔ سنو مولانا صاحب کیسی سچی سچی باتیں بتا رہے ہیں (مولانا صاحب سے) حضور مخلص میاں سے بھی وہ شہد کی مکھی اور چیونٹی والی بات بتائیے۔" مولانا نے مختصراً دہرا دیا اور فرمایا، "خدا جانتا ہے کہ انسان بغیر اخلاقی قوت کے اپنی خودغرضی پر جسے نفس بھی کہتے ہیں قابو نہیں کر سکتا، اور یہ اخلاقی قوت بغیر روحانی تربیت کے پیدا نہیں ہو سکتی اس لیے مذہب انسان میں اخلاقی اور روحانی قوت پیدا کرتا

ہے، اس کی جڑ ہے خدا کا خوف، خدا پر بھروسا، خدا سے محبت۔"

"حضر جلودھر بابو خدا سے نہیں ڈرتا۔"

"تو پھر خدا کے سوا ہر ایک سے ڈرتا ہوگا۔"

"جی حضور پنیر میاں سے بہت ڈرتا ہے۔"

"لیکن جو آدمی خدا سے ڈرتا ہے وہ اور کسی سے نہیں ڈرتا۔"

مخلص کو مولانا کی باتیں کچھ نئی نئی سی لگ رہی تھیں اور دلچسپ بھی، مگر جلودھر کا جب اس طرح ذکر آیا تو اُسے ناگوار گزرا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ جلودھر کی طرف سے کچھ بولے، مگر پھر اُسے پارٹی کے حکم کا خیال آیا جس کی رو سے مذہبی بحثوں میں حصہ لینے کی سخت ممانعت کر دی گئی تھی۔ اس لیے "اب میں کیا بولیں،" کہہ کے رہ گیا۔ جمعدار صاحب کے دل پر یکا یک خدا کا خوف غالب ہو گیا اور وہ کانپنے لگے۔

"حضور میرا دل تھر تھر ہوا جا رہا ہے۔ میں بہت گنہگار آدمی ہیں۔"

"خدا کی رحمت سے امید رکھیے۔ ناامیدی بھی کفر ہے، خدا کی محبت کو دل میں جگہ دیجیے۔ ناامیدی دور ہو جائے گی۔"

"حضور ابھی تو میرے دل میں خدا کا ڈر بھرا ہوا ہے، محبت بھرنے نہیں سکتے۔"

مولانا مسکرا دیے۔ بولے: "خدا کا ڈر سانپ بچھو کی طرح تھوڑی ہے، یہ ڈر تو محبت ہی کا ایک پہلو ہے آپ سب سے زیادہ کس کو چاہتے ہیں۔"

"سب سے زیادہ کہنے نہیں سکتے، مگر چھانو — ابوالبرکات کو — پھول محمد کو میں بہت چاہتے ہیں۔"

"تو آپ کوئی ایسی بات کرنا پسند کریں گے جو انھیں پسند نہ ہو۔"

"نہیں۔"

"ابوالبرکات میاں بھی اپ کو بہت چاہتے ہیں۔"

''جی ہاں بہت بی بی جان سے بھی زیادہ ہم کو چاہتے ہیں۔''

''وہ آپ سے ڈرتے بھی تو ہیں۔''

''ہاں، مگر بہت بیشی نہیں۔ بی بی جان سے بیشی ڈرتے ہیں۔''

''اچھا آپ اپنے والد صاحب مرحوم کو بہت چاہتے تھے۔''

''جی حضور بہت۔''

''ان سے ڈرتے بھی تھے؟''

''جی بہت۔''

''اس وجہ سے کہ وہ سزا دیں گے، یا اس وجہ سے کہ ان کے دل کو تکلیف ہوگی۔''

جمعدار صاحب سوچنے لگے، ''حضور بات یہ ہے کہ میں ان کے غصے سے ڈرتے تھے، مگر وہ کبھی مجھے مارے نہیں، پھر بھی میں ڈرتے تھے۔''

''یہی حال خدا کے ڈر کا سمجھیے۔ جو خدا کو جتنا زیادہ ہے وہ اس سے اتنا ہی زیادہ ڈرتا ہے، خدا کے ڈر اور خدا کی محبت سے روح نکھرتی ہے۔ وہ جب نکھر جاتی ہے تو اخلاق نکھر جاتے ہیں اور انسان میں ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جس کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔''

''جی حضور اب میں کچھ کچھ سمجھ رہے ہیں۔''

''دنیا میں سارا فساد اس وجہ سے ہے کہ اخلاقی اور روحانی قوت سے بہت کم واسطہ رہ گیا ہے۔ اس لیے ساری خرابی کی ذمے داری ہمیں لوگوں پر ہے۔ یہ قحط بھی ہمیں لوگوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔''

''حضور جلودھر بابو بھی ایسا ہی بات بولتا تھا۔''

''ہاں مگر اس خرابی کو دور کرنے کا وہ طریقہ نہیں جو وہ بتاتا ہے۔''

مخلص نے محسوس کیا کہ اب گفتگو مذہبی دائرے سے باہر نکل آئی ہے اس لیے وہ اس میں حصہ لے سکتا ہے، اس نے کہا، ''مولانا صاحب میں بھی کچھ کہیں۔''

مولانا، ''ہاں ہاں شوق سے۔''

مخلص، ''یہ بات تو آپ ٹھیک بولا کہ یہ کال آدمی لوگ پیدا کیا ہے، یہ لوگ اسی مافک کرتا رہے گا۔ دھنی لوگ کا دھن چھین لے۔ ان کا زمین چھین لے، کل کا کارخانہ چھین لے۔ غریب لوگوں میں بانٹ دے۔ غریب لوگ خود انتظام کرے۔ مزدور لوگ کسان لوگ۔ جیسا روس میں ہوتا ہے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

مولانا، ''یہ ٹھیک ہے کہ دولت کی تقسیم آج کل بہت غلط طریقے سے ہو رہی ہے اور اس ناانصافی کو دور کرنا چاہیے، مگر اس طرح نہیں جس طرح آپ کہہ رہے ہیں، سب انسان، دل، دماغ، عقل، سمجھ اور صلاحیت میں ایک جیسے نہیں ہوتے۔ خدا نے جو فرق پیدا کیا ہے وہ مٹایا نہیں جا سکتا۔ میں نے جو کتابیں روس کے بارے میں پڑھی ہیں ان سے پتا چلتا ہے۔''

مخلص، ''اچھا مولانا صاحب آپ روس کا کتاب پڑھا ہے؟''

مولانا، ''ہاں جب سے یہ پتا چلا کہ ایک نئی زبردست قوت پیدا ہوئی ہے جو خدا کو نہیں مانتی، بلکہ خدا کو ماننا جرم قرار دیتی ہے اور پھر بھی اسلام سے بہتر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور دنیا بھر میں پھیل جانا چاہتی ہے۔ تب سے مجھے اس کے بارے میں جاننے کا شوق ہوا ہے، اور میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں، ایک بات اور بھی تھی، آپ لوگ تو ہمیں کٹھ ملا سمجھتے ہیں، یعنی بالکل ہی جاہل۔ ہم نے کہا، آپ کی غلط فہمی بھی دور کر دیں۔ پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اشتراکیت، یعنی کمیونزم۔'' جمعدار صاحب نے مخلص کی طرف ایسی نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں، سمجھ رہے ہو؟ مخلص نے اثبات میں سر ہلایا۔ مولانا، ''ہاں تو میں ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ اشتراکیت بھی اسلام کا ایک طرح کا خاکہ ہے۔ جس میں اسلام کی شباہت تو ہے، مگر روح نہیں۔ اشتراکیت بھی نسل، ملک، زبان کے فرق کو نہیں مانتی اور ساری دنیا کے مزدوروں سے کہتی ہے کہ ایک ہو جاؤ۔ اسلام بھی اس قسم کے کسی فرق کو نہیں مانتا، مگر وہ صرف مزدوروں ہی سے ایک ہونے کو نہیں کہتا، بلکہ سارے انسانوں سے، اسلام کی نظر میں جملہ انسان ایک قوم ہیں اور آپس میں بھائی بھائی۔ آپ لوگ دنیا بھر کے اشتراکیوں

کو ساتھی، کامریڈ کہتے ہیں۔ ہم اس سے بہت آگے بڑھ کے دنیا بھر کے مسلمانوں کو بھائی سمجھتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ اسی کی وجہ سے آپ اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں اور ہمیں دقیانوسی، یعنی پرانے خیال کا۔"

مخلص، "مگر مولانا صاحب کمیونزم اور بات بھی تو کہتا ہے۔"

مولانا، "ہاں وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ دولت کی غلط تقسیم کو درست کرنا چاہتی ہے اور اس طرح سے اسلام سے قریب تر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اخلاقی و روحانی قدروں پر اس کی بنیاد رکھی جائے۔ ایسی قدریں جو کبھی بدلتی نہیں اشتراکیت میں اس طرح کی کوئی مستقل قدریں نہیں۔ ہر چیز مصلحت کے مطابق رہتی ہے۔ صرف طاقت کی پوجا کی جاتی ہے۔ خدا نہیں ہے۔ روح نہیں ہے۔ بھلا اس "نہیں" کی تعلیم پر کوئی بڑا نظام کیسے دیر تک قائم رہ سکتا ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگون کے دل و دماغ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تپاتے رہتے ہیں۔ دل بے اطمینان رہتا ہے اور روح پیاسی، یہی وجہ ہے کہ روس سے ناانصافیاں مٹیں نہیں، بلکہ اور بڑھ گئی ہیں۔ اپنے مخالفوں پر وہ ظلم توڑے جاتے ہیں جو زار کے زمانے میں بھی نہ ہوتے تھے۔ "تو بڑا کہ میں" کی جنگ میں بڑوں بڑوں کو بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اسٹالن نے اپنے کتنے ساتھیوں کو مروا ڈالا۔ یہاں تک کہ ٹراٹسکی جو روس سے ہزاروں میل دور اپنی جان بچانے گیا تھا وہ وہاں بھی نہ بچ سکا۔ بات یہ ہے کہ اسٹالن کو خدا کا خوف نہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ اسے خدا کے سامنے جواب دینا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے اور اپنے مخالفین کو جس طرح بھی ممکن ہو پیس ڈالنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ اس کا مقابلہ اگر خلفائے راشدین سے کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی فرق حقیقی اسلام اور اشتراکیت میں سمجھیے۔"

مخلص باوجود مولانا کی ذرا مشکل اُردو کے ان کا مطلب سمجھ گیا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مولانا نے کہا کہ "دیکھیے بحث کی بات جانے دیجیے۔ وہ تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں ایک موٹی سے بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قصے تو آپ نے

سنے ہی ہوں گے؟''

مخلص، ''ہاں۔''

مولانا، ''تو جب آپ کا اسٹالن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے معیار پر پہنچ جائے تب آپ آ کے مجھ سے کہیے گا۔ اس وقت میں سمجھوں گا کہ اشتراکیت اسلام کے برابر پہنچ گئی، لیکن یہ اس وقت تک نہ ہو سکے گا جب تک اس کے دل میں خدا پر ویسا ہی ایمان اور خدا کا ویسا ہی خوف نہ ہو جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں تھا۔ دوسرے لفظوں میں اگر اشتراکیت خدا پر ایمان لائے تو اشتراکیت نہ رہ جائے، بلکہ اسلام بن جائے۔ شاید ایک دن ایسا ہی ہو۔ چنگیز اور ہلاکو نے بھی تو اسلام کو مٹانا چاہا تھا اور مسلمانوں کو تباہ کر دیا تھا، لیکن چند دنوں میں ان کی قوم خود اسلام کی علم بردار بن گئی۔ اسلام کے ٹھیکے دار کچھ ہمیں تو نہیں۔ یہ تو خدا کا پیغام ہے سارے انسانوں کے لیے۔ اس کی علم برداری کی سعادت کسی کو بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ چاہے وہ عرب ہوں، ایرانی ہوں، مغل ہوں، ترک ہوں یا ہمارے ملک کے مسلمان یا کوئی اور قوم یا قوم و نسل سے بالاتر کوئی جماعت، جیسے اشتراکیوں کی ہے، بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ اگر کبھی خدا نے انھیں اسلام کی روشنی دکھائی تو وہ چونکہ پہلے ہی سے قوم و نسل کے بندھنوں کو توڑ چکے ہیں، جس میں خود مسلمان گرفتار ہو گئے ہیں اور ان کا معاشی نظام بھی اسلام سے قریب تر ہے اس لیے وہ غالباً حقیقی اسلام کی زیادہ اچھی نمائندگی کر سکیں گے اور اسے دنیا میں زیادہ کامیابی سے چلا سکیں گے۔ موجودہ زمانے میں جب سائنس اتنی ترقی کر رہی ہے اس کے امکانات پہلے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

مخلص، ایسا نہیں ہو نے سکتا۔ ہم لوگ خدا کو نہیں ماننے سکتا۔'' مخلص اپنے کو نہ روک سکا، اتنا کہہ ہی گیا۔

مولانا، ''کئی خداؤں سے ایک خدا کی منزل تک پہنچنے کے لیے بعض وقت 'کوئی خدا نہیں' کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ دیکھیے اسلام بھی لا الٰہ سے شروع ہوتا ہے میرے خیال میں اشتراکی اس وقت لا الٰہ کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ کبھی اِلا اللہ تک بھی پہنچ جائیں۔''

جمعدار صاحب نے مخلص کو ایسی نظر سے دیکھا جس سے مولانا کی برتری کا احساس ٹپکا پڑتا تھا۔ مخلص مولانا کی باتوں سے ویسے ہی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ جمعدار صاحب کی نگاہوں نے اس الجھن کو اور بڑھا دیا۔ اسے مذہب سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ زیادہ تر اشترا کی کتابیں ہی اسے نے پڑھی تھیں اور ان کے ذریعے سے مذہب کے افیون ہونے کا علم اُسے ہوا تھا۔ بچپن میں جو باتیں اُس نے سنی یا پڑھی تھیں وہ ذہن کے گوشے میں دب دبا گئی تھیں۔ اب ذرا ذرا کلبلانے لگیں۔ اس نے سوچا، مذہب کا براہِ راست مطالعہ کرے۔ اس کے بعد وہ مولانا صاحب سے اچھی ٹکر لے سکے گا۔ وہ اپنی الجھن دور کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور سیٹی بجاتا ہوا چل پڑا۔

جمعدار صاحب، ''حضور خوب فرمایا۔ حضور اور فرمائیں۔''

مولانا، ''جو کچھ مجھے کہنا تھا، وہ تو کہہ چکا، اتنی بات اور سمجھ لیجیے کہ انسان سب کچھ خوشی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے اور سب سے بڑی خوشی روحانی ہوتی ہے۔ وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک خدا کے بتائے ہوئے راستے پر نہ چلا جائے۔ اس وقت مصیبت بھی پڑے تو آدمی خوشی سے برداشت کر لیتا ہے، بلکہ اس سے اس کی روحانی خوشی اور بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں بھی وہ خوش رہتا ہے اور آخرت بھی۔

''حضور خوش تو میں بھی رہنا مانگتے ہیں، مگر رہنے نہیں سکتے۔ گاؤں میں تمام لوگ مر رہا ہے۔ اس دن جگیر باپ کا بیٹا مر گیا۔ ہمارا دل بہت رویا، چھانو بیمار ہے، بی بی جان کا بھی طبیعت ٹھیک نہیں، ہم موتی کو بھی بیچ دیا۔ میں کیسے خوش رہیں۔''

''موت تو کوئی ایسی بری چیز نہیں۔ سب کو ایک دن مرنا ہے۔ کوئی آگے مرتا ہے کوئی پیچھے۔ سوچیے تو دیکھیے کہ کسی کی موت کا غم کیوں ہوتا ہے۔''

''حضور کیا بتائیں، میرا باپ جان جب انتقال کیے تو میرا دل میں بہت تکلیف ہوا تھا۔ میں چاہتے تھے نہ روئیں، مگر روکنے نہیں سکے۔ رو دیے۔ اب بھی ان کا خیال کر کے میں رو دیتے ہیں۔ ان کا چہرہ کیسا نور نور تھا۔ بالکل حضور کا مافک۔''

''مگر جب کوئی کچھ دن کے لیے کہیں چلا جاتا ہے تو لوگ زیادہ روتے تو نہیں، کیوں؟

اس لیے کہ اُن سے دوبارہ ملنے کی امید رہتی ہے۔"

"مگر حضور جب میں لڑائی پر گئے تھے تو بی بی جان بہت رویا تھا۔"

"لیکن اس طرح تو نہیں جس طرح کسی کے مرنے پر روتے ہیں۔"

جمعدار صاحب کچھ موت اور موتی۔ کچھ باپ جان کچھ بی بی جان کے ذکر سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کا دل بھر آیا۔ ضبط کرنے کے لیے 'ہاں ہوں' کہہ کے جلدی سے خاموش ہو گئے۔

"سمجھی ہوں گی ملاقات نہ ہوگی، یہی بات کسی کے مرنے کے وقت ہوتی ہے۔ رونے والا سمجھتا ہے کہ اب ہمیشہ کے لیے جدائی ہو گئی۔ یہ نہیں سمجھتا کہ پھر ملنا ہوگا عالمِ ارواح میں، رونے والے کو یہ یقین نہیں ہوتا کہ وہ بھی مرنے والا ہے یا مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے پیاروں کے مرنے پر بہت روتا ہے۔"

"حضور آپ کا کوئی مرنے سے آپ نہیں روئیے گا۔"

"جدائی کا صدمہ تو لازمی ہے، لیکن پھر ملنے کا یقین اس صدمے کو کم کر دیتا ہے، خدا نے اگر توفیق دی تو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کروں گا۔"

جمعدار صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے، انھیں یاد آیا کہ انھوں نے مولانا صاحب سے تعویذ مانگا تھا اور انھوں نے پیر صاحب کا دیا ہوا تعویذ دینے کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر اب تک دیا نہیں۔ بولے، "حضور آپ تعویذ دینے کو بولا تھا۔ پیر صاحب والا تعویذ۔"

مولانا، "یہ سب باتیں بھی پیر صاحب کی تعویذ کی ہی ہیں۔ اچھا اتنا یاد رکھیے کہ کتنی ہی مصیبت پڑنے خدا کو نہ بھولیے اسی پر بھروسا رکھیے۔ یہی سب سے بڑا تعویذ ہے۔"

جمعدار صاحب کے منہ سے صرف "سبحان اللہ" نکل سکا۔ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر بڑی عاجزی سے بولے، "اچھا یہ تو کھا لیجیے۔"

"مولانا صاحب نے رکابی میں سے ایک نوالہ لے لیا اور کہا، "بقیہ میری طرف سے گھر میں کھلا دیجیے۔" جمعدار صاحب اسے تبرک سمجھ کے لے آئے۔

☯......☯......☯

آٹھواں باب

بنگال کی زندگی بالکل غزل بنی جارہی تھی۔ میر کی غزل۔ بادی النظر میں بے ربطی بھی تھی۔ سادگی بھی، مٹھاس بھی، لوچ بھی، ترنم بھی، مگر اندر اندر ایک ربط پنہاں بھی۔ ایک گہرا غم بھی، سوز بھی، گداز بھی۔ جیسے بنگال کے سارے چھوٹے بڑے دریا آنسوؤں سے بنے ہوں، جیسے یہ انسوانسان کے دلوں میں سمٹ آئے ہوں۔ جیسے دلوں میں طوفان اٹھ رہا ہو۔ جیسے طوفان کا شور کانوں میں گونج رہا ہو، لیکن ہونٹوں تک آ کے ٹھنڈی آہ اور آنکھوں تک پہنچ کے گرم آنسو بن بن کے رہ جاتا ہو۔

اس غزل کی تان لنگر خانے پر جا کر ٹوٹتی تھی، جگہ جگہ لنگر خانے قائم ہو رہے تھے۔ جہاں جہاں لنگر خانہ کھلتا وہاں وہاں دور دور سے آبادی سمٹ آتی۔ لنگر خانوں سے کھچڑی بٹتی، جس میں دال چاول کم اور پانی زیادہ ہوتا۔ لوگ طرح طرح کے برتن لے لے کے آتے، ٹوٹے پھوٹے المونیم کے، پیتل کے، تانبے کے، لوہے کے، مٹی کے، پتوں کے اکثر برتنوں کی صورت اپنے مالکوں کی صورت کی طرح مسخ ہوتی، جب پیٹ میں گرم گرم کھچڑی پڑتی تو اِدھر ڈوبی اُدھر نکلی، کا قصہ ہوتا۔ اپنے ساتھ جسم کا کچھ بچا کھچا خون بھی لے کے نکل جاتی، آدمی غلاظت میں لت پت پڑا رہتا۔ مکھیاں بھنکتی رہتیں۔ تھوڑی دیر میں چیل، کوے منڈلانے لگتے۔ گدھ خوشی کے مارے اپنے بڑے بڑے پر پھٹکنے لگتے۔ ان پروں کو پھیلائے، خوشی سے سینہ تانے لاشوں کے ارد گرد دھومیں مچاتے۔ اچھلتے، کودتے، جیسے ناچ گا رہے ہوں، جیسے لاشوں کے دسترخوان پر سازِ طرب چھڑا ہوا ہو۔ جہاں آسمان پر زیادہ چیل، کوے منڈلاتے نظر آتے، جہاں اونچے درختوں پر بہت سے گدھ بیٹھے دکھائی دیتے۔ لوگ سمجھ جاتے کہ ہو نہ ہو وہاں کوئی لنگر خانہ جاری ہے اور اس طرف کھنچے چلے جاتے۔ انھی منڈلاتے ہوئے چیل کووں کی طرف، انھی دھومیں مچاتے ہوئے گدھوں کی طرف، جن کے زیر سایہ سنا جاتا تھا کہ

بھوکوں کو کھچڑی ملتی ہے۔

۲

پھول محمد نے ایک دن گرتے پڑتے آ کے جمعدار صاحب کو اطلاع دی کہ منہ اندھیرے اس کے چچا چچی مع اپنی چھوٹی بچی مینا کے کہیں چلے گئے۔ شاید کسی لنگر خانے کی طرف گئے۔ یہ سن کے جمعدار صاحب کے نہ محض دل میں ایک دھچکا سا لگا، بلکہ پیٹ میں بھی۔ موتی بیچ کے جو انھوں نے چاول خریدے تھے وہ قریب قریب ختم ہو رہے تھے۔ پیٹ کی جلن کچھ اور بڑھ گئی، غالباً اس کا تقاضا یہ تھا کہ جمعدار صاحب بھی لنگر خانے جا کے کھچڑی کے پانی ہی سے بھوک کی آگ بجھاتے، مگر ان کی خودداری نے اس آگ پر غیرت کے ایسے چھینٹے مارے کہ پیٹ سے دل و دماغ تک دھواں سا چھنچھنا اٹھا اور اس چھنچھناتے ہوئے دھویں نے اظہارِ تأسف کی صورت اختیار کی۔ معلوم نہیں یہ نہیں تأسف جچیر باپ پر زیادہ تھا یا اپنے آپ پر۔ انھیں خیال آیا کہ گیدو کی ماں کی بھی کئی روز سے خبر نہیں ملی، کہیں وہ بھی لنگر خانے نہ گئی ہو۔ ان کا تأسف اور بڑھ گیا۔

پھول محمد کا خیال صحیح تھا۔ جچیر باپ نے مع اپنے بچے کھچے خاندان کے لنگر خانے ہی کا رخ کیا تھا۔ کلثوم گھونگٹ کاڑھے چلی جا رہی تھی۔ اسے محنت مشقت کی عادت تھی، مگر زیادہ چلنے کی نہ تھی۔ مینا تین برس کی تھی، پہلے پاؤں پاؤں چلتی تھی، مگر کچھ دنوں سے گود ہی میں چل پاتی۔ کچھ دور کلثوم کی گود میں جاتی کچھ دور جچیر باپ کی، تھوڑی تھوڑی دور جا کر یہ لوگ بیٹھ جاتے۔ راستے میں اور بھی بہت سے ٹولیاں ملیں۔ ایک عورت ایک پکی دیواروں اور ٹین کے چھت والے مکان سے نکلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبر سے نکلی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ سوکھے سے آنسو تھے۔ جنھیں وہ اپنے سوکھے ہاتھوں سے پونچھ رہی تھی، ایک مرد باہر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس نے دس روپیا کا نوٹ رکھ دیا۔ جچیر باپ کی نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ پہچانی پہچانی سی صورت معلوم ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بالآخر قحط زدوں نے ایک

دوسرے کو پہچان لیا۔ جگیر باپ نے کہا، ''بھیا ہری منڈل تم بھی جا رہے ہو؟''

ہری منڈل، ''ہاں بھیا۔''

دونوں تھوڑی دیر تک ساتھ چلتے رہے۔ بغیر ایک دوسرے بات کیے۔ جیسے کوئی بات کرنے ہی کو نہیں، جیسے بولنے کی طاقت ہی نہیں۔ جگیر باپ اور کلثوم مینا کو سنبھالتے سنبھالتے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نحیف آواز میں روئے چلی جا رہی تھی۔ ہری منڈل نے بالآخر رکتے رکتے کہا۔ ''بھیا۔۔۔ ایسے تو۔۔۔ یہ۔۔۔ مر جائے گی۔'' جگیر باپ خاموش رہا۔ ہری منڈل نے پھر کہا۔ ''تم لوگ بھی۔۔۔ پہنچ نہ پاؤ گے۔۔۔ رستے ہی میں مر جاؤ گے۔''

جگیر باپ نے بالآخر کہا، ''تو پھر کیا کریں۔''

''بھیا ہماری بات سنو تو ہم کہیں۔''

''کہو۔''

''دھنی لوگوں کے ہاتھ دے دو۔۔۔ وہ اسے پال لیں گے۔ تمھیں کچھ روپیا بھی مل جائے گا۔''

جگیر باپ کی آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ پھر گیا جب ہری منڈل کی بیوی اس پکی دیواروں اور ٹین کے چھت والے مکان سے نکل کے اسے دس روپے کا نوٹ دے رہی تھی۔ اس نے پوچھا، ''تم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔''

''ہاں بھیا، کیا کرتے۔''

جگیر باپ نے کلثوم سے کہا، ''سن رہی ہو۔''

کلثوم نے بجائے جواب دینے کے مینا کو زور سے لپٹا لیا۔

تھوڑی دیر اسی طرح اٹھتے بیٹھتے چلتے رہے۔ ایک جگہ کلثوم ٹھوکر کھا کے گری۔ مینا کو لیے ہوئے کلثوم کے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئیں۔ مینا کے دانت ہونٹ میں گڑ گئے۔ بھوں پھٹ گئی، چہرہ لہولہان ہو گیا۔ جگیر باپ نے اسے اٹھا لیا۔ سامنے ایک پکے دیواروں اور ٹین کی چھت والا مکان تھا۔

کلثوم نے بڑی حسرت سے کہا، ''اتنے تو مر گئے ایک یہی بچی ہے۔۔۔اچھا دے دو۔'' ججیر باپ مینا کو لے کے ایک قدم بڑھا تھا کہ کلثوم نے اس کا دامن پکڑ کے اپنی طرف کھینچا۔ ججیر باپ نے مڑ کے دیکھا تو کلثوم نے جھٹ سے مینا کو اپنی گود میں لے کے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ اس کے لہولہان چہرے کو اپنی ساڑی سے پونچھا۔ پھر اسے پیار کیا اور ججیر باپ کی گود میں واپس کر دیا۔ ججیر باپ جب جانے لگا تو کلثوم بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ جب وہ پکی دیواروں اور ٹین کی چھت والے مکان سے باہر نکلے تو ججیر باپ کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھا اور آنکھوں میں وحشت۔ کلثوم کا چہرہ آنچل میں چھپا ہوا تھا۔

۳

رات کو ایک برگد کے درخت کے نیچے اس کی ٹولی نے بسیرا کیا۔ کچھ ٹولیاں وہاں پہلے سے بھی پڑی ہوئی تھیں، تھوڑی دیر میں گیدڑوں کی چلنے پھرنے اور ہانپنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک گیدڑ ججیر باپ کے منہ کو بھی سونگھنے لگا۔ ججیر باپ پر دہشت طاری ہوئی اور اس کے منہ سے ایک لمبی چیخ نکلی۔ گیدڑ کی آواز سے ملتی جلتی، گیدڑ کود کے بھاگ کھڑا ہوا۔ رات بھر کبھی سچ مچ کے گیدڑوں کی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی گیدڑ نما آوازیں۔ صبح ہوئی تو دیکھا کہ نہ کلثوم ہے نہ ہری منڈل کی بیوی۔ وہ کیا ہوئیں کب گئیں کسی کو خبر نہ ہوئی، حالانکہ قریب قریب سب مارے بھوک اور دہشت کے جاگتے رہے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ہری منڈل کی بیوی اس برگد کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ وہ رات کو کسی وقت خاموشی سے چل بسی تھی اور گیدڑ اسے چپکے سے گھسیٹ لے گئے تھے۔ جب آدمیوں نے لاشوں کو اٹھانا چھوڑ دیا تو قدرت نے اپنے صفائی کے ہرکارے متعین کر دیے اور یہ اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ہری منڈل اپنے جیون ساتھی کی آدھی کھائی ہوئی لاش کو نہ دیکھ سکا۔ اس نے منہ پھیر لیا اور سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ ججیر باپ کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ جب کلثوم نظر نہ آئی تو اور بھی دھڑکنے لگا۔ وہ تلاش کرتا کرتا اس پکی دیوار اور ٹین کی چھت والے مکان کی طرف گیا، دیکھا تو کلثوم

مکان کے باہر سیڑھی پر پڑی ہوئی ہے، اینٹھی ہوئی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں جیسے بڑی حسرت سے اس گھر کی طرف دیکھ رہی ہیں اس پکی دیواروں اور ٹین کی چھت والے مکان کی طرف۔

۴

جب جگیر باپ واپس ہوا تو ہری منڈل جا چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب وحشت و دہشت کا عالم تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی چاروں طرف گھوم رہی تھیں جیسے کچھ دیکھنا چاہتی ہیں جو نظر نہیں آرہا ہے، جیسے کچھ دیکھنا نہیں چاہتیں، جیسے کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ اس کی ایک مٹھی جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ کھولی، دس روپے کا نوٹ برآمد ہوا، لیکن جیسے ردی کاغذ، جگیر باپ نے اس نوٹ کو عجیب انداز سے دیکھا پھر اس پر بڑے زور سے تھوک دیا اور اسے غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ وہاں سے جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا، لیکن ہر قدم پہلے سے سست پڑ رہا تھا۔ پندرہ بیس قدم کے بعد وہ رک گیا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر وہ واپس ہوا جہاں دس روپے کا نوٹ پھٹا پڑا تھا۔ اس نے پہلے تو اس کے پرزوں کو غور کے دیکھا، پھر انھیں چننے لگا۔ چند پرزے جو اس کے ہاتھ میں آئے انھیں تھوڑی دیر الٹتا پلٹتا رہا۔ پھر اس نے یکا یک انھیں ہوا میں منتشر کر دیا اور وہیں لیٹ رہا جیسے بہت تھک گیا ہو جیسے اب کہیں اور جانا نہیں چاہتا۔

جگیر باپ اس جگہ سے اٹھنا تو نہ چاہتا تھا جہاں اس نوٹ کے پرزے پڑے ہوئے تھے وہ نوٹ جو اسے مینا کو بیچ کے ملا تھا۔ موت ہی اسے وہاں سے اٹھاتی تو شاید اسے تسلی ہوتی، مگر موت کے آنے میں دیر معلوم ہوتی تھی۔ اس کا پیٹ جل رہا تھا۔ مجبوراً اٹھا، نوٹ کے کچھ پرزے اٹھائے اور چل پڑا۔ اسی لنگر خانے کی طرف جدھر سب جا رہے تھے۔ رستے میں لوگ جگہ جگہ ستاتے یا سسکتے نظر آرہے تھے۔ کچھ سسکنے کی منزل سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ ہری منڈل کی بیوی کی طرح، کلثوم کی طرح جیسے جیسے لنگر خانہ قریب آتا جاتا تھا، لاشوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ ان لاشوں کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی زندہ لاشیں کیسے توجہ کرتیں جو انجام شاید ان کا بھی ہو وہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا،

مگر اس سے آنکھیں چرا رہی تھیں۔ منہ پھیر رہی تھیں۔ جگیر باپ کبھی سر جھکائے ہوئے کبھی آسمان کی طرف دیکھتا ہوا لڑکھڑاتا چلا آرہا تھا۔ یکا یک اس کی نظر ایک بوڑھی عورت کی لاش پر پڑی۔ بڑھیا بالکل ننگی تھی۔ جسم پر ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ جگیر باپ نے منہ پھیر لیا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ یکا یک اسے خیال آیا کہ وہ بڑھیا ننگی کیوں تھی۔ ضرور کسی نے اس کے مرنے کے بعد اس کا کپڑا اتار لیا ہوگا۔ بیچ کھانے کے لیے، وہ اس خیال کو بار بار اپنے دماغ سے نکال رہا تھا، مگر خیال تھا کہ بار بار واپس آجاتا تھا۔ تھوڑی دور پر ایک اور بڑھیا مری ہوئی نظر آئی۔ یہ کپڑا پہنے تھی اور کروٹ لیٹی تھی۔ جگیر باپ کے قدم خود بخود ادھر بڑھے۔ جا کے لاش کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے، کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ لاش کو اس نے سیدھا کیا، منہ ایک ٹوکری میں چھپا ہوا تھا۔ ٹوکری ہٹ گئی۔ چہرے پر نظر پڑتے ہی جگیر باپ کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی سی چیخ نکلی، یہ تو گیدو کی ماں تھی۔ جگیر باپ ایک دم سے پیچھے کی طرف گر پڑا۔ پھر انتہائی وحشت کے عالم میں تیز تیز چلنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گیدو کی ماں کی لاش اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ وہ ننگی ہے اور اپنا کپڑا ہاتھ میں لیے پکار کے کہہ رہی ہے، ”ہاں لے جاؤ۔ لے جاؤ۔ مینا کے باپ! یہ پھٹے پرانے کپڑے بھی لے جاؤ۔ انھیں بیچ کھاؤ۔“

مینا کے باپ نے کانوں میں انگلی دے لی اور بھاگنے لگا۔ اپنے آپ سے کہاں بھاگ کے جاتا، چیخ مار کے گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔ ایک کوا کائیں کائیں کرتا ہوا ڈال پر آ کے بیٹھ گیا۔ گھور گھور کے اور گردن جھکا جھکا کے مینا کے باپ کو دیکھنے لگا، کوا ڈال پر یوں کود کود کے کائیں کائیں کیے جا رہا تھا جیسے گا رہا ہو، جیسے ناچ رہا ہو۔ اس خوشی میں کہ دھنسی ہوئی آنکھوں کا حلوا جلد ملنے والا ہے، جگیر باپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مر گیا ہے اور کوئی اس کے کپڑے اتار رہا ہے۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں، اس نے دیکھا کہ قبر سے نکلا ہوا ایک مردہ پاس بیٹھا اس کے کپڑے ٹٹول رہا ہے۔ جگیر باپ کو زندہ دیکھ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور چل پڑا۔ جگیر باپ تھوڑی دیر خاموش رہا جیسے حواس مجتمع کر رہا ہے۔ پھر اس نے پکار کے کہا، ”کہاں جا رہے ہو، لو یہ پھٹے کپڑے

لے جاؤ۔ بیچ کھاؤ۔" وہ قحط زدہ آدمی بھاگنے لگا جیسے کوئی بھوت دیکھ کے بھاگے اور ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔

جبیر باپ اس کے پاس پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔

جبیر باپ نے دیکھا ایک گھوڑے پر کچھ لوگ پڑے ہوئے ہیں، کچھ بے حس و حرکت حرکت ہیں۔ کچھ کے ہاتھ آہستہ آہستہ گھوڑے کو ٹٹول رہے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی چھلکا آجاتا ہے، کسی کے ہاتھ میں کوئی ہڈی، کچھ کتے بھی سونگھتے پھر رہے ہیں، جبیر باپ بھی گھوڑے پر گر پڑا اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ ایک چوسی ہوئی ہڈی اس کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ اسے اپنے منہ کے پاس لے جا رہا تھا کہ ایک کتا غرا کے جھپٹا اور ہڈی ہاتھ سے چھین لے گیا۔

۵

ایک درخت پر بہت سے گدھ بیٹھے نظر آرہے تھے۔ کچھ زمین پر بھی بیٹھے کھیل کود رہے تھے، شاید لنگر خانہ قریب آگیا تھا۔ جبیر باپ کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے۔ واقعی لنگر خانہ سامنے تھا۔ لوگوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ زندوں کی بھی مردوں کی بھی۔ ہری منڈل بھی پیچھے کھڑا تھا۔ جبیر باپ بھی اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ہری منڈل پر ایک حیرت سی طاری تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے گدھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کے وہ کالے کالے پر اور سرخ سرخ سینے جن پر لال ٹول کھیس داڑھی کی طرح لٹک رہی تھی۔ ہری منڈل کو ایسا نظر آرہا تھا جیسے سینکڑوں کالی کی مورتیں زندہ ہو گئی ہیں، اور زبان لٹکائے ناچ رہی ہیں، جبیر باپ سے اس نے بڑی سہمی آواز میں کہا، "وہ دیکھو کالی مائی کی لیلا۔" جبیر باپ کی قحط لیلا دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں کھچڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس نے زیادہ دھیان نہ دیا اور کھچڑی کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ ہری منڈل کا ہاتھ تھامے تھامے، دونوں ایک دوسرے کو سنبھال رہے تھے۔ اتنے میں پیچھے سے دو مسٹنڈے آئے اور انھیں پیچھے دھکیل کے آگے نکل گئے۔ تھوڑی دیر میں اپنے برتنوں میں کھچڑی بھرے ہوئے واپس ہوئے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور منتظمین کو خراب کھچڑی بانٹنے پر موٹی موٹی گالیاں دے رہے تھے۔ وہ خاندانی قسم کے فقیر معلوم

ہوتے تھے۔اسی طرح جب جب بھی خاندانی فقیر آتے تب تب ان اناڑی فقیروں کو دھکے دے کے آگے نکل جاتے۔ گھنٹوں کے بعد خدا خدا کر کے جگیر باپ اور ہری منڈل کی باری آئی۔ جگیر باپ ذرا آگے تھا۔اس کے ہاتھ میں پتوں کا ایک دونا تھا جسے اس نے زمین سے اٹھالیا تھا۔ دونے میں جلتی ہوئی گرم گرم کھچڑی پڑی، بھاپ نکل رہی تھی۔ جگیر باپ ٹوٹ کے گرا۔ اس نے کھچڑی میں بجائے ہاتھ ڈالنے کے منہ ڈال دیا۔ ہری منڈل سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ ہری منڈل بھی اپنا منہ اس دونے میں گھسیڑ رہا تھا۔ اس وقت دو بھوکے انسان تھے۔ نہ کوئی ہندو تھا نہ مسلمان۔ اس نے دونا اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ جگیر باپ نے اپنی طرف۔ ناتوانوں کی لڑائی ہوئی۔ دونا پھٹ گیا۔ کھچڑی گر پڑی۔ یہ دونوں بھی گر پڑے۔ حسرتوں کا ڈھیر ہو گیا۔ پیچھے کے لوگ انھیں روندتے ہوئے گزر گئے۔ دو تین کراہوں کی آواز آئی اور بس۔

○......○......○

نواں باب

لنگر خانہ ہر ایک کے لیے تو کھولا نہ جا سکتا تھا، نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔ تھوڑا بہت چاول اب بھی بازار میں مل جایا کرتا تھا، لیکن اس کے دام اتنے ہوتے کہ ان کا خریدنا ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ چاول کم ہی مقدار میں سہی، مگر بندھے ٹکے سستے داموں پر ان لوگوں کو مل جایا کریں جو خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس لیے حکومت کی طرف سے راشن کی دکانوں کا بندوبست کیا گیا۔ ان دکانوں کی نگہداشت اور گلہ نمک شکر اور مٹی کے تیل کی معقول تقسیم کے لیے ہر یونین میں ایک ایک فوڈ کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس فوڈ کمیٹی نے یونین بورڈ کو پس پشت ڈال دیا۔ مجید صاحب چاہتے تھے کہ جمعدار صاحب کو گھوڑا مارا کی فوڈ کمیٹی کا صدر بنائیں، لیکن پنیر میاں آخر ایم ایل تھے، وہ اوپر سے احکام لے آئے اور فوڈ کمیٹی کے صدر ہو گئے۔ گھوڑا مارا میں راشن کی دکان کسے ملے۔ یہ بڑا میڑھا سوال تھا۔ سرت ساہا تو دعوے دار تھا ہی، مگر اسے دکان دینے میں اندیشہ یہ تھا کہ معلوم نہیں کتنا مار دے۔ ضرورت مندوں تک شاید آدھا تہائی پہنچ سکے۔ چونکہ دکان دلوانا بڑی حد تک پنیر میاں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے وہ اس معاملے میں اپنی ذمے داری خاص طور سے محسوس کر رہے تھے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انھیں یہ کام اپنی ذاتی نگرانی میں کرانا ہوگا۔ وہ خود اپنے نام سے تو دکان لے نہ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے داماد سلطان میاں کے نام سے دکان کرا دی۔ یہ سن کے نگن بابو اور سرت ساہا کو سخت شکایت ہوئی اور انھوں نے یہ اتہام لگایا کہ پنیر میاں شاید سارا منافع خود کھا جانا چاہتے ہیں اور اپنے پرانے شرکا کو غچہ دے رہے ہیں، پنیر میاں کو پبلک کے مفاد کے خیال سے یہ اتہام خاموشی سے برداشت کرنا پڑا۔

۲

سلطان میاں کو راشن کی دکان کے لیے بیس من چاول دو من دال۔ ایک من نمک، ڈھائی من شکر اور مٹی کے تیل کے دو ٹین ملے۔ کشتی لدی پھندی آہستہ آہستہ گھوڑا مارا کی طرف آ رہی تھی۔ راستے میں چیر بھدرشن پڑتا تھا۔ یہاں بہت بڑا بازار لگتا تھا۔ آج بازار کا دن تھا۔ سلطان میاں کے جی میں آئی کہ ذرا گھوڑا مارا گھوم پھر کے بازار کا رنگ ڈھنگ دیکھیں۔ رستے میں ٹخنے ٹخنے کیچڑ تھا۔ سلطان میاں نے اپنا ''انگریزی جوتا'' ہاتھ میں لے لیا اور سبز رنگ کی تہمد گھٹنوں کے اوپر چڑھالی، بازار میں بڑی بھیڑ تھی، کندھے سے کندھا چھلتا تھا، سلطان میاں نے بہت سی چیزوں کے دام دریافت کیے۔ ایک عدد کوچو (بنڈے کی قسم کی ایک چیز) بیس سیر وزن کا خرید ڈالا۔ ایک گھڑا کھجور کا ''ہزاری گڑ'' خریدا۔ کچھ مرغیاں بھی لیں کچھ انڈے بھی، قریب ہی چاول کی دکان تھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ دو روپیا سیر۔ ''ہیں!! دو روپے سیر!'' انھوں نے کہا، ''اچھا نمک کا دام تو پوچھیں؟''

''ڈیڑھ روپیا سیر۔''

''ڈیڑھ روپیا سیر! غضب خدا کا۔''

''دو روپیا سیر۔''

''دو روپیا سیر۔''

توبہ توبہ، وہ کتنا سستا بیچنے لے جا رہے تھے۔ نو آنے سیر چاول۔ چار آنے سیر نمک۔ بارہ آنے سیر چینی، افوہ یہ لوگ کتنا منافع کھا رہے ہیں۔ تب ہی سرت ساہا دھنا سیٹھ بنا پھرتا ہے۔ کیوں نہ وہ سرت ساہا کو نیچا دکھائیں، اس کے باپ کو بھی مال اتنا سستا نہیں مل سکتا جتنا انھیں ملا تھا۔ اگر بجائے گھوڑا مارا میں بیچنے کے وہ سب سامان یہیں بیچ ڈالیں تو ایک دم سے امیر ہو جائیں، مگر نہیں۔ آخر گھوڑا مارا والوں کا بھی تو حق ہے، اچھا نصف اُلا نصف اُلی کا معاملہ کیسے رہے گا۔ ہاں یہی مناسب ہے، بیچنے تو چلے تھے آدھا، مگر خریداروں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ بڑی مشکل سے گھوڑا مارا والوں کے

لیے چوتھائی بچا سکے۔ انھوں نے کہا، اچھا آئندہ کھیپ جب لائیں گے تو اس میں سے ایک چوتھائی یہاں بیچیں گے اور تین چوتھائی گھوڑا مارا میں۔ قیمص مختلف مقامات کا چکر لگایا کرتا۔ خصوصاً بازاروں کا جیسے مخبری کر رہا ہو۔ آج وہ یہاں آیا ہوا تھا۔ اس نے ''چھلتان میاں'' کو دیکھ لیا، مگر ''چھلتان میاں'' اسے نہ دیکھ سکے۔

۳

راستے میں سلطان میاں سوچنے لگے کہ گاؤں میں جا کے کیا کہیں گے۔ اگر کہیں کہ اس دفعہ اتنا ہی ملا آئندہ زیادہ ملے گا تو ممکن ہے کہ ''موزید شاب'' کو خبر ہو جائے اور وہ انھیں دھر لیں۔ پنیر میاں کو بدنام کرنے کا انھیں اچھا موقع ملے گا، حالانکہ پنیر میاں بے چارے کو خبر بھی نہیں۔ نہیں یہ بہانہ ٹھیک نہیں۔ اچھا کشتی ڈوبنے کا بہانہ کیسا رہے گا؟ مگر یہ سب سامان پھر بچا کیسے اور کچھ بھیگا بھی نہیں؟ انھیں بھگو دیں تو؟ کیا حماقت ہے، چاول بھیگ کے خراب ہو جائیں گے، اور نمک اور چینی بہہ جائیں گے۔ یہ بہانہ بھی واہیات ہے، ڈاکے کا قصہ اچھا رہے گا۔ ڈاکو پستول بندق لے کے آئے اور لوٹ لے گئے، مگر پھر وہی مشکل، یہ سامان جو ساتھ ہے اسے کیسے چھوڑ گئے۔ خوشامد درآمد سے؟ ترس کھا کے؟ نہیں کوئی نہیں مانے گا، اصل مشکل اس سامان کی ہے، اسے پھینک ہی کیوں نہ دیں؟ مگر پھینکنے سے فائدہ؟ ایسا ہی ہے، تو بیچ ہی نہ دیں؟ جہاں تین چوتھائی بیچ دیا وہاں یہ ایک چوتھائی بھی سہی، وہاں کے لوگ بھی تو حاجت مند ہیں۔ کتنی خوشامد کر رہے تھے، دوسری کھیپ پوری کی پوری وہ گھوڑا مارا ہی میں بیچ دیں گے، بلکہ اس کا ایک ایک حصہ غریبوں کو مفت بھی دیں گے اپنے پاس سے۔ انھوں نے کشتی واپس کی اور بقیہ سامان بھی بیچ ڈالا۔ اس کے بعد ایک چھوٹی ندی میں کشتی ڈبو دی اور کرائے کی کشتی میں گھوڑا مارا واپس ہوئے۔ یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ وہ گھوڑا مارا سے جلدی میں اکیلے ہی کشتی لے کے چل پڑے تھے کسی کھینے والے کو ساتھ بھی نہ لے سکے تھے۔ اچھا ہوا ورنہ اس وقت کیسی دقت ہوتی۔ بعض وقت اتفاق کی بات بھی کتنی اچھی اور مفید ثابت ہوتی ہے۔

۴

گھوڑا مارا پہنچ کے سلطان میاں نے کشتی کے ڈوب جانے کا اعلان کیا، خود ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ گھر میں عورتوں نے فوراً صدقہ اتارا۔ ایک بکرا ذبح کر کے غریبوں کو تقسیم کیا گیا۔ نکتہ چینوں نے چہ میگوئیاں شروع کیں۔ سب سے زیادہ سرت ساہا نے، کشتی ڈوب کیسے گئی، طوفان سے یا بوجھ سے۔ سلطان میاں نے اتنی تفصیل سوچی نہ تھی، کہا، ''دونوں ہی سے سمجھ، مگر دو تین روز سے تو ہوا کا نام نہیں، طوفان کیسا۔''

''یہاں نہ آیا ہوگا۔''

سلطان میاں نے دیکھا۔ اب لوگوں کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہا ہے، بولے، کشتی میں بوجھ بھی تو بہت تھا۔ ہم سے اکیلے سنبھلی نہیں۔''

نگن بابو نے کہا، ''تو پھر کسی کو ساتھ لے کر کیوں نہیں گئے تھے۔ اکیلے کاہے چلے گئے۔''

''ہاں یہ کہو تو مانتے ہیں، ہم تو خود ہی پچھتا رہے ہیں۔''

جلودھر یہ سوال جواب سن سن کے مسکراتا رہا بعد میں وہ سلطان میاں کو ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا، ''چھلتان میاں، ہم کو سب خبر ہے آپ کاہے کو چھپاتے ہیں۔''

چھلتان میاں چونکے، ''کیا خبر ہے؟''

''یہی کہ آپ نے چر بھدرشن کے بازار میں سب بیچ ڈالا۔ گواہ موجود ہیں۔''

سلطان میاں زرد پڑ گئے۔ ان کا حلق سوکھنے لگا۔ منہ سے بات نہ نکلی۔

جلودھر نے کہا، ''اپ نے چار پانچ ہزار روپے کمائے ہیں۔ اگر خیریت چاہتے ہیں تو ڈھائی ہزار روپے پارٹی کے لیے داخل کیجیے۔''

سلطان نے کہا، ''چار پانچ ہزار کہاں۔ بھیا قسم لے لو دو ہزار روپے ملے ہیں۔''

''اچھا پانچ سو تاوان ہی سہی ابھی روپیا داخل کیجیے ورنہ ہم موزید شاب کو خبر کر دیں گے۔''

سلطان میاں چپکے سے اٹھے اور ڈھائی ہزار روپیا جلودھر کے ہاتھ میں تھما کے پلنگ پر منہ لپیٹ کے پڑ رہے۔

۵

قیس سمجھا تھا کہ جلودھر بابو طوفان مچا دیں گے، سلطان میاں دھرے جائیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ یہاں دیکھا تو ٹائیں ٹائیں فش۔ اسے اچھا نہ لگا۔ چپکے سے جا کے نگن بابو سے کہہ آیا، نگن بابو نے کہا، ''یہ کہو، ہم تو کہتے تھے کہ کیسا طوفان ہے بھائی۔''

انھوں نے سرت سابا سے مشورہ کیا۔ رائے یہ ہوئی کہ قائل معقول کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں، ایسے بدمعاش کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیے۔ پنیر میاں کا داماد ہے تو ہوا کرے، پنیر میاں بھی ایک شیطان ہے اپنے ساتھیوں کو دھوکا دیتا ہے۔ وہ بھی مزہ چکھے تو اچھا ہے، فوراً خط لکھ کے پولیس کو اطلاع دی، مگر کون جانے پولیس پنیر میاں سے ڈر جائے یا رشوت کھا لے۔ ایک نقل 'موزیب شاب' کو بھی احتیاطاً بھیجنی ضروری سمجھی گئی۔ موزید شاب نے فوراً سلطان میاں پر مقدمہ قائم کر دیا۔ پنیر میاں بہت گھبرائے۔ انھوں نے مصلحت اس میں دیکھی کہ مدافعت کی بجائے حملہ بول دیں۔ انھوں نے کہنا شروع کیا، ''میں تو پہلے ہی سمجھا تھا کہ میں موزید شاب کی مرضی کے خلاف فوڈ کمیٹی کا صدر ہوا ہوں۔ اب کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ مجھ پر بس نہ چلا تو میرے داماد ہی کو ناتھ دیا، موزید شاب بڑا خطرناک آدمی ہے ایسا آدمی تو دیکھا نہیں۔'' ہر ایک سے موزید شاب کی کینہ پروری کے بارے میں طرح طرح کے قصے کہنے شروع کیے۔ بہتوں نے تو یقین نہیں کیا، مگر کچھ ایسے بھی خوش عقیدہ تھے جنھیں یقین نہیں تو شبہ ضرور تھا۔ پنیر میاں سرپکڑے وزرا کے پاس بھی پہنچے اور کہا اگر موزید شاب ضلع میں زیادہ دن رہے تو پنیر میاں اور ان کا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ وزرا بھی پسیج گئے۔ ایک ایم ایل اے کی بات کیسے نہ سنتے، مگر قحط کا زور تھا، اور مجید صاحب کے قحط کے انتظام کی شہرت تھی۔ وہ ذرا قحط پر قابو پالیں اور انتظامات درست کر لیں پھر ان کا تبادلہ کر دیا جائے گا۔ پنیر میاں کی تسلی نہ ہوئی اس انداز سے ''اچھا'' کہہ کے اٹھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

⊙......⊙......⊙

دسواں باب

موتی کے بکنے کا چھانو کو اتنا صدمہ ہوا کہ بالکل ہی پڑ گیا۔ لیمن چوس کھانے کے بعد پھر ''موتی موتی'' کی رٹ لگ گئی اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اسے تیز بخار آ گیا، غفلت طاری ہوگئی۔ غفلت میں بھی اس کے منہ سے موتی موتی نکلتا۔ جمعدار صاحب کا بھی دل رو رہا تھا۔ آنکھیں رو رہی تھیں، مگر آواز سے رونا ان کی خودداری کے خلاف تھا۔ چھانو کے پاس نہ اُن سے رہتے بنتا تھا نہ وہاں سے جاتے، تھوڑی دیر کھڑے رہتے۔ اس کے منہ سے بار بار ''موتی موتی'' سن کے وہ اپنا ہونٹ دبائے وہاں سے چلے جاتے، پھر تھوڑی دیر میں واپس آ جاتے، بی بی جان کا دل بھی کٹا جا رہا تھا، مگر کیا کرتیں آنچل سے اپنے آنسو پونچھ پونچھ کے رہ جاتیں۔ بی بی جان جانتی تھیں کہ گھر میں روپیا نہیں رہا۔ دوا درمن کیسے ہو۔ اس لیے علاج کے لیے بھی نہ کہتیں۔ جمعدار صاحب خود غم کھانے پر مجبور تھے اور یہی غم انھیں کھائے جا رہا تھا۔ آخر وہ جی کڑا کر کے ابھے بابو کے پاس گئے۔ ان سے کہا، ''بابو جی جب تک ہمارے پاس روپیا تھا، ہم آپ کو دیتے رہے۔ اب نہیں ہے، چھانو بہت بیمار ہے۔ آپ چل کے اسے دیکھ لیجیے۔ ہمیں جب خدا روپیا دے گا تو ہم آپ کو دے دیں گے۔'' جمعدار صاحب جو کچھ زبان سے کہہ سکے اس سے کہیں زیادہ ان کے پریشان بالوں، بیٹھے ہوئے گالوں، دھنسی ہوئی آنکھوں، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں اور گڑگڑاتی ہوئی آواز نے کہا۔ ابھے بابو کچھ دیر سوچنے لگے۔ بالآخر پسیج گئے۔ کہنے لگے، ''اچھا چلیے۔'' انھوں نے چھانو کو آ کے دیکھا۔ دیکھتے ہی الٹے پاؤں وہاں سے بھاگے۔ جمعدار صاحب نے انھیں روکنا چاہا، مگر وہ اپنا ہاتھ چھڑا کے ''ابھی آیا'' کہہ کے چلے گئے۔ وہ اس تیزی سے گئے جیسے کوئی بہت ضروری کام ہے جسے انھیں ابھی کرنا ہے، اور بات بھی یہی تھی۔ وہ سیدھے کھیت کی طرف گئے اور وہاں سے تھوڑی دیر میں دھوتی سے ہاتھ سے

پونچھتے ہوئے واپس ہوئے۔ چھانو کی حالت دیکھ کے نہ محض ان کا دل رونے لگا تھا، بلکہ پیٹ بھی۔ اب انھوں نے چھانو کا پھر معائنہ کیا اور بڑے خلوص کے ساتھ کہا، ''جمعدار صاحب چھانو میاں بہت بیمار ہیں۔ ان کا علاج ہمارے بس کی بات نہیں۔ شہر لے جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھایئے۔'' جمعدار صاحب کھڑے کھڑے ایک دم سے زمین پر بیٹھ گئے جیسے کوئی جھکی ہوئی دیوار بیٹھ جائے۔ اچھے بابو وہاں سے چلے گئے۔ اس کا انھیں علم بھی نہ ہوا۔ بی بی جان نے آ کے جب ان کا ہاتھ ہلایا۔ وہ ہاتھ جس پر وہ اپنا سر ٹیکے ہوئے تھے۔ تب انھیں خبر ہوئی۔ چونک کے انھی سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بی بی جان اچھے بابو کی آواز پر کان لگائے ہوئے تھیں۔ جتنا وہ غور سے سنتیں اتنی ہی انھیں اپنے دل کی آواز زیادہ زور سے سنائی دیتی، مگر پھر بھی اچھے بابو کی آواز ان کے کانوں میں اتنی پڑ ہی گئی کہ وہ اس کا تھوڑا بہت مطلب سمجھ گئیں۔ جمعدار صاحب سے انھوں نے کہا، ''شہر لے چلو موز ید شاب سے کہو وہ کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر دیں گے۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''موز ید شاب۔ ہاں ٹھیک تو کہہ رہی ہو۔ ہمیں پریشانی میں کچھ سوجھتا نہیں۔ کیا بتائیں ہم چھانو کو کتنا چاہتے ہیں۔''

۲

جمعدار صاحب چھانو کو شہر لے جانے کا بندوبست نہ کر سکے۔ چھانو میں اب اٹھنے بیٹھنے کی سکت نہ تھی۔ کشتی کرائے پر لیتے تو کرایہ کہاں سے دیتے۔ موتی کی قیمت کا جو پانچ روپیا بچا کے رکھا تھا اس میں بھی دو روپے خرچ ہو چکے تھے۔ کشتی آٹھ دس روپے سے کم کرائے پر نہ ملتی تھی۔ ایک بڑی مشکل اور ہو گئی تھی کہ فاقہ کرتے کرتے غم کھاتے کھاتے چھانو کی فکر میں گھلتے گھلتے بی بی جان کے کمزور جسم نے بھی جواب دے دیا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کے اور بھی اپنی حالت ظاہر نہ کرتیں کہ جمعدار صاحب پھر تو بالکل نہ سنبھل سکیں گے۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی ہمت و استقلال جمعدار صاحب کو بڑی حد تک سنبھالے ہوئے ہے، مگر یہ قصہ کب تک چلتا۔ بالآخر بی بی جان کو بھی بخار آ ہی گیا، اور ان کے

بھی ہاتھ منہ سوجنے لگے۔اب جمعدار صاحب کیا کریں۔بی بی جان کو چھوڑ کے کیسے جائیں اور انھیں ساتھ لے بھی جائیں تو کیسے؟ جمعدار صاحب کی نظروں میں دنیا نہ صرف تاریک ہوگئی تھی، بلکہ اس تاریکی میں کالے کالے ناگ بھی ہر طرف پھنکارتے نظر آتے آ رہے تھے۔صبر کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹا جا رہا تھا۔انھوں نے اپنے کرتے کا دامن زور سے پکڑ کے اپنی آنکھوں پر دبالیا۔ دامن تر بہ تر ہو گیا۔انھوں نے جی کڑا کر کے مجید صاحب کو اپنا حال ٹوٹی پھوٹی عبارت میں لکھ بھیجا۔

۳

جمعدار صاحب کو گیدو کی ماں کی یاد بار بار آ رہی تھی۔وہ ہوتی تو کیسی محبت سے چھانو کی تیمارداری کرتی۔بی بی جان کی خدمت بھی بجالاتی۔معلوم نہیں کہاں چلی گئی۔خدا معلوم کس حال میں ہے، جمعدار صاحب کا دل اتنا دکھا ہوا تھا کہ گیدو کی ماں کے خیال سے بھی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اتنے میں ہاجرہ گیدو کو لیے ہوئے آئی۔گیدو بجائے آدمی کے بندر کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔اس کے سوکھے ہوئے سینے سے چمٹا رہتا اور جو دو ایک قطرے دودھ کے نکلتے انھیں چوسا کرتا۔ہاجرہ نے دیکھا کہ جمعدار صاحب کی بیٹھی ہوئی آنکھیں روتے روتے سرخ ہوگئی ہیں۔اور گھر کا عجیب عالم ہے جیسے گھر نہیں قبرستان ہے، اس نے دبی زبان سے کہا، ''گیدو کا باپ جب مرا تھا تو ہمارا دل پھٹا جا رہا تھا۔مولانا نے جب بڑی کتاب پڑھ کے سنائی اور پانی پھونک کے ہم کو دیا تو جیسے کسی نے ہمارے دل کو تھام لیا، چا چا بھی وہی کریں نا۔''

ہاجرہ کی آواز جمعدار صاحب کے کان سے دل تک اتر گئی، اس وقت انھیں مولانا مستنصر باللہ کی بڑی کمی محسوس ہوئی۔جمعدار صاحب کا قرآن شریف بہت رواں نہ تھا، مگر کیا کیا جائے، اٹک اٹک ہی کے سہی اللہ کا کلام تو پڑھ ہی لیں گے۔انھوں نے وضو کیا اور قرآن شریف سر پر رکھ کے لائے اور بڑے ادب سے بیٹھ کے اسے کھولا، کھلا تو سورۂ یٰسین کی جگہ۔بات یہ تھی کہ عموماً کلام سورۂ یٰسین ہی پڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔اس لیے کتاب بھی کھلی تو وہیں سے، جمعدار صاحب کے دل پر

سورۂ یٰسین دیکھ کے عجیب دہشت طاری ہوگئی اور وہ خوف سے کانپنے لگے۔ جلدی سے انھوں نے بہت سے ورق الٹ دیے، بالآخر سورۂ رحمٰن نکال کے پڑھنے لگے۔ سورۂ رحمٰن کے آہنگ نے ان دل کے دل سے خوف اور دہشت کے اثر کو کم کیا اور یہ آہنگ ان پر اتنا چھا گیا کہ وہ خوش الحانی سے قرأت کرنے لگے، اور بڑی دیر تک پڑھتے رہے۔ فبای الآء ربکما تکذبان کے ترجمے پر اُن کی نظر پڑی۔ ''پس کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے۔'' جمعدار صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ''نعمتیں؟ رب کی نعمتیں؟'' (چھانو اور بی بی جان کی طرف انھوں نے دیکھا) یہ سب بھی نعمتیں ہیں؟ رب کی نعمتیں! کون جانے؟ ان کے دل میں ایک عجیب بے چینی پھر پیدا ہوگئی۔ معمولی قسم کا شک وشبہ بھی انسان کے امن وسکون کا دشمن ہوتا ہے۔ یہاں تو اتنے بڑے معاملے میں شک وشبہ تھا۔ جمعدار صاحب اٹھ کے ٹہلنے لگے۔ ہاجرہ نے گھونگھٹ کے آڑ سے کہا، ''چاچا پھونک کے پانی پلا دیجیے نا۔ خود بھی پی لیجیے دل تھم جائے گا۔'' جمعدار صاحب کھوئے کھوئے سے تھے۔ اس کی آواز پر ذرا چونک کے بولے، ''کیا'' اس نے پھر وہی دہرایا۔ جمعدار صاحب ذرا سنبھلے۔ دل میں کہنے لگے، ایک یہ اَن پڑھ عورت ہے اور ایک میں ہوں۔ انھیں جلودھر و مخلص کا خیال آیا جوان کے دل میں شک وشبہ کا بیج بو گئے تھے۔ انھوں نے دل سے لاحول پڑھی۔ توبہ استغفار کی، انھیں مولانا مستنصر باللہ کا وہ ارشاد بھی یاد آ گیا کہ ''کیسی ہی مصیبت پڑے خدا کو نہ بھولیے۔ اس پر بھروسا رکھیے، یہی سب سے بڑا تعویذ ہے۔'' انھوں نے پھر اس ایمان کی رسّی کو جوان کے ہاتھ سے چھوٹی جارہی تھی مضبوط پکڑ لیا۔ اپنی جگہ پر واپس گئے اور پھر بڑے خشوع وخضوع سے سورۂ رحمٰن پڑھنے لگے۔ پڑھ کے اٹھے۔ پانی دم کیا۔ کچھ چھانو کو پلایا، کچھ بی بی جان کو، کچھ خود پیا۔ پانی پیتے ہی انھوں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے دل کو تھام لیا۔

۴

اب جمعدار صاحب بیٹھے زیادہ تر قرآن شریف ہی کی با آواز بلند تلاوت کیا کرتے۔ ہاجرہ ان کے کہنے سے یہیں رہنے لگی تھی۔ بیمار کی دیکھ بھال کے لیے، پہلے بی بی جان چھانو کے پاس

لیٹتی تھیں، مگر جب سے خود بیمار پڑی تھیں احتیاطاً الگ سونے لگی تھیں۔ ہاجرہ نے بی بی جان کی جگہ لے لی تھی۔ اس کے ایک طرف چھانو ہوتا اور دوسری طرف گیدو۔ جمعدار صاحب راتوں کو اٹھ اٹھ کے دبے پاؤں جاتے، چھانو کے گالوں کو چھوتے، انگلیاں چپ سے جل جاتیں۔ دل دھڑکنے لگتا اور وہ چپکے سے لیٹ رہتے۔ ایک جمعدار صاحب قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ہاجرہ نے ان کے پاس آ کے آہستہ سے کہا، ''چھانو میاں بول نہیں رہے ہیں، چل کے دیکھیے تو۔'' جمعدار صاحب ایک دم سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ قرآن شریف کھلا کا کھلا رہا، فوراً چھانو کے پاس پہنچے۔ اسے غور سے دیکھنے لگے۔ انھوں نے اسے دھیرے دھیرے مگر بڑے پیار سے پکارا، ''ابوالبرکات میرا شان میرا جان — چھانو۔''

لیکن اس نے ایک بھی جواب نہ دیا۔ جمعدار صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں اس کے کان کے پاس کہا، ''موتی کو منگا دیں؟''

یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اس وجہ سے ہو رہی تھیں کہ بی بی جان کے کان میں نہ پڑیں۔ ان پر رات سے کچھ غفلت سی طاری تھی، مگر غفلت کے باوجود بی بی جان کا دل چھانو میں اس طرح اٹکا ہوا تھا کہ وہاں کچھ ہوا اور یہاں کھٹ سے خبر ہوئی۔ چونک کے اُٹھ بیٹھیں اور ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' کہتی ہوئی گرتی پڑتی پہنچیں۔ موتی کے نام پر چھانو کے ہونٹ ذرا ہلے، جمعدار صاحب نے بے قرار ہو کے ان ہلتے ہوئے ہونٹوں کو پیار کیا اور ''میں تیرے قربان'' کہہ کے وہیں بیٹھ گئے۔ بی بی جان نے نظر بھر کے چھانو کو دیکھا۔ نتھنوں کے سامنے انگلیاں رکھ کے سانس دیکھی۔ چل رہی تھی۔ جمعدار صاحب نے ناخوش ہو کے کہا، ''کیا منحوس بات کر رہی ہو، نتھنوں کو کیوں چھو رہی ہو، جاؤ لیٹو۔'' بی بی جان نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور چھانو کے چہرے پر نظر جمائے رکھی۔ اس کے بعد انھوں نے جمعدار صاحب سے مخاطب ہو کے کہا، ''لاؤ سورۂ یٰسین پڑھو۔''

جمعدار صاحب، ''سورۂ یٰسین! نہیں، نہیں، یا اللہ۔''

بی بی جان، ''جو میں کہتی ہوں کرو۔''

جمعدار صاحب ''یا اللہ رحم، یا اللہ رحم'' کہتے ہوئے گئے اور قرآن شریف لے آئے۔ بی بی جان نے کہا، ''پہلے اس کی ہوا دو۔'' جمعدار صاحب نے چھانو کو کلام پاک کے ورقوں کی ہوا دی۔ پھر سورۂ یٰسین پڑھنے لگے، لیکن ''والقرآن الحکیم'' کے آگے نہ بڑھ سکے۔ ہچکی بندھ گئی اور حلق میں پھندے پڑ گئے۔ ''نہیں پڑھا جاتا'' کہہ کے انھوں نے کتاب بند کر دی۔ جمعدار صاحب نے اپنی ہچکیوں میں چھانو کی آخری ہچکی نہ دیکھی، مگر بی بی جان دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے کہا، ''اچھا جاؤ جلدی سے مؤذن صاحب کے بھائی کو بلا لاؤ۔''

ادھر جمعدار صاحب ہڑبڑا کے باہر گئے اِدھر بی بی جان چھانو کی لاش پر گر پڑیں اور اسے کلیجے سے لپٹا لیا۔ جمعدار صاحب مولوی نورالابصار کو لے کر واپس آئے۔ پھول محمد بھی ساتھ تھا۔ وہ اتنا گھبرائے ہوئے تھے کہ بی بی جان کے پردے کا خیال بھی بھول گئے۔ بغیر کھنکارے ہوئے مولوی نورالابصار کو لیے ہوئے اندر چلے آئے۔ بی بی جان نے جھٹ سے چھانو کو لٹا دیا اور دیوار کی طرف پیٹھ کر لی۔ مولوی صاحب نے چھانو کو دیکھتے ہی کہا، ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

جمعدار صاحب نے گھبرا کر کہا، ''مولوی صاحب سورۂ یٰسین پڑھیے۔''

مولوی صاحب نے کہا، ''اب پڑھنے سے کیا فائدہ۔''

جمعدار صاحب خوف زدہ ہو کر ہر ایک کا منہ تکنے لگے۔ دل میں ڈرتے تھے کسی سے حال پوچھیں تو معلوم نہیں کیا جواب دے؟ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو بی بی جان چھانو کو گود میں کیوں لیے ہوئے ہوتیں۔ جمعدار صاحب نے چھانو کا ماتھا چھوا۔ انگلیاں پھر چپ سے جل گئیں۔ بخار کی گرمی سے نہیں، بلکہ موت کی ٹھنڈک سے۔ جمعدار صاحب چکرا کے گرنے لگے۔ مولوی نورالابصار نے جمعدار صاحب کی حالت دیکھ کے ان کی پیٹھ کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیا اور کہا، ''جمعدار صاحب صبر کیجیے۔''

مولوی صاحب کے منہ سے صبر کا نام سن کے جمعدار صاحب اسی طرح بے صبر ہو گئے جس طرح کبھی ان کے منہ سے یہ نام سن کے ہاجرہ ہوئی تھی۔ ہاجرہ کی بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ

حیرت سے جمعدار صاحب کو دیکھنے لگی۔ پھول محمد چھانو پر گر پڑا، اور جمعدار صاحب بھی۔ بی بی جان نے آہستہ سے کہا، ''تم تو مرد آدمی ہو، خدا نے اپنی امانت واپس لے لی۔ اس میں ہمارا کیا بس۔''

جمعدار صاحب نے دیکھا بی بی جان واقعی صبر شکر کا مجسمہ بنی ہوئی ہیں۔ انھیں ججیر باپ کا بھی خیال آیا آخر وہ بھی تو باپ تھا۔ اس کا بیٹا بھی تو مرا تھا۔ اس نے کس صبر سے برداشت کیا تھا۔

جمعدار صاحب سنبھل گئے۔ مولوی نورالابصار صاحب نے مناسب یہ سمجھا کہ باآواز بلند تلاوت شروع کر دیں۔ انھوں نے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت شروع کی۔ ہاجرہ جھٹ سے مؤدب بیٹھ گئی اور بی بی جان بھی اور پھول محمد اور جمعدار صاحب بھی۔ جمعدار صاحب فبای الآء ربکما تکذبان پر ذرا چونکے۔ ''پس کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاؤ گے۔''

''نعمتیں! اپنے رب کی نعمتیں! یہ نعمتیں!'' مگر پھر انھیں جلودھر کی شیطنت کا خیال آیا اور مولانا مستنصر باللہ کے ارشاد کا۔ انھوں نے ایمان کی رسّی ایک دفعہ پھر مضبوط پکڑ لی۔ اس مضبوط رسّی نے ان کے دل کی کشتی کو ڈوبنے سے بچا لیا۔ کشتی تو اب بھی ہچکولے کھا رہی تھی، مگر صبر کے کنارے سے بندھی ہوئی تھی، اور ایمان کی مضبوط رسّی نے باندھ رکھا تھا۔

مولوی صاحب نے تلاوت ختم کر کے کہا، ''خدا کا نام لے کے تجہیز تکفین کا بندوبست کیجیے۔'' جمعدار صاحب کا جی چاہتا تھا کہ جتنی دیر تک چھانو کو نظر کے سامنے رکھ سکیں رکھیں، مولوی صاحب نے کہا، ''جلد دفن کرنے کا حکم ہے۔'' جمعدار صاحب کو اس حکم کے آگے بھی سر جھکانا پڑا۔ چھانو کی تجہیز تکفین تھی۔ کوئی ججیر باپ کے لڑکے کی تو تھی نہیں کہ ایسے ہی ویسے ہو جاتی۔ جمعدار صاحب کا دل اب کچھ کچھ تسلی اس خیال سے پا رہا تھا کہ تجہیز تکفین بڑے اہتمام سے ہو۔ وہ اہتمام جو جمعدار صاحب اور اس سے زیادہ چھانو کے شایانِ شان تھا، مگر اہتمام بغیر روپے کے تو ہوتا نہیں اور یہاں روپیا کہاں تھا۔ خالی تین روپے موتی کی قیمت کے بچے رکھے تھے۔ چاہے تجہیز تکفین میں خرچ کر دیں۔ چاہے بی بی جان کی دوا علاج اور غذا میں۔ انھوں نے بی بی جان سے پوچھا، بی بی جان نے وہی کہا جو جمعدار صاحب کا دل کہتا تھا، یعنی اس روپے سے چھانو کو نیا کفن دیا جائے۔ سفید لنکلاٹ کا،

مولوی نور الابصار کو جمعدار صاحب کی خستہ حالی اور ارمان کا احساس ہوا انھوں نے دس روپے نکال کے جمعدار صاحب کو دیے۔

چھانو کے مرنے کی خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ سب آ گئے۔ جلودھر، مخلص حتیٰ کہ نگن بابو اور سرت ساہا بھی۔ اس کے علاوہ گاؤں کے چھوٹے لوگ بھی۔ ''آج وہ کل ہماری باری ہے'' والے چھوٹے لوگ۔ یوں تو بھلا اس زمرے میں کون شامل نہیں، مگر یہ چھوٹے لوگ وہ قحط زدہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے کہ آج ہی کل میں ان کی بھی باری آنے والی ہے۔ نگن بابو کا دل بھی جمعدار صاحب کی حالت دیکھ کے پگھل گیا اور انھوں نے بھی دس روپے دیے۔ جلودھر نے پانچ روپے دینے چاہے، مگر جمعدار صاحب اس کے روپے لینے سے انکار کر دیا، اور تو اور سرت ساہا تک پر اثر ہوا۔ اس نے گھر جا کر پانچ سیر چاول بھجوا دیے۔ جمعدار صاحب کا دل ان تیروں سے اور چھلنی ہونے لگا۔ انھوں نے بالآخر کہا، ''بھائیو یہ سب مجھ پر قرض ہے، خدا نے چاہا تو میں اس کی پائی پائی ادا کر دوں گا۔'' چھانو کی تجہیز تکفین بڑے اہتمام سے ہوئی۔ بی بی جان نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ غسل بھی دہرا۔ ایک تو بیر کی پتی پڑے نیم گرم پانی کا، دوسرا اپنے چپکے چپکے بہتے ہوئے گرم گرم آنسوؤں کا۔ اسے کفن بھی سفید سفید نئے لنکلاٹ کا ملا۔ گورکن نے آ کے گہری قبر کھودی۔ جمعدار صاحب کے والد صاحب کی بغل میں۔ یہ جگہ جمعدار صاحب نے اپنے لیے رکھی تھی۔ مولوی نور الابصار نے جنازے کی نماز پڑھائی۔ جنازے میں پچیس تیس آدمی شریک تھے۔ کہاں یہ تجہیز و تکفین کہاں جحیر باپ کے بیٹے کی۔ جمعدار صاحب نے دو رکعت نماز شکرانے کی پڑھی۔

جمعدار صاحب نے شکرانے کی نماز پڑھنے کو تو پڑھی، لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُن کے دل کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ وہ سب اہتمام ختم ہو چکا تھا جس نے انھیں مصروف رکھا تھا۔ سب لوگ بھی جا چکے تھے۔ گھر میں صرف بی بی جان، ہاجرہ، گیدو اور پھول محمد رہ گئے۔ پھول محمد جمعدار ساحب کے پاس آ کے بیٹھ گیا اور اُن کا سر دبانے لاگ۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''بچہ رہنے دو جا کے لیٹو۔ تمھاری طبیعت اچھی نہیں ہے۔''

اس نے کہا، ''نہیں چاچا اچھی ہے۔'' اور بیٹھا رہا۔

جمعدار صاحب تھوڑی دیر تک بے حس و حرکت پڑے رہے۔ پھر ان کی آہستہ آہستہ بولنے کی آواز آئی۔ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں، ''بی بی جان تم...... تم سے...... منع کرتے ہیں ابوالبرکات کو نہ تیرا...... اسے...... سردی لگ جائے گی...... دھوپ میں...... ضرور جائے گا...... مرد کا بچہ ہے...... پھول محمد...... اچھا جا کے...... لیمن چوس لے آؤ...... سرت بابو...... اچھا بھیا...... تھوڑا لیمن چوس دے دو...... ہم دام...... بعد میں دے دیں گے...... موتی...... موتی۔''

جمعدار صاحب گھبرا کے اٹھ بیٹھے۔ پھول محمد کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ پھول محمد سے انھوں نے کہا، ''دیکھو تو بچہ چھانو میاں کہاں ہیں۔''

پھول محمد کا گلا رندھ گیا۔ آہستہ سے بولا، ''لیٹے ہیں۔'' جمعدار صاحب ''اچھا'' کہہ کے پھر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر کہنے لگے، ''نہ بچہ نہ بچہ...... چھانو...... ابوالبرکات...... مت رو...... ہم تمھیں دوسری موتی منگا دیں گے...... ہاں...... نہیں...... وہی موتی۔''

دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ جمعدار صاحب چونک پڑے۔ چھانو! چھانو!'' مولوی نورالابصار کے کھنکارنے کی آواز آئی۔ بولے، یہ لے جاؤ۔ پھول محمد دروازے پر گیا دیکھا کھانا لائے ہیں۔''

کھانا رکھا رہا، کسی نے کھایا نہیں۔ جمعدار صاحب نے لیٹے لیٹے کہا، ''ابھی چھانو کی بولنے کی آواز آئی تھی۔ دیکھو تو بچہ کہاں ہے۔'' پھول محمد خاموش رہا۔ جمعدار صاحب ''چھانو چھانو'' کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔ کہنے لگے، ''بچہ چھانو میاں ابھی ہمیں پکار رہے تھے، تم نے بھی سنا تھا؟''

''ہاں چاچا۔''

پھول محمد کی آنکھ تین بجے رات کے قریب کھلی۔ جمعدار صاحب بچھونے پر نہ تھے۔ سمجھا پیشاب کے لیے باہر گئے ہوں گے۔ جب کچھ دیر تک وہ نہ آئے تو پھول محمد کو تشویش ہوئی۔ ادھر ادھر

ڈھونڈنے لگا۔ دیکھا کہ چھانو کی قبر کو سینے سے لگائے لیٹے ہوئے ہیں۔ پانی جھمر جھمر برس رہا ہے۔ تھوڑی دیر تک اس سے کچھ بولا نہ گیا۔ اس کی سانس رکنے لگی۔ بالآخر اس نے جی کڑا کر کے کہا، ''چاچا یہاں کیا لیتے ہیں، چلیے بچھونے پر۔'' اس نے اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جمعدار صاحب کھوئی کھوئی حالت میں بلا چون چرا کیے اٹھے اور ایک معصوم بچے کی طرح پھول محمد کی انگلی پکڑے پکڑے آئے اور چپ چاپ بچھونے پر لیٹ گئے۔

صبح صبح جمعدار صاحب نے پھول محمد سے کہا، ''بچہ دیکھو تو وہ تالاب کے کنارے کھجور کے پیڑ کے پیچھے چھانو میاں تو نہیں کھیل رہے ہیں، کہیں تالاب میں گر نہ جائیں۔ ہمیں ابھی صاف نظر آرہے تھے۔ ابھی ذرا دھندلا دھندلا ہو گیا ہے، جیسے سامنے پانی برس رہا ہو۔ دیکھو پانی تو نہیں برس رہا ہے کہیں بھیگ نہ جائیں، کہیں سردی نہ لگ جائے۔'' جمعدار صاحب خود اٹھ کے جانے لگے۔ پھول محمد نے دیکھا، باہر تو نہیں، مگر جمعدار صاحب کی آنکھوں سے ضرور جھڑی لگی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو امڈ امڈ کے بھرتے تھے اور بہتے جاتے تھے۔ ان آنسو بھری آنکھوں میں چھانو کی نقش بر آب تصویر بن بن کے مٹتی جاتی تھی اور مٹ مٹ کے بنتی جاتی تھی۔

جمعدار صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ یکا یک گھبرا کے اٹھ بیٹھے۔ بی بی جان کے پاس گئے۔ کہا، ''بی بی جان سنو، ارے تم رو رہی ہو۔ مت رو، مت رو۔ ابھی ہم نے دیکھا چھانو میاں ہماری طرف آرہے تھے۔ بیچ میں ندی آگئی۔ وہ پار نہ کر سکے۔ مولانا صاحب ہم سے کہنے لگے، یہ ندی تمھارے آنسوؤں کی ہے۔ اب ہم نہ روئیں گے تم بھی نہ رونا۔ نہیں تو چھانو میاں نہ آسکیں گے۔ یا اللہ ہمیں آنسو روکنے کی سکت دے۔''

۵

ڈاکیا پچاس روپے کا منی آرڈر لایا۔ مجید صاحب نے بھیجا تھا۔ جمعدار صاحب کے

چہرے پر بہت دنوں کے بعد ایک رونق سی پیدا ہوئی۔ بی بی جان سے جا کے کہا، وہ بھی ٹیک لگا کے بیٹھ گئیں۔ جمعدار صاحب بھی پاس بیٹھ گئے۔ کہنے لگے، ہمارا جی چاہتا ہے اس روپے سے ابوالبرکات کی قبر پکی کرا دیں۔ پھر سوچتے ہیں مولوی صاحب، نگن بابو، سرت ساہا، ابھے بابو کا قرض ادا کر دیں۔ ہم نے وعدہ کیا تھا۔ تم کیا کہتی ہو؟''

''پہلے قرض ادا کرو۔''

''ہاں ٹھیک کہتی ہو۔''

یہ کہہ جمعدار صاحب باہر گئے۔ سب کا قرض ادا کیا۔ ایک روپیا ہاجرہ کو دیا ایک پھول محمد کو اور آٹھ آنے گیدو کو۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ جمعدار صاحب کے پاس اتنی جلدی روپیا کہاں سے آ گیا۔ انھوں نے بتایا، پنیر میاں کو جب خبر ہوئی تو انھیں کچھ برا لگا۔ کچھ خوشی ہوئی، خوشی اس بات کی کہ انھیں ''موزید شاب'' کے خلاف ایک اور بات کہنے کو مل گئی۔

۶

بی بی جان نے اپنی ساری قوتِ ارادی چھانو کے مرنے کا غم برداشت کرنے میں صرف کر دی تھی۔ اب وہ تھک سی گئی تھیں۔ نہ محض ہاتھ، پاؤں، دماغ شل ہو رہے تھے، بلکہ روح میں بھی تھکن پیدا ہو گئی تھی جو ایک نامعلوم قسم کے بوجھ سے بوجھل ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے جسمانی زندگی کا بوجھ اب اٹھانا نہیں چاہتی جیسے جینا خود بوجھ بن گیا ہو۔ جمعدار صاحب کے پاس پندرہ روپے باقی تھے۔ انھوں نے ابھے بابو کو بلوایا۔ دوا منگوائی، کھانے کے لیے آش جو بھی لائے اور انار بھی جو ایک روپے کا ایک ملا۔ ماگر مچھلی کا بھی انتظام کیا۔ ماگر وہ جاندار مچھلی جو پانی کے باہر بھی زندہ رہ سکتی ہے، اس کے شوربے سے زیادہ مناسب غذا بی بی جان کے کمزور معدے اور اس سے زیادہ کمزور جسم کے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔ جمعدار صاحب نے دعائیں بھی رات بھر گڑگڑا گڑگڑا کر مانگیں، مگر بی بی جان کی تھکن بڑھتی ہی گئی۔ سانس بھی ستا ستا کے اور لڑکھڑا لڑکھڑا کے چلنے لگی۔ بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا کہ یہ

ستاتی اور لڑکھڑاتی چال بھی ختم ہو رہی ہے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر چلنے لگتی، جیسے ان کی جان کسی چیز میں اٹکی ہوئی ہے، اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ان کی نڈھال روح کو صرف یہ خیال سنبھال رہا تھا کہ اگر وہ نہ رہیں تو پھر جمعدار صاحب کو کون سنبھالے گا، ان کے لاشعور میں یہ احساس کارفرما تھا کہ جمعدار صاحب انھی کے سہارے چل رہے ہیں، اگر یہ سہارا بھی نہ رہا تو پھر اُن کا کیا ہوگا۔ یہی احساس بی بی جان کو مرنے نہ دیتا تھا، مگر وہ بڑے کرب کے عالم میں تھیں۔ اسے دیکھ کے جمعدار صاحب کا دل پاش پاش ہونے لگا۔ انھوں نے حسرت بھری نگاہ سے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک آہ کی۔ خود سے جا کے قرآن شریف اٹھا لائے، اور بی بی جان کے سرہانے بیٹھ کے آہستہ آہستہ سورۂ یٰسین پڑھنے لگے، بی بی جان کے کان میں آواز گئی۔ ان کی آنکھیں آہستہ آہستہ اِس طرح کھلیں جس طرح کلیاں پھول بنتی ہیں، جمعدار صاحب پر نظر جم گئی۔ چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور عین اس وقت جب دونوں وقت ملے ہیں جب تھکے ہوئے دن پر رات کے سیاہ پر آہستہ آہستہ پھیلنے لگتے ہیں۔ جب تھکی ماندی چڑیاں اپنے اپنے بسیروں میں آرام کرنے آتی ہیں، جب مؤذن اللہ اکبر اللہ اکبر — لا الٰہ الا اللہ کہہ کے آفتاب کے ڈوبنے کا اعلان کرتا ہے، عین اُس وقت بی بی جان کی تھکی ہوئی زندگی کے دن پر بھی بالآخر موت کی رات کا اندھیرا غالب آ گیا اور ان کی روح اپنے اصلی آشیانے کی طرف پرواز کر گئی۔ جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے چاروں طرف ایک دم سے اندھیرا گھپ ہو گیا ہے۔ جیسے ان کے پاؤں کے نیچے سے وہ چٹان ایسی زمین نکل گئی ہے جس پر وہ مضبوطی سے کھڑے تھے۔ جیسے وہ تحت الثریٰ کی تاریکیوں میں گرے جا رہے ہیں، جیسے یہ تاریکیاں انھیں نگلے جا رہی ہیں، اب انھیں خاموشی سے غم برداشت کرنا آ گیا تھا، ان کی زندگی ویران ہو گئی تھی، مگر اب وہ اس ویرانے پر آنسو کم برساتے۔ کہیں آنسو ندی بن کے بیچ میں حائل نہ ہو جائیں اور بی بی جان اور چھانو کو اُن کے پاس پہنچنے نہ دیں، اور ہاں بی بی جان چھانو کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ ان سے پہلے پہنچی تھیں۔ کیوں؟ کیا وہ چھانو کو ان سے زیادہ چاہتی تھیں۔ نہیں، تو اب وہ بھی شاید جلد ہی پہنچ جائیں اور اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں سے جا ملیں۔ بی بی جان کے پہنچ جانے سے چھانو خوش ہوگا۔ وہ اب تک

اکیلا تھا، بی بی جان اس کی دیکھ بھال کریں گی۔ جمعدار صاحب آنکھ بند کر کے اور دل پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گئے دیکھنے لگے کہ بی بی جان چھانو کو لپٹا کے پیار کر رہی ہیں، اور اُس کے آنسو پونچھ رہی ہیں۔ اگر مولوی نور الابصار کی آواز ''جمعدار صاحب، جمعدار صاحب'' ان کے کانوں میں آ کے انھیں جھنجھوڑ کے اُٹھا نہ دیتی تو وہ اسی طرح دیر تک دیکھا کرتے، بی بی جان کی تجہیز و تکفین میں وہی پہلا سا اہتمام ہوا۔ گورکنوں نے گہری قبر کھودی۔ سفید لنکلاٹ کا نیا نیا کفن آیا، گاؤں کے تمام لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔ چھانو کو اپنی قبر کی جگہ دینے کے بعد جمعدار صاحب نے سوچا تھا کہ اپنی قبر اس کے بغل میں رکھیں گے، لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا کہ بی بی جان کو چھانو کی بغل میں رہنے کا اُن سے زیادہ حق ہے۔ چنانچہ انھوں نے یہ جگہ بی بی جان کو دے دی۔

۷

بی بی جان کی تیمارداری اور تجہیز و تکفین میں قریب قریب سب روپیا ختم ہو گیا۔ صرف دو روپے بچے۔ یہ دو روپے بھی کے دن چلتے۔ پھول محمد کا بھی ایک روپیا ختم ہو گیا۔ ہاجرہ کا بھی، پھر فاقے شروع ہو گئے۔ جمعدار صاحب کے ہاتھ پاؤں، منہ پر بھی سوجن نمایاں ہونے لگی۔ پھول محمد، ہاجرہ اور گیدو کے ہاتھ، پاؤں منہ تو پہلے ہی سے سوجے ہوئے تھے۔

ہاجرہ نے جمعدار صاحب سے آ کر کہا، ''سنا ہے سرکار نے لنگر خانہ کھولا ہے سب لوگ وہیں جا رہے ہیں۔''

جمعدار صاحب کو لنگر خانے جانے کے خیال سے بڑی تکلیف ہوئی۔ ان کے چہرے سے یہ تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔ ہاجرہ نے کہا، ''چاچا اب یہاں کیا رکھا ہے؟ چلیں نا، یہاں بھوکوں مرنے سے فائدہ؟ پھول محمد نے دیکھا کہ ہاجرہ کو خبر نہیں کہ جمعدار صاحب کے دل پر کیا گزر رہی ہے، اس نے کہا، ''تم سمجھ نہیں رہی ہو، جاؤ بیٹھو۔''

۸

جمعدار صاحب کے دل کو ہاجرہ کی بات لگی۔ سوچنے لگے، میری وجہ سے ہاجرہ گیدو کیوں

مریں؟ اور ہاں پھول محمد بھی کیوں۔ انھوں نے ہاجرہ سے کہا، ''سنو ہم لنگر خانے نہیں جا سکتے۔ کیسے جائیں، چھانو کو چھوڑ کے، بی بی جان کو چھوڑ کے، باپ جان کو چھوڑ کے۔ تم گیدو کو لے کے چلی جاؤ۔ ہماری وجہ سے کیوں تکلیف اٹھاؤ۔ پھول محمد میاں ہماری جگہ تمھارے ساتھ ساتھ جائیں گے۔''

پھول محمد نے کہا، ''چاچا ہم اپ کو چھوڑ کے کبھی نہیں جائیں گے۔''

جمعدار صاحب، ''دیکھو، ناسمجھی کی بات نہ کرو۔ چلے جاؤ۔''

''نہیں چاچا ہم نے کہہ دیا، ہم نہیں جائیں گے۔''

ہاجرہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، ''ہم اکیلے کیسے جائیں گے!''

جمعدار صاحب کو محسوس ہوا کہ بات تو معقول کہہ رہی ہے اور اسے حق بھی ہے کہنے کا، آج چاند شیخ زندہ ہوتا تو اس کی یہ نوبت کاہے کو آتی۔''

جمعدار صاحب احساس ذمے داری سے لرز گئے۔ سوچنے لگے اور بولے، ''اچھا ذرا سوچنے دو۔''

☯......☯......☯

گیارھواں باب

جمعدار صاحب کا قافلہ جارہا تھا، سوا تین آدمیوں کا قافلہ تھا۔ جمعدار صاحب، پھول محمد، ہاجرہ اور گیدو، سب کے ہاتھ پاؤں اور منہ سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں دھنسی ہوئیں۔ گال بیٹھے ہوئے، پیٹ پچکے ہوئے، پسلیاں نکلی ہوئیں۔ یہ قافلہ چل نہیں رہا تھا، رینگ رہا تھا، جس طرح دوپہر کو سوکھے ہوئے درختوں کا سایہ رینگتا ہے، اور بھی چھوٹے بڑے قافلے رینگ رہے تھے۔ سب ایک ہی طرف، لنگر خانے کی طرف گرتے پڑتے بھیک مانگتے ہوئے، جھوٹے کھانے کی بھیک، ترکاری کے چھلکوں کی بھیک، چاول کی پیچ کی بھیک، پیسے کی بھیک، کوئی دھتکار پاتا اور کوئی دھتکار سے بھی زیادہ بری چیز.... بھیک۔ جمعدار صاحب بھی انھی کے ساتھ جارہے تھے۔ راستہ بھی ایک، منزل مقصود بھی ایک، کیا ان میں اور ان لوگوں میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا، جمعدار صاحب کے دل میں اس احساس سے ایک ٹھیس لگی۔ نہیں کوئی نہ کوئی فرق ضرور تھا، مگر کیا تھا؟ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ انھوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر سر جھکا لیا۔

۲

جمعدار صاحب کا قافلہ رینگتے رینگتے ایک پکی دیواروں اور ٹین کی چھت والے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ پھول محمد نے دیکھا اس مکان کے سامنے مینا ننگی دھڑنگی بیٹھی ہوئی رورہی ہے اس نے کہا، "چاچا یہ تو مینا ہے، یہاں کیسے آئی، بڑے چاچا بھی شاید یہیں ہوں۔"

جمعدار صاحب مکان کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھول محمد، مینا کو چمکارنے لگا۔ مینا تھوڑی جھجکی، پھر اس نے پھول محمد کو پہچان لیا۔ اپنے سوکھے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ ان اٹھے ہوئے ہاتھوں میں بڑی التجا تھی۔ باوجودیکہ پھول محمد اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اسے اپنے ہڈی ہڈی ڈھانچے کا

بوجھ سنبھالنا بھی مشکل ہوا جارہا تھا، لیکن پھر اُس نے مینا کو گود میں اُٹھالیا۔

پکی دیواروں اور ٹین کی چھت والے مکان سے ایک موٹا تازہ دس گیارہ برس کا شیطان قسم کا لونڈا برآمد ہوا۔ اُس نے پھول محمد سے کہا، ''اے کوچی کو کہاں لیے جارہے ہو؟''

پھول محمد نے کہا، ''یہ مینا ہے، ہمارے پچا کی بیٹی، اسے بلا کے ابھی پوچھ لو۔''

لونڈے نے کہا، ''یہ مینا نہیں ہے کوچی ہے۔''

''اس کا باپ کہاں ہے بتاؤ ہم پہچا دیں۔''

''ہم اس کے باپ کو نہیں جانتے۔''

''کیا ہوا، یہ یہاں کیسے آئی۔''

''تم سے مطلب، ایک آدمی ہمارے ابا کے ہاتھ بیچ گیا، بھاگو یہاں سے نہیں تو ہم ابھی چلاتے ہیں۔''

پھول محمد نے کہا، ''جھوٹ بات، بالکل جھوٹ بات۔''

جمعدار صاحب نے بھی کہا، ''ہاں ایسا نہیں ہوسکتا، بھلا کوئی اپنا بچہ بھی بیچ سکتا ہے؟ توبہ توبہ۔''

جمعدار صاحب کو چھانو کا خیال آگیا اور منہ سے ایک آہ نکل کے رہ گئی۔ لونڈے نے ایک ڈھیلا اٹھایا۔ پھول محمد نے بھی زمین پر مینا کو بٹھا کے ایک ڈھیلا اٹھالیا۔ لونڈے نے ڈھیلا مارا، پھول محمد کے ماتھے میں لگا۔ خون بہنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے ڈھیلا گر پڑا اور وہ خود دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہوگیا۔ آنکھیں بند کیے لونڈا ڈر کے مارے بھاگ گیا کہ کہیں جمعدار صاحب اُس کی مرمت نہ کریں، ممکن ہے اس کا باپ بھی ٹھونکائی کرے جمعدار صاحب نے مینا کو گود میں اٹھالیا۔ اس وقت کوئی اور روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ موقع غنیمت تھا، پھول محمد اسی حالت میں چل پڑا۔ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ ماتھے سے بہتا ہوا خون پونچھتا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر تک یہ لوگ جتنا چل سکتے تھے چلے، شاہراہ سے پگڈنڈی پر ہولیے، اس کے کنارے گھنی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ایک گھنی جھاڑی کے سائے میں بیٹھ

گئے، جیسے چوری کی ہو، ڈاکا ڈالا ہو۔

۳

جمعدار صاحب کا قافلہ پھر رینگ رہا تھا، ہاجرہ لوگوں کے بھیگ مانگنے کو بار بار دیکھ رہی تھی، اس نے آج تک بھیک نہ مانگی تھی۔ اسے بھیک مانگنا نہ آتا تھا، اس کا پیٹ جل رہا تھا۔ گیدو روئے جا رہا تھا۔ ہاجرہ کے ہاتھ خود بخود اٹھنے لگے۔ تھوڑا تھوڑا سا اُٹھ اُٹھ کے گر گر پڑتے، جیسے وہ بھیک مانگنے کا ریہرسل کر رہی ہو۔ اس نے سوچا چاچا سے کہنے سے کوئی فائدہ نہیں، وہ کبھی راضی نہ ہوں گے۔ ان کے دل کو تکلیف الگ ہوگی۔ اُس نے چاہا پیچھے رہ جائے، بجائے چلنے کے کھڑی ہوگئی۔ جمعدار صاحب ذرا آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے پلٹ کے دیکھا ہاجرہ کھڑی ہے۔ کہا، ''اچھا ستالو، ہم سے بھی چلا نہیں جاتا۔'' جمعدار صاحب بیٹھ گئے۔ ہاجرہ بھی بیٹھ گئی۔ ہاجرہ نے دیکھا یہ تو بری مشکل ہوئی۔ اس نے پھول محمد کو اپنا راز دار بنایا اور چپکے سے اسے بتایا، پھول محمد سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، ''ہاں چاچا سے نہ کہنا۔ اچھا، آزمالو۔'' ہاجرہ نے کہا، ''مگر چاچا؟'' پھول محمد نے جواب دیا، ''ہم ٹھیک کرلیں گے۔'' تھوڑی دیر میں قافلہ پھر رینگنے لگا، رینگتے رینگتے ایک بستی تک پہنچا۔ پھول محمد نے کہا، ''چاچا ذرا استالیں۔'' سب بیٹھ گئے۔ پھول محمد نے کہا، ''بڑی پیاس لگی ہے، ہم ذرا پانی پی آئیں؟'' ہاجرہ نے کہا، ''گیدو بھی بہت پیاسا ہے، چلو ہم بھی چلتے ہیں۔'' جمعدار صاحب نے کہا، ''پیاس تو ہمیں بھی لگی ہے، خیر جاؤ۔'' پھول محمد، ''ہم آپ کے لیے پانی لے آئیں گے۔''

ایک کچی دیوار اور ٹین کی چھت والے مکان کے سامنے ہاجرہ کھڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر پھول محمد کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ایک شخص خاکی رنگ کا بش کوٹ اور نکر پہنے ہوئے مکان سے نکلا۔ پھول محمد نے دیکھ کے کہا، ''ملٹری۔'' ہاجرہ کا چہرہ آدھا کھلا آدھا ڈھکا تھا۔ فاقے کا مارا ہونق چہرہ صاف نظر نہ

آتا تھا۔ کم سنی البتہ تھوڑی جھلک رہی تھی۔ اس شخص نے ذرا توجہ سے دیکھا اور مسکرا کے اس کے آدھے اُٹھے ہوئے ہاتھ میں ایک روپیا رکھ دیا۔ ہاجرہ چونک پڑی۔ اس کی نظر اس شخص کی مسکراتی ہوئی معنی خیز نظروں پر پڑی۔ ہاجرہ کو محسوس ہوا اس کے ہاتھ میں روپیا نہیں، انگارہ ہے جو چپ سے چپک کے رہ گیا ہے۔ نہ اسے پھینکتے بنتا تھا نہ رکھتے۔ بالآخر اس نے ہاتھ جھٹک کے یہ انگارہ پھینک ہی دیا، اور وہاں سے تیز تیز قدم بڑھائے لوٹی۔ پھول محمد نے پوچھا، ''کیا ہوا؟'' اُس نے کہا، ''کچھ نہیں حرامزاد چلو چاچا کے پاس۔'' دونوں چاچا کے پاس پہنچ گئے۔ چاچا نے کہا، ''پانی لائے؟''

پھول محمد، ''بھول گئے، ابھی لاتے ہیں۔''

''اب رہنے دو۔''

''نہیں چاچا۔'' کہہ کے پھول محمد چلا گیا، وہ شخص دیکھتا رہا۔ جہاں یہ لوگ بیٹھے تھے۔ وہاں آ کے اُس نے ہیرے پھیرے شروع کر دیے۔ پھر جمعدار صاحب کے پاس آ کے انھیں علیحدہ لے گیا ایک روپیا ان کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولا، ''یہ لو رات کو تم ہمارے برآمدے میں سونا، یہاں جھاڑی میں کتے سیار کا ڈر ہے۔ اپنی بیوی ہمارے گھر بھیج دینا۔ ذرا ہمارے پاؤں دبا دے گی۔'' جمعدار صاحب کا چراغِ زندگی جو معلوم ہوتا تھا، اب بجھا، تب بجھا، ایک بھڑک اٹھا۔ طاقتور کا غصہ تو خیر برا ہوتا ہی ہے، لیکن جب کسی بے بس اور بے کس کی غیرت جوش میں آ کے غصے کی صورت اختیار کرتی ہے، تو اس غصے کا کیا ٹھکانا۔ جیسے ایٹم کے سے ذرۂ بے مقدار کا غصہ۔ جمعدار صاحب نے دانت پیس کر کہا، ''حرام زاد۔'' اور اُن کی آنکھوں سے نتھنوں سے سانس سے زہریلی شعاعیں نکلنے لگیں۔ اُس شخص کا دم گھٹنے لگا۔ خود بخود اباؤٹ ٹرن ہو گیا۔ جمعدار صاحب نے لپک کے اس کے بش کوٹ کو جھٹکا دیا۔ چر سے پھٹ گیا اور ''ملٹری'' بھاگ نکلا۔ ہاجرہ نے اس کی طرف دیکھ کر تھوک دیا۔

۴

جمعدار صاحب کے قافلے سے اب تو رینگتے بھی نہیں بن پڑتا تھا۔ رات رینگتی آ رہی تھی،

مگر وہ لنگر خانہ؟ وہ اب بھی لاپتا تھا۔ اس کی جستجو میں تھک تھک کے رہ جانے والے پہلے ہر مقام پر دو چار نظر آتے تھے، مگر اب تو یہ عالم تھا کہ جیسے قبروں نے بے شمار لاشیں اُگل دی ہیں، سوکھی ساکھی لاشیں، سڑی گلی لاشیں، کچھ سانس بھی لے رہی تھیں۔ رینگ رہی تھیں، سسک رہی تھیں۔ جمعدار صاحب کبھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے، کبھی آنکھیں بند کر لیتے، قیامت کے دن بھی تو قبریں مردے اگلیں گی، قیامت بھی اسی طرح کی ہوگی۔ کہیں یہی قیامت نہ ہو۔ ایسی لاشوں کی تعداد بھی بڑھتی جارہی تھی۔ جن کا رینگنا سسکنا اور سانس لینا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا تھا۔ کسی کی آنکھیں کوا کھا گیا ہے، یا کھائے لے رہا ہے۔ کسی کے گال گیدڑ نوچ لے گیا ہے یا نوچے لیے جارہا ہے۔ کسی کے پاؤں کا گوشت غائب ہے، کسی کا پیٹ پھٹا ہوا، کسی پر گدھ کچھ اس طرح سے چھاپا مارے ہوئے ہیں کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کیا گیا کیا رہا۔ قیامت میں تو مردوں کا یہ حال نہ ہوگا۔ سب کا بدن صحیح سالم ہوگا، نہیں یہ قیامت نہیں، کوئی اس سے بھی بری چیز ہے۔ جمعدار صاحب کو چکر آرہا تھا، مگر پہلے ہاجری گری، پھر جمعدار صاحب کا پورا قافلہ گر پڑا۔ ان ہی لاشوں کے درمیان۔ آنکھیں سب بند کیے تھے، ناک بند کرنے کی کسی کو ضرورت نہ تھی، ناک عادی ہو چکی تھی، لنگر خانہ نہ آئے گا کیا؟ لنگر خانہ سے پہلے موت بھی تو آجایا کرتی ہے۔ آخراتنوں کو تو آہی گئی تھی، وہی آجاتی، جھگڑا ختم ہوتا، مگر وہ بھی نہیں آرہی تھی۔ شاید آتی ہو۔ ہاجرہ نے کہا، ''چاچا — اب — اور کتنی — دور — ہے۔'' جمعدار صاحب ''اب قریب ہی ہے بچہ، رات ہو رہی ہے، نہیں تو ہم لوگ آج ہی پہنچ جاتے۔'' ہاجرہ، ''مگر چاچا اب ہم سے تو نہ چلا جائے گا۔'' یہ کہتے کہتے وہ لیٹ گئی۔ اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ وہ تہمد بچھا کے لیٹتی، وہی چاند تیخ والی تہمد جسے وہ سوتے جاگتے اپنے سے جدا نہ کرتی تھی اور جو کثرتِ استعمال سے پھٹ گئی تھی۔ اُس نے تہمد اپنے سینے سے لگالی۔

جمعدار صاحب، ''نہیں بچہ ہم لوگ جلدی سے پہنچ جائیں گے۔''

پھول محمد آنکھیں کھولے کچھ دور افق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا، ''دیکھیے چاچا وہاں کتنے گدھ اڑ رہے ہیں اور اس پیڑ پر کتنے بیٹھے ہیں، پیڑ بالکل کالا ہوگیا ہے۔ چاچا — ہم سمجھتے ہیں —

وہیں لنگر خانہ ہے، ایک آدمی نے ہمیں یہی پتا بتایا تھا۔'' جمعدار صاحب نے دیکھا دو تین فرلانگ پر گدھ منڈلا منڈلا کے اونچے اونچے درختوں پر آ آ کے بیٹھ رہے ہیں۔ جمعدار صاحب کا دل سہم گیا، مگر ہاجرہ کی طرف مخاطب ہو کے بولے، ''دیکھو پھول محمد میاں بھی کہہ رہے ہیں کہ لنگر خانہ قریب ہے۔''

ہاجرہ کے ہونٹوں سے ایک آواز نکلی۔ نہ معلوم ''اچھا'' کہہ رہی تھی یا ٹھنڈی سانس بھر رہی تھی۔

علی الصبح گیدو حسب معمول ہاجرہ کے دودھ میں چمٹا ہوا تھا اور اس سوکھے ہوئے دودھ کو چوس چوس کے روئے جارہا تھا۔ پھول محمد نے کہا، ''ارے بھائی چپ کراؤ۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''بہت تھک گئی ہے۔ بچہ اسے سونے دو۔''

پھول محمد، ''چاچا گیدو کب سے روئے چلا جارہا ہے۔''

''وہ بھی تو بھوکا ہے، روئے نہ؟ ہاجرہ اٹھ کے بھی کیا کرلے گی، اسے کیسے چپ کرائے گی، فضول اس کی بھی نیند خراب ہوگی۔ بڑی مشکل سے تو گہری نیند سوئی ہے۔''

پھول محمد خاموش ہو رہا اور گیدو کا رونا بڑھتا ہی گیا، جمعدار صاحب کو بھی تکلیف ہونے لگی۔ بولے، ''بچہ تم ہی گیدو کو بہلالو۔ اچھا ہمیں اٹھا دو۔''

پھول محمد گیدو کو اٹھانے لگا۔ گیدو مچل گیا۔ پھول محمد کی نظر یکایک ہاجرہ کے چہرے پر پڑی۔ وہ گھبرا گیا۔ آہستہ سے بولا، ''چاچا ذرا دیکھیے تو۔'' جمعدار صاحب میں بھی اٹھنے کی سکت کم تھی۔ اتنی بات کر کے اور تھک گئے تھے، کمزور آواز میں بولے، ''کیا ہے بچہ؟''

''ارے چاچا ہم نہیں کہہ سکتے، آپ دیکھ لیجیے۔''

جمعدار صاحب مشکل سے اٹھے۔ ہاجرہ کے قریب گئے۔ دیکھ کے پھول محمد سے بولے، ''بچہ ہاجرہ کو چھوؤ تو۔'' وہ خود غیر عورت کو ہاتھ لگانا نہ چاہتے تھے۔ پھول محمد نے ہاجرہ کا ہاتھ ہلا کے کہا،

''ارے اٹھو، صبح ہوگئی۔ کب تک سوؤ گی۔ گیدو بہت رو رہا ہے۔'' ہاجرہ نہ اٹھی۔ جمعدار صاحب نے بڑی حسرت سے کہا،'' اب نہ اٹھے گی، گیدو کو اٹھالو۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون اور آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ کوے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ کھیل کود رہے تھے، چیلیں چلھور بھر رہی تھیں، گدھ منڈلا رہے تھے، اور ہاں آس پاس کی جھاڑیوں میں پھول بھی کھل رہے تھے اور پھل سنگیاں بھی اڑ رہی تھیں، شبنم کے قطرے اپنی چونچوں میں بھر بھر کے اپنے گھونسلوں میں آ جا رہی تھیں، اپنے بچوں کو کھلاتے اور بچے اپنے بے پر کے ڈیبنے پھٹ پھٹا پھٹ پھٹا کے منہ کھول دیتے تھے۔ ان آبِ حیات کے قطروں کو پینے کے لیے، ہاجرہ کا جسم شبنم کا قطرہ تو تھا نہیں جسے پھل سنگیاں پیتیں یا اپنے بچوں کو پلاتیں۔ چیل کوے البتہ کھانے پر تیار نظر آ رہے تھے۔ جب اسے کسی کی غذا بننا ہی تھا تو چاہے آسمان کے نیچے چیل کووں کی بنے چاہے زمین کے نیچے کیڑے مکوڑوں کی، اس میں فرق ہی کیا تھا، مگر پھر بھی جمعدار صاحب کے ڈوبتے ہوئے دل نے کوئی نہ کوئی فرق ضرور محسوس کیا۔ انھوں نے چاہا کہ ہاجرہ کو دفن کر دیں، مگر کیسے کریں، قبر کھودنے کی سکت کسے تھی۔ قریب ہی ایک گڈھا نظر آیا یا شاید کسی راہ چلتے کی بیٹھی ہوئی قبر تھی۔ جمعدار صاحب اور پھول محمد نے ہاجرہ کو اسی میں لٹا دیا۔ وہ اپنی مٹھی میں اب بھی چاند شیخ کی تہمد پکڑے ہوئے تھی۔ ان کی مردہ انگلیوں نے مشکل سے تہمد چھوڑی۔ جمعدار صاحب نے وہی تہمد اسے اڑھا دی اور اس پر ایک مٹی کی چادر بھی چڑھا دی۔ معلوم نہیں انھیں ایسی قبر بھی ملے یا نہیں، کووں چیلوں اور گدھوں کی طرف ان کی نظر بے اختیار اٹھ گئی اور وہ اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ سے اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں بیٹھے ہوئے گال اور ابھرے ہوئے گلے کو آہستہ آہستہ سہلانے لگے۔ ان کا حلق سوکھنے لگا اور وہ اپنا گلا پکڑ کے بیٹھ گئے۔

۵

جمعدار صاحب کا بچا کھچا قافلہ پھر رینگ رہا تھا۔ گیدو، جمعدار صاحب کی گود میں تھا اور مینا پھول محمد کی گود میں۔ قریب سو گز کے فاصلے پر کھچڑی بٹ رہی تھی، مگر اس سو گز کے فاصلے میں ہزاروں

بھو کے پیٹوں کا فاصلہ بھی تھا جو کھچڑی اور جمعدار صاحب کے درمیان حائل تھا۔ جمعدار صاحب حسرت سے تکنے لگے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا وہیں بیٹھ جائیں۔ ان کی یہ خواہش دو خاندانی قسم کے فقیروں نے آ کر پوری کر دی۔ ایسا دھکا مارا کہ جمعدار صاحب بے چارے گر پڑے۔ پھول محمد نے دیکھا ایک بھیڑ پیچھے سے چلی آ رہی ہے، اسی میں کچھ جان دینے والے فقیر بھی ہیں، کچھ جان لینے والے فقیر بھی، فقیری میں امیر کرنے والے فقیر۔ وہ جنھوں نے جمعدار صاحب کو دھکا دے کر گرا دیا تھا، جمعدار ساحب کہیں اس بھیڑ میں کچل نہ جائیں۔ اس نے کہا، ''چاچا اِدھر آ جایئے۔'' گیدوا اور مینا کو تو اس نے اٹھا کے ایک طرف بٹھا دیا اور جمعدار صاحب کو سہارا دینے لگا۔ بڑی مشکل سے دونوں گرتے پڑتے ایک طرف ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مٹی کی ڈھیریاں رینگ رہی ہوں۔ اس کوشش میں دونوں کی بچی کھچی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ جمعدار صاحب پڑ گئے۔ پھول محمد سے بیٹھتے نہیں بن رہا تھا، لیکن اگر وہ لیٹ گیا تو معلوم نہیں کیا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا جا رہا تھا، کسی نہ کسی طرح وہ اپنے کو گھسیٹ کر ایک درخت کے پاس لے گیا اور اس کے تنے میں پیٹ لگا کے بیٹھ گیا۔ جمعدار صاحب پر اس نے اپنی نظریں جمائے رکھیں جو دس گز کے فاصلے پر پڑے ہوئے تھے، جیسے ان کی نگرانی کر رہا ہو۔ پانی برسنے لگا، مگر بھو کے لوگ کھڑے رہے۔ پڑے رہے اور بھیگتے رہے۔ جمعدار صاحب بھی بھیگتے رہے اور پھول محمد بھی۔ دونوں کی آنکھوں کے گلابی کٹورے لبریز تھے۔ معلوم نہیں ان آنسوؤں سے جو آسمان سے برس رہے تھے یا ان آنسوؤں سے جن سے اب تک یہ بھرتے اور خالی ہوتے رہے تھے۔ آسمان کا قدح تو تھوڑی دیر میں خالی ہو گیا، مگر یہ کٹورے بھرے رہے۔

چند آٹھ دس برس کے لونڈے آئے۔ کچھ خود قحط زدہ تھے۔ ہاتھوں میں برتن لیے کھچڑی لانے جا رہے تھے۔ کچھ محض تماشا دیکھنے نکلے تھے۔ جمعدار صاحب کو دیکھ کے بولے، ''بڈھا مر گیا۔'' ایک لونڈے نے بانس کی پتلی چھڑی سے جمعدار صاحب کو گودا۔ پھول محمد کے کچھ ہونٹ ہلے جیسے کہہ

رہا ہے، اے کیا کر رہے ہو۔ جانتے ہیں چاچا ہیں — جمعدار صاحب۔" ایک لونڈا پاس بیٹھ کے جمعدار صاحب کی کھلی ہوئی آنکھوں میں تنکا گھسیڑنے لگا۔ جمعدار صاحب کی پلک ذرا سی جھپکی اور کچھ قطرے ٹپک گئے۔

لونڈا اچلایا، "ارے بڈھا ابھی تک مرا نہیں۔"

دوسرے نے کہا، "نہیں مر گیا۔"

پہلا بولا، "نہیں مرا، یہ دیکھو نا۔"

دوسرے لونڈے نے بھی آنکھ میں تنکا گھسیڑا، پلکیں پھر ہلیں، قطرے پھر ٹپکے پہلے لونڈے نے تالی بجائی۔ "دیکھا کہیں بڈھا مرا ہے؟ ہم کہتے تھے نا؟"

ایک لونڈے نے کہا، "آؤ بڈھے کے مرنے کا تماشا دیکھیں۔"

دوسرے چلائے، "ہاں جی ہاں۔"

ایک اور لونڈے کی آواز آئی، "ارے یہ دیکھو یہ لونڈا کیسا بیٹھا ہوا ہے، پیڑ میں ٹیک لگائے۔ کچھ بولتا نہیں، بس دیکھے جا رہا ہے۔"

کچھ لونڈے ادھر گئے۔ لونڈوں کی رائے ہوئی۔ پھول محمد کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر ڈولی ڈولی کھیلیں۔ ہاتھ پاؤں پکڑنے ہی کو تھے کہ لانچ کے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ لونڈے "نالج نالج، موزید شاب جندہ باد" چیختے ہوئے لانچ کی طرف دوڑے۔ پھول محمد کے ہونٹ ہلے، جیسے وہ بھی "نالج نالج" کہہ رہا ہو۔

"موزید شاب جندہ باد" کا شور قریب آ رہا تھا۔ صاحب کے چہرے سے غم وغصہ ٹپک رہا تھا۔ جگہ جگہ پر رک رہے تھے، بگڑ رہے تھے۔ جہاں جہاں لوگ پڑے ہوئے نظر آتے گرے ہوئے یا مرتے ہوئے وہاں وہاں وہ رک جاتے، لوگ جھک جھک کے مرے ہوؤں کو اٹھانے لگتے۔ خلاصیوں کے ہاتھ میں دودھ کی بوتلیں تھیں اور کمبل، زندوں کو دودھ پلا کے کمبل میں اٹھایا جاتا۔ مردوں کو الگ لے جانے لگتے، مگر ادھر صاحب آگے بڑھے ادھر لوگ اُن کے پیچھے ہو لیے۔ ابھی صاحب تھوڑی دور

ہی تھے کہ کچھ لوگ جمعدار صاحب کی طرف لپکے تاکہ انھیں گھسیٹ کے پاس کے نالے میں ڈال دیں، صاحب کی نظر پڑنے سے پہلے، ایک نے ہاتھ پکڑا ایک نے پاؤں، اٹھا ہی رہے تھے کہ صاحب آ گئے۔ دیکھی دیکھی سی صورت معلوم ہوئی، صاحب نے کہا، ''ٹھہرو۔'' لوگوں نے چھوڑ دیا۔ صاحب غور سے دیکھا، کہاں یہ صورت دیکھی تھی جمعدار صاحب؟ کہیں یہ جمعدار صاحب تو نہیں، مگر نہیں جمعدار صاحب نہیں ہو سکتے، ابھی اس دن تو انھیں روپیا گیا تھا اور وہ بھلا لنگر خانے آئیں گے؟ صاحب نے پوچھا، ''یہ کون آدمی ہے؟'' لوگوں نے کہا، ''معلوم نہیں، صاحب، کوئی فقیر ہے۔''

''کوئی پہچانتا نہیں؟''

''نہیں صاحب۔''

صاحب کی نظر پیڑ سے ٹیک لگائے ہوئے پھول محمد پر بھی پڑی۔ اب تو انھیں شبہ ہونے لگا۔ یہ لڑکا بھی پھول محمد کا بگڑا ہوا نقشہ معلوم ہوتا تھا۔ انھوں نے غور سے دیکھا، سارنگ صاحب نے بھی دیکھا، کہا، ''حضور یہ تو وہ لونڈا ہے۔ وہی شیطان لونڈا۔'' صاحب کے منہ سے بھی ہاں نکلی، جمعدار صاحب کے پاس جلدی سے جا کے انھوں نے آنکھ چھوئی، پلکیں جھپکیں اور ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ صاحب نے کہا، ''زندہ ہیں زندہ، آہستہ سے اٹھاؤ۔'' منہ میں دودھ کے چند قطرے ٹپکائے کمبل اڑھایا اور اسٹریچر پر انھیں لانچ میں پہنچا دیا۔

پھول محمد کے پاس گئے، اسے ہلایا ڈلایا، مگر اسے جنبش نہ ہوئی، آنکھ کے پاس انگلی لے گئے، مگر آنکھیں تکتی ہی رہ گئیں۔ ڈریں نہیں، جھپکیں نہیں، صاحب تھوڑی دیر تک دم بخود کھڑے رہے، اُن کی آنکھوں کے سامنے پھول محمد کی دوڑتی پھرتی، شرارت کرتی تصویر گھومنے لگی۔ صاحب نے پھول محمد کی آنکھیں بند کر دیں، سارنگ صاحب نے پھول محمد کے سر پر ہاتھ پھیر کے کہا، ''بچہ معاف کرنا..... انا للہ و انا الیہ راجعون۔''

مجید صاحب نے پھول محمد کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا۔ نئے لٹھے کا سفید سفید کفن منگوایا۔ سارنگ صاحب نے کہا، ''حضور اسے ناچ کا بڑا شوق تھا، حضور کا حکم ہو تو اسے ناچ میں جا کے

غسل دیں۔'' صاحب نے آہستہ سے کہا، ''ہاں ضرور۔'' اور اپنے جذبات کا پردہ رکھنے کے لیے منہ پھیرلیا۔ پھول محمد کو 'ناچ' میں غسل دیا گیا۔ نمازِ جنازہ ہوئی۔ سارنگ صاحب نے نماز پڑھائی۔ صاحب بھی شریکِ نماز تھے۔ یہ دیکھ کے سینکڑوں لوگ نمازِ جنازہ میں شریک ہوگئے۔ لوگوں کو بڑا تعجب تھا کہ یہ کون لونڈا ہے اور اس میں کون سی ایسی خاص بات تھی جو صاحب اتنا اہتمام کر رہے ہیں، پھول محمد کے جنازے کی نماز کے بعد صاحب کو خیال آیا کہ اور بھی بہت سے مردے پڑے ہیں، انھوں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھی جائے۔ بقیہ سب کے لیے ایک علیحدہ نماز پڑھی گئی۔ پھول محمد کی قبر گہری کھودی گئی۔ سارنگ صاحب نے آس پاس کے درختوں سے کچھ پھول توڑ کر پھول محمد کی قبر پر چڑھا دیے۔ ایک درخت کی ڈالیوں میں کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ ان مسکراتی ہوئیں کلیوں کی ایک ڈالی مجید صاحب نے توڑ کے پھول محمد کی قبر میں لگا دی۔ کلیاں اب بھی مسکرا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اٹھکیلیاں کرتی ہوئی کلیوں سے کھیل رہی تھی، کلیاں جھوم رہی تھیں۔ ڈالی جھوم رہی تھی۔ صاحب دیر تک دم بخود دیکھتے رہے۔ اتنے دم بخود کہ انھیں یہ بھی پتا نہ چلا کہ وہ مسکراتی ہوئی کلیوں کی ڈالی جسے انھوں نے پھول محمد کی قبر پر لگایا تھا ہوا کے ایک جھونکے سے گر چکی ہے۔

بارھواں باب

مجید صاحب نے لنگر خانے کھولنے کے احکام جلدی جلدی جاری کر دیے تھے۔ اب وہ ان لنگر خانوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ جمعدار صاحب کی حالت اور پھول محمد کی موت نے انھیں چونکا دیا۔ لنگر خانوں کی افراتفری دیکھ کے وہ سوچ میں پڑ گئے۔ قحط نے نہ محض لوگوں کے جسم مسک کر دیے تھے، بلکہ ان کے اخلاق بھی، کردار بھی، روحیں بھی۔ لنگر خانوں کی تنظیم میں بدنظمی اور بے ایمانی کی بڑی گنجائش تھی۔ لنگر خانوں سے قحط زدوں کی مصیبتیں کم نہیں ہو رہی تھیں، بلکہ بڑھ رہی تھیں، بہتوں کو تو کھچڑی ملتی ہی نہ تھی اور جنھیں ملتی بھی تھی ان میں سے اکثر کے معدے فاقہ کرتے کرتے اتنے سوکھ گئے تھے کہ اس کھچڑی کا بوجھ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ غریبوں کو بچانے کے لیے کسی اور انتظام کی ضرورت تھی۔ ڈاکٹروں سے مشورے کے بعد انھوں نے احکام جاری کیے، لنگر خانے آسمان کی چھت کے نیچے سے ہٹا کے ایسی جگہ قائم کیے گئے جہاں قحط زدوں کے سر پر کوئی اور چھت بھی ہو، جس کے سائے میں وہ دھوپ اور پانی سے محفوظ رہ سکیں۔ لنگر خانوں میں رضا کاروں کا ایک ایک دستہ بھی مقرر کیا گیا، جن کے پاس کچھ دودھ، کچھ گلوکوز کا شربت، کچھ مقوی دوائیں موجود رہتی تھیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ لنگر خانوں کے اردگرد گھوم کے دیکھیں، جن لوگوں کو گرا پڑا پائیں، انھیں پہلے طاقت کی چیزیں پلائیں۔ پھر انھیں اسپتال پہنچا دیں۔ اس کام کے لیے اسکول کالجوں کی عمارتیں سب سے زیادہ موزوں تھیں۔ اسکول کالج یوں ہی بند بند سے ہو رہے تھے۔ اب وہاں باضابطہ چھٹیاں کر دی گئیں، اور یہ عمارتیں غریب خانہ بن گئیں۔ تکلفاً غریب خانہ نہیں، بلکہ واقعی غریب خانہ جہاں امیر نہیں غریب سچ مچ کے غریب رہتے تھے۔

۲

مجید صاحب لیدو اور مینا کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ضلع کے اسپتال میں جمعدار صاحب کو داخل کر دیا۔ دن میں ایک دفعہ دیکھنے جاتے۔ ڈاکٹروں نے بڑی توجہ سے علاج کیا۔ جمعدار صاحب کے قریب قریب مردہ جسم میں پھر سے جان واپس آنے لگی۔ تین چار روز کے بعد پہلے پہل ان کے منہ سے آواز نکلی، ''بچہ۔'' مجید صاحب جب آئے تو انھیں اطلاع دی گئی۔ وہ یہ سن کے بہت خوش ہوئے۔ جمعدار صاحب کے پاس تھوڑی دیر کھڑے رہے۔ جمعدار صاحب نے پھر کہا، ''بچہ بچہ'' ڈاکٹروں نے کہا، شاید اپنے بچے کو یاد کر رہے ہیں، مجید صاحب نے سوچا شاید گیدو، جمعدار صاحب ہی کا لڑکا ہے، بلوا کے ان کے پاس بٹھا دیا۔ صاحب نے کہا، ''دیکھیے آپ کا بچہ آ گیا۔'' ایسا معلوم ہوا جیسے جمعدار صاحب نے سنا نہیں۔ شاید سننے سمجھنے کی طاقت واپس نہ آئی تھی۔ وہ آنکھ بند کیے لیٹے رہے۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے پھر کہا، ''بچہ — بچہ — بچہ پھول محمد۔'' ڈاکٹر نے کہا، ''پھول محمد کہہ رہے ہیں۔''

صاحب، ''اوہ — پھول محمد!'' گیدو کو واپس بھجوا دیا۔

۳

گیدو اور مینا کو دیکھ کے صاحب سوچنے لگے ایسے ہی کتنے اور لاوارث بچے ہوں گے، ان معصوموں کی دیکھ بھال کا اب تک کوئی انتظام نہ تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ فوراً باضابطہ یتیم خانے قائم کیے جائیں۔ جن میں نرسیں بچوں کی دیکھ بھال کریں۔ پہلے سرکاری یتیم خانے کی گیدو اور مینا سے ابتدا ہوئی۔ اس دن بیس تیس بچے لوگوں نے لا لا کے داخل کیے۔ کوئی کسی کو راستے سے اٹھا لایا تھا، کوئی اپنا ہی بچہ لے آیا تھا، مگر بہانہ کر کے دوسرے کا کہہ رہا تھا، یتیموں کو اکٹھا کرنے کے لیے علیحدہ احکام جاری ہوئے۔ صاحب خود جہاں جہاں جاتے وہاں وہاں سے یتیم اکٹھا کر کے اپنی لانچ میں بھر بھر کے لاتے۔ ایک ایک دفعہ میں پچیّس پچیّس تیس تیس بچے آتے۔ صاحب کو یتیم خانے سے خاص

دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ بھی خاص دلچسپی لینے لگے۔ کبھی صاحب کھلونے لے گئے تو کسی خان بہادر نے گڑھ کے گڑ کھلونے بھیج دیے۔ کبھی صاحب پھول اور پھل لے گئے تو کسی رائے بہادر کی طرف سے ٹوکروں کے پھل آنے لگے۔ کچھ ایسے گم نام قسم کے خدا کے بندے بھی تھے جو یتیموں کے لیے دوا ایک روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں چپ چاپ بھیج دیتے۔ اپنا نام بتاتے شرماتے، انھیں کون جانتا تھا اور جان کے بھی کیا کرتا۔ اگر بالفرض معلوم بھی ہوگیا کہ فلاں چیز احمد منڈل یا مہندر لال خاں نے بھیجی ہے تو اس سے حاصل؟

مجید صاحب سے گیدو اور مینا خاص طور سے مانوس ہوگئے۔ اچھی غذا اور دوا سے ان بچوں کی زندگی عود کر آئی۔ مینا پھر پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی اور گیدو نے بھی ڈگمگ ڈگمگ چلنا شروع کر دیا تھا۔ صاحب جب یتیم خانے جاتے تو مینا جلدی سے ان کے پاس آجاتی اور اُن کی انگلی پکڑ لیتی، دوسرے بچوں کی طرف اس طرح دیکھتی جیسے ان سے کہہ رہی ہو، دیکھا ہم کتنے بڑے ہیں۔ انگلی پکڑنے کے معاملے میں گیدو سے تھوڑی جنگ بھی ہوتی، ایک دن اس نے گیدو کو ڈھکیل دیا۔ وہ رونے لگا۔ صاحب نے چپ کرانے کے لیے جھٹ سے اسے اٹھالیا۔ مینا کو یہ بات اتنی بری لگی کہ منہ پھلا کے الگ بیٹھ گئی اور روٹھی تو ایسی کہ منائے نہ منتی تھی۔ نارنگی اُس نے نہ لی۔ کھلونوں کو اُس نے ہاتھ نہ لگایا۔ بالآخر چوس پر پسیجی اور اسے اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں سے کھانے لگی۔ کرر کرر جیسے کبھی چھانو کھایا کرتا تھا۔

۴۰

جمعدار صاحب اب آہستہ آہستہ بیٹھنے لگے تھے۔ ایک دن جو مجیب صاحب انھیں دیکھنے آئے، تو بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں صرف چاول اور پانی ایسی دال۔ پوچھنے پر جمعدار صاحب نے بتایا کہ ہفتے میں دو دن مچھلی ملتی ہے اور ایک دن گوشت اور بقیہ چار دن یہی پانی ایسی

دال۔ یہی قصہ سب مریضوں کا تھا۔ صاحب نے حساب منگا کے دیکھا تو وہاں روز ہی کئی سیر مچھلی اور گوشت لکھے پڑے تھے۔ صاحب کو سخت غصہ آیا اور انھوں نے معاملہ پولیس کے سپرد کر دیا۔

دوسرے دن جب صاحب گئے تو دیکھا کہ جمعدار صاحب پڑے کراہ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ رات کو انھیں اتنا گوشت کھلا دیا گیا کہ ان کا کمزور پیٹ جواب دے گیا۔ جمعدار صاحب کے کارڈ پر لکھا ہوا تھا کہ غذا کلکٹر صاحب کے حسب الحکم بدلی جاتی ہے۔ پیٹ بھر بھر کے دونوں وقت مچھلی اور گوشت دیا جائے۔

جمعدار صاحب اسپتال سے غریب خانے منتقل کر دیے گئے۔ اسپتال میں جگہ کی قلت تھی۔ اس کے علاوہ اسپتال کا عملہ بھی اُن کے خلاف ہو گیا تھا اور ان کا وہاں زیادہ رہنا نامناسب تھا۔ یہ شہر کا مرکزی 'غریب خانہ' تھا۔ ایک بڑا افسر اس کا منتظم تھا۔ اس لیے یہاں کا انتظام اچھا تھا۔ جمعدار صاحب کے جسم میں رفتہ رفتہ طاقت واپس آنے لگی اور وہ چلنے پھرنے لگے۔

۵

مجید صاحب ایک دن جمعدار صاحب کو لے کر یتیم خانے گئے۔ یتیم بچے بھر بھر دوڑ کے آ گئے۔ گیدو اور مینا لڑھکتے آ رہے تھے۔ سیدھے مجید صاحب کی طرف۔ جمعدار صاحب کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوئے، جیسے انھیں پہچانا ہی نہیں۔ جمعدار صاحب کے دل کو ذرا ٹھیس لگی۔ انھوں نے خود ہاتھ بڑھا کے گیدو کو اٹھانا چاہا، لیکن اُس نے ''این'' کہہ کے اپنے انداز سے رونے کی دھمکی دی۔ جمعدار صاحب نے اچھا اچھا کہہ کے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مینا مجیب صاحب کی انگلی پکڑے کھڑی تھی اور اُن کے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صاحب کو اُس کی یہ بے تکلفی کی ادا بہت بھائی اور انھوں نے کہا، ''اچھا دیتے ہیں، یہ لو، بھائی لیمن چوس۔'' اور ایک لیمن چوس کی ٹکیا مینا کے چونچ

جیسے منہ میں ڈال دی اور ایک اُس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ایک ٹکیا گیدو کے کھلے ہوئے منہ میں بھی پڑی۔ دوسرے بچے بھی اپنے اپنے حصے کا لیمن چوس لے کے بھاگے۔ مینا لیمن چوس کو کرر کرر کھانے لگی۔ جمعدار صاحب کو کچھ یاد آ گیا۔ اُن کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

٦

پنیر میاں، حسنِ خدمات کے صلے میں خان صاحب ہو گئے۔ انھیں خاں بہادر نہ بننے کی شکایت تو ضرور تھی، مگر پھر بھی جب وہ اپنا نام لکھتے تو پورا خاں صاحب مولوی پنیر الاسلام ضرور لکھتے۔ خطاب کے اعلان کے بعد ہی انھوں نے معلوم نہیں کتنے صفحے اپنا یہ ''خطاب دار'' نام لکھ لکھ کے سیاہ کر ڈالے۔ شروع میں تو وہ رک رک کے اور ٹھہر ٹھہر کے لکھتے۔ بڑی دیر تک اپنے لکھے ہوئے نام کو مختلف زاویوں سے دیکھتے رہتے۔ برا بھلا معلوم ہوتا، کبھی دل ہی دل میں پڑھتے رہتے اور کبھی بآوازِ بلند بھی پڑھتے کہ صرف آنکھ اور دل ہی کیوں مزہ لیں، کان بھی کیوں نہ لطف اندوز ہوں۔ بعد میں انھیں تیزی سے لکھنے میں لطف آنے لگا۔ ان کے دفتر اور گھر میں جدھر دیکھیے کاغذ ہی کاغذ بکھرے پڑے ہیں۔ جن میں شروع سے لے کر آخر تک صرف ایک ہی چیز لکھی ہے اور وہ ''خاں صاحب پنیر الاسلام بی اے بی ایل ایم ایل اے''۔ اگر فرق ہوتا تو صرف اتنا کہ کہیں کہیں خان صاحب کے بعد 'جناب مولوی' اور آخر میں 'صاحب بہادر' کا اضافہ ہو جاتا، یعنی پنیر میاں نہ محض یہ جاننا چاہتا تھے کہ وہ خود لکھیں گے تو کیسا لگے گا، بلکہ یہ بھی کہ جب دوسرے لکھیں گے تو کیسا نظر آئے گا۔

نگن بابو یہ خوش خبری سن کے انھیں مبارک باد دینے آئے۔ خاں صاحب کے دل سے کانوں تک 'ہارٹیسٹ کانگریچولیشنز (بے بھاؤ دلی مبارک باد) کا فقرہ اس قدر گونج رہا تھا کہ کانوں سے زبان تک بھی آ گیا اور انھوں نے بڑی شد و مد سے فرمایا، ''ہارٹیسٹ کانگریچولیشنز''۔ نگن بابو چونکے کہ مبارک باد دینے تو میں آیا تھا پنیر میاں مجھے کس بات کی مبارک باد دے رہے ہیں۔ ایک لمحے

کے لیے انھیں خیال ہوا کہ کہیں پنیر میاں کی بدولت کوئی تمغا و مغا انھیں بھی تو نہیں مل گیا، مگر پھر اس خیال سے خوش ہو گئے کہ شاید پنیر میاں انھیں اپنا آدمی سمجھ کے مبارک باد دے رہے ہیں۔

ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کے جب دونوں کو قدرے سکون ہوا تو گھوڑا مارا کا ذکر چھڑ گیا۔ پنیر میاں وہاں بہت دنوں سے نہ گئے تھے۔ ان کا دل بہت نرم تھا۔ غریبوں کی تکلیف ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ پتھر ایسا دل کہاں سے لاتے کہ بوڑھوں کو جوانوں کو، عورتوں کو مردوں کو بچوں کو سسک سسک کے دم توڑتے دیکھتے۔ ایسے مناظر کے خیال ہی سے وہ اپنی آنکھیں بند کر لیا کرتے۔ نگن بابو نے پہلے تو اچھی اچھی باتیں بتائیں۔ سرت ساہا کی دکان کس دھڑلے کے ساتھ چل رہی ہے۔ کاروبار کس تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ دکان پر ہن کس زور شور سے برس رہا ہے۔ زمینداری میں وصول تحصیل کس عمدگی سے ہو رہی ہے۔ خان صاحب مولوی پنیر الاسلام کے دل میں جو مسکراہٹ پیدا ہو رہی تھی وہ اُن کے چہرے پر بھی کھیلنے لگی۔ لیکن بات میں بات نکل ہی آتی ہے۔ نگن بابو بات کرتے کرتے قحط پہنچ گئے۔ خان صاحب نے ایک آہِ زیرِ لب کے ساتھ کہا، ”ہاں وہ تو ہئی ہے، کیا کیا جائے بڑی مشکل ہے، آج خوشی کے دن یہ سب خیال نہ کرنا ہی اچھا۔“

نگن بابو نے کہا، ”ہاں سچ ہے، مگر یاد آ ہی جاتی ہے۔ وہ ذلیل الدی بے چارہ! ہم کو تو بڑی دیا آئی۔“

پنیر میاں چونکے، ”ذلیل الدی کو کیا ہوا؟“

”آپ کو اب تک خبر نہیں ہوئی؟“

”نہیں تو، بتاؤ بتاؤ۔“

”مگر ہم نے تو ایک چٹھی میں لکھا تھا۔

ہم سے قحط کا ذکر پڑھتے نہیں بنتا۔ ہم چھوڑ گئے ہوں گے۔“

”آپ کتنے دیالو ہیں۔“

پنیر میاں کچھ جھینپ سے گئے۔ بولے، ''اب کیا بتائیں — اچھا ذلیل الدی کی بات بتاؤ۔''

''اپ کو سن کے بڑی تکلیف ہوگی۔ بے چارے کا گھر تباہ ہوگیا، چھانو مر گیا، بی بی جان مر گئیں۔''

''ارے! اور ذلیل الدی؟''

''سنا، بے چارہ لنگر خانے میں بھیگ مانگنے گیا تھا، راستے میں مر مرا گیا۔'' پنیر میاں کے چہرے میں ایک عجیب چمک سی پیدا ہوئی، جیسے ان کے چہرے پر کسی نے چربی مل دی ہو۔ انسان کی چربی، اور اس پر بجلی چمک رہی ہو۔ کہنے لگے، ''ہمارے تمھارے گھر ہی سے مانگ لیتا کچھ نہ کچھ تو مل ہی جاتا۔ بڑا خوددار بنتا تھا۔ آخر لنگر خانے گیا نا؟''

نگن بابو نے کہا، ''یہ بات تو ہے پو نیر میاں شاب مگر.....'' خان صاحب کو برا لگا کہ اب بھی انھیں پونیر میاں ہی پکارا جا رہا ہے۔ خاں صاحب نہیں، مگر خالی ناک بھوں چڑھا کے رہ گئے کچھ کہہ نہ سکے۔ نگن بابو نے جملہ پورا کیا، ''مگر وہ آدمی بہت برا نہ تھا۔''

خاں صاحب کو اپنی تردید اور بری لگی۔ قدرے درشت لہجے میں بولے، ''کیا فضول الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو۔ نمبری بدمعاش تھا۔ تمھارے اوپر الٹا جھوٹا مقدمہ قائم کروادیا۔'' نگن بابو نے پنیر میاں کا یہ لہجہ پہلے نہ سنا تھا۔ انھیں ایک دم سے محسوس ہوا کہ وہ خاں صاحب مولوی پنیر الاسلام سے باتیں کر رہے ہیں۔ پنیر میاں سے نہیں، یہ خیال آتے ہی ان پر مسکینی چھا گئی۔ کہنے لگے، ''بدمعاش تو ضرور تھا۔''

خاں صاحب نے پوچھا، ''تو اس کے گھر میں کوئی نہیں بچا؟''

''کوئی نہیں۔''

''اور پھول محمد؟''

''وہ بھی ذلیل الدی کے ساتھ گیا۔''

''اچھا ہوا، کتنا ہم نے چاہا کہ لونڈے کو نوکر رکھ لیں۔ وہ آدمی بن جائے، مگر وہ ذلیل الدی کے چکر سے نکل نہ سکا۔''

۷

جب سے 'غریب خانے' اور یتیم خانے کھلے تھے تب سے ایک فیشن سا ہو گیا تھا کہ لوگ نذر نیاز اور دعوت کے موقعوں پر کھانا وہاں بھیجا کرتے تھے۔ خان صاحب مولوی پنیر الاسلام نے خان صاحبی کی خوشی میں 'پلاؤ' اور مچھلی کا سالن 'غریب خانے' بھجوایا۔ پھر ان کے جی میں آئی کہ چلیں وہاں کا نقشہ بھی دیکھ آئیں اور غریبوں کو کھاتے بھی۔ وہ یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کھانا ٹھیک سے بٹا، چوری تو نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ 'غریب خانے' کا عملہ اور خود غریب بھی اس ہستی کو دیکھ لیں گے جس کی بدولت انھیں اچھا کھانا مل رہا تھا۔

جس وقت خان صاحب پنیر الاسلام مع نگن بابو کے 'غریب خانے' پہنچے اس وقت کھانا بٹ چکا تھا اور غریب بیٹھے کھا رہے تھے۔ خان صاحب جب داخل ہوئے تو مسلم لیگ والنٹیر وں کے دستے نے نعرہ لگایا، ''مولوی پنیر الاسلام جندہ باذ''، ''ایم ایل اے صاحب جندہ باذ''، ''مسلم لیگ جندہ باذ''۔

نگن بابو نے کہا، ''کھان صاحب بھی کہو۔ کھان صاحب بھی۔'' مگر لوگوں کے منہ سے ''کھان صاحب جندہ باذ'' کا نعرہ نہ نکلا۔ اس تحمل سے خان صاحب داخل ہوئے جیسے کوئی بڑا سرکاری افسر معائنہ کرنے آیا ہے۔ پہلے در و دیوار پر نظر ڈالی۔ کچھ کچھ صفائی کی تاکید کی۔ پھر غریبوں کے کھانا کھانے کا تماشا دیکھنے گئے۔ ہر ایک سے پوچھتے جاتے تھے، ''کیا نام ہے، کہاں کے رہنے والے ہو، کتنے دن سے یہاں ہو، کوئی تکلیف تو نہیں؟'' پیچھے پیچھے نگن بابو کہتے جا رہے تھے، ''کھان صاحب کے گن گاؤ۔ یہ کھانا انھی کی طرف سے ہے۔''

جمعدار صاحب کے کان میں جانی پہچانی آوازیں آنے لگیں۔ انھوں نے سر اٹھا کے دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر نگن بابو اور پنیر میاں چلے آ رہے ہیں۔ جیسے ہی جمعدار صاحب نے نگن بابو کو کہتے سنا کہ کھانا پنیر میاں کا بھیجا ہوا ہے، انھوں نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ان کے لیے یہ احساس بھی بڑا تکلیف دہ تھا کہ پنیر میاں ان سے حاکم کی طرح سوال کریں اور وہ اس کا جواب دیں۔ اٹھ کے جانا چاہتے تھے کہ یہ دونوں آن پہنچے۔ جمعدار صاحب نے سر جھکا لیا۔ پنیر میاں نے حسب معمول سوال کرنا شروع کیا، یہاں جواب ندارد۔

نگن بابو نے کہا، ''اے بڈھے، کھان صاحب تجھ سے پوچھ رہے ہیں۔''

بڈھے نے کوئی جواب نہ دیا۔

نگن بابو نے کہا، ''کوئی پاگل آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

نیا میاں، جو 'غریب خانے' کے منتظمین میں سے تھا اور پیچھے پیچھے آ رہا تھا بولا، ''پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس وقت اسے کیا ہو گی ہے۔ اے بڈھے۔'' یہ کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ سے بڈھے کا سر اٹھا دیا۔ نگن بابو سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بڈھے کی نگاہوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ نگن بابو کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے اور ان کی گھگھی بند گئی۔ جیسے انھوں نے کسی مردے کو گھورتے دیکھا ہو۔ پنیر میاں رو میں تھوڑی دور آگے بڑھ گئے تھے۔ جب کچھ دیر اُن کے کانوں میں یہ خوش آئند آواز نہ آئی کہ ''کھان صاحب کے گن گاؤ۔ یہ کھانا انھی کی طرف سے ہے'' تو انھوں نے مڑ کے دیکھا۔ نگن بابو در کے در کھڑے تھے۔ پنیر میاں نے کہا کیا معاملہ ہے اور واپس آئے۔ نگن بابو تو کچھ کہہ نہ سکے، لیکن نیا میاں نے کہا، ''حضور اس بڈھے کو دیکھ کے بابو جی ایسے ہو گئے۔ بڈھے کو معلوم نہیں اس وقت کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو بڑا نیک آدمی تھا۔'' جمعدار صاحب اٹھ کے جانے لگے۔ پنیر میاں نے پہچان لیا۔ بولے، ''او ذلیل الدی! یہاں؟ اچھا ذرا ٹھہرو۔ سنو — (جمعدار صاحب بدستور چلتے رہے) سنو (اُردو میں) کیسا ہے تم؟ اچھا ہے؟''

جمعدار صاحب کا جی چاہتا تھا کہ پنیر میاں کا منہ نوچ لیں، مگر خون کے گھونٹ پی کے رہ

گئے۔ ان کی طرف حقارت سے دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

پنیر میاں نے کہا، ''نمبری بدمعاش ہے۔''

نیا میاں نے کہا، ''آگے تو آدمی بڑا اچھا تھا، موزید شاب بھی بہت مانتے ہیں، ہم لوگ بھی۔''

''موزید شاب ہی نے تو اس کا دماغ خراب کیا ہے۔ اب پتا چلے گا۔''

جمعدار صاحب لوٹ آئے۔ ان کے منہ سے ایک آواز سی نکلی، جیسے یخنی جوش دی جا رہی ہو اور ڈھکنے کے ایک کونے سے بھاپ سائیں سائیں نکل رہی ہو۔

یہ بھاپ منجمد ہو کے لفظ بن گئی۔ جمعدار صاحب نے کہا، ''پونیر میاں۔''

پونیر میاں، ''ہم اب خان صاحب ہیں۔''

پونیر میاں، ''سنتا نہیں، اب ہم خان صاحب ہیں خان صاحب!''

جمعدار صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ''پونیر میاں ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ کیوں ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔''

خاں صاحب مولوی پنیر الاسلام کو اس بے ادبی پر بڑا غصہ آیا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ ایک ڈنڈا رسید کریں۔ مزاج درست ہو جائے، مگر پھر ضبط کر گئے۔ اتنا ہی کہنے پر انھوں نے اکتفا کی، ''کہ کیسا ناشکرا ہے، ہم تو احسان کرنے آئے ہیں۔ اس کا یہ بدلہ؟''

نگن بابو نے کہا، ''کھان صاحب جانے دیجیے، نیچ لوگ تو ایسے ہوتے ہی ہیں۔''

۸

'غریب خانے' کے صحن میں جو عارضی باورچی خانہ بنا تھا، اس کے پاس ایک میز کرسی رکھ دی گئی تھی۔ نگرانی کرانے والوں کے بیٹھنے کے لیے، کرسی اور میز نئی خریدی گئی تھی۔ جنگ کی وجہ سے اچھی لکڑیاں کم ملتی تھیں۔ لوگ معمولی لکڑیوں سے کام چلانے لگے تھے۔ یہ کرسی میز جنگل کی لکڑی کی

0305 6406067 PDF Book Company

بنی تھی۔ رکھے رکھے ان کے پائے زمین میں دھنس گئے تھے۔ جمعدار صاحب کی نظر میز کے پائے پر پڑی تو کیا دیکھتے ہیں کہ اس کٹے چھٹے میز کے پائے سے شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔ جمعدار صاحب تھوڑی دیر تک حیرت سے دیکھتے رہے۔ کیا ان میں اتنی بھی جان باقی نہیں رہی تھی جتنی اس سوکھی ساکھی لکڑی میں تھی۔ جمعدار صاحب کو بہت دنوں کے بعد انگڑائی آئی۔ جب مجید صاحب دوسرے دن آئے تو جمعدار صاحب نے ان سے کہا، ''حضور اب میں تو اچھے ہو گئے، کوئی کام کرنا مانگتے ہیں۔''

صاحب نے کہا، ''نہیں ابھی آپ کمزور ہیں۔ کیسے کام کر سکتے ہیں۔''

''حضور بیٹھے بیٹھے کرنے سکتے ہیں۔''

صاحب نے دل میں کہا، جمعدار صاحب بات تو پتے کی کہہ رہے ہیں۔ اتنے لوگ غریب خانے میں رہتے ہیں، اگر تھوڑی تھوڑی دیر کام کریں تو ان کا جی بھی بہلے اور کچھ کما بھی لیں۔ اس میں ایک یہ بھی فائدہ ہوگا کہ جو واقعی حاجت مند ہوں گے وہ شوق سے کام کریں گے اور زبردستی کے مفت خورے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ تجربتاً یہ مرکزی 'غریب خانہ' ایک چھوٹے موٹے کارخانے میں بدل دیا گیا۔ یہیں لوگ رہتے بھی تھے اور کام بھی کرتے تھے۔ غریبوں کو طرح طرح کے کام میں لگایا گیا۔ جنھیں جو کام پہلے سے آتا تھا وہ انھیں دیا گیا۔ کوئی بید کی ٹوکری بن رہا ہے، کوئی کھجور کی چٹائی، کوئی دھان کوٹ رہا ہے، منافع کا آدھا حصہ کام کرنے والوں کے حساب میں جمع کر دیا جاتا۔ نئے نئے کام بھی شروع کیے گئے، مثلاً کپڑا بننا، ان کے لیے سکھانے والے متعین کیے گئے۔ کام کی شرط جو لگا دی گئی تو غریب خانے کی آبادی آدھی رہ گئی۔ جو کام کرنے والے رہ گئے وہ اچھا خاصا کمانے لگے۔ جمعدار صاحب پہلے چٹائی بنتے تھے، مگر اب کپڑا بننا سیکھنے لگے۔ رفتہ رفتہ اتنی ترقی کر گئے کہ ان کی آمدنی چار چھ آنے سے بڑھ کے دس بارہ آنے روز ہو گئی۔ یہ کارخانوں کا تجربہ اتنا کامیاب ہوا کہ جملہ 'غریب خانے' کارخانوں میں بدل دیے گئے۔

۹

جمعدار صاحب میں اب اچھی خاصی طاقت آ گئی تھی۔ مجید صاحب نے کارخانے میں ان کا انہماک دیکھ کے انھیں نگراں بنا دیا۔ ساٹھ روپے مہینہ تنخواہ مقرر ہوگئی۔ پہلے تو وہ کپڑے بننے کا کام بھی ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ اس خیال سے کہ یہ فن جو انھوں نے نیا نیا سیکھا تھا اس میں ان کی مہارت بڑھے اور محنت و مشقت کی عادت نہ چھوٹنے پائے۔ مجید صاحب جب آئے تو جمعدار صاحب نے اُن سے پوچھا، صاحب نے کہا کہ سرکاری کام کے وقت وہ اب اپنے نج کا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جمعدار صاحب خاموش ہو گئے۔ جمعدار صاحب نے جب دو تین روز اپنے نئے فرائض انجام دیے تو انھیں ایک احساس ستانے لگا، انھوں نے ایک دن مجید صاحب سے کہا، ''حضور میں ایک مشکل میں گھر گیے ہیں۔''

''کہیے۔''

''حضور کپڑا بُننے میں بڑا محنت پڑتا تھا، مگر میں صرف بیس پچیس کمانے سکتے تھے اور اب اتنا محنت نہیں، مگر ساٹھ روپے ملنے کا بات ہے۔ یہ ٹھیک ہے مطلب جائز؟''

صاحب مسکرائے۔ اُن کی نظر میں جمعدار صاحب کی وقعت اور بڑھ گئی۔ انھوں نے کہا، ''پھر تو میری تنخواہ آپ سے بھی کم ہونی چاہیے۔''

جمعدار صاحب اپنے استدلال کے اس منطقی نتیجے کو سن کر چونک پڑے۔ ان کا پہلا ردِ عمل ''نہیں نہیں'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ صاحب نے کہا، ''آخر کیوں، میں بھی تو آپ ہی کی طرح آدمی ہوں۔''

جمعدار صاحب، ''حضور کا اور بات ہے۔''

''اور بات کیا ہے۔''

''میں بتانے نہیں سکتے۔''

''آپ سمجھتے ہیں محنت صرف ہاتھ پاؤں سے ہوتی ہے، دماغ سے نہیں۔''

''نہیں ایسا بات تو نہیں۔''

''پہلے آپ ہاتھ پاؤں کی محنت زیادہ کرتے تھے، دماغ کی کم۔ اب دماغ کی زیادہ کرتے ہیں، ہاتھ پاؤں کی کم اور دماغ کی محنت کی قیمت زیادہ ہے۔''

جمعدار صاحب کی سمجھ میں بات آ گئی۔ صاحب ٹھیک تو کہتے ہیں، دماغ ہی کی بدولت تو انسان دوسرے جانوروں پر حکومت کرتا ہے۔ انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کمائی بحیثیت نگران کے اکلِ حلال ہوگی اور وہ نگرانی کے کام میں اس انہماک سے لگ گئے کہ ان کے ساتھیوں کو برا لگنے لگا۔ یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہر وقت کام میں جتے ہوئے ہیں۔ آدمی ہیں کہ بیل، نہ تفریح نہ گپ شپ۔ اس سے زیادہ خراب بات یہ تھی کہ جمعدار صاحب ایک ایک چاول پر نگاہ رکھتے اور پائی پائی کا حساب کرتے۔ نیا میاں کے لیے یہ بات خاص طور سے تکلیف دہ تھی۔ وہ اپنے گھر کا خرچ بھی اس کارخانے کی چیزوں سے چلانے کا عادی تھا۔ اب اُسے مشکل ہو رہی تھی۔ ایک دن جمعدار صاحب سے اس نے کہا، ''کیا تمھارے گھر بار نہیں ہے؟''

جمعدار صاحب کچھ کھو سے گئے، آہستہ سے بولے، ''نہیں۔''

''بال بچے بھی نہیں ہیں؟'' جمعدار صاحب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے جیسے کچھ سن نہیں رہے ہیں، جیسے کچھ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ جیسے بہت دور دیکھ رہے ہیں بہت دور۔ اس زمین سے دور۔ اس آسمان سے دور۔ نیا میاں کے ٹوکنے پر ان کے کھلے ہوئے منہ سے ایک نحیف سی رینگتی ہوئی آواز نکلی، ''نکلی۔''

''یہ کہو، ہم بھی تو کہتے تھے کیا بات ہے، بھیا ہمارے تو گھر بار ہے، بال بچے ہیں، ہمارا تو ساٹھ روپیا مہینے میں گزارا نہیں ہو سکتا۔''

جمعدار صاحب نے جب کچھ ہاں ہوں نہ کی تو نیا میاں نے ان کی طرف پھر دیکھا۔ ان کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس نے کہا، ''ارے سنتے ہو۔''

جمعدار صاحب عالم خیال اور عالم ارواح سے واپس آ گئے۔ بولے، ''ہاں، کیا؟''

''ارے ہم کہتے ہیں کہ ہمارے بال بچوں کا گزارا تو خالی ساٹھ روپے میں نہیں ہو سکتا۔''

جمعدار صاحب اس ''خالی'' کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ پوچھا، ''پھر؟''

''وہ لوگ بھی غریب ہیں ان کا بھی تو حق ہے۔''

''وہ یہیں رہتے ہیں؟''

''نیا میاں کو برا لگا۔ اُس نے جھنجھلا کر کہا، ''نہیں۔''

''پھر؟''

''چاہے وہ یہاں رہ کر کھائیں چاہے گھر پر، بات ایک ہی ہے۔'' جمعدار صاحب کو بات ذرا معقول معلوم ہوئی۔ کہنے لگے، ''ہاں مگر مطلب کیا ہے؟''

''مطلب کچھ نہیں، ہم خالی بتا رہے ہیں۔''

جمعدار صاحب نے رات کو دیکھا کہ نیا میاں ایک ٹوکری بھر کے چاول، دال، ترکاری اٹھا رہا ہے۔

جمعدار صاحب نے پوچھا تو اس نے کہا، ''بتایا تو تھا تم سے، بال بچوں کے لیے گھر لیے جا رہے ہیں۔'' اب جمعدار صاحب کی سمجھ میں اس کی اس وقت کی گفتگو کا مطلب آیا، انھوں نے کہا، ''نہیں یہ حرام ہے، چوری ہے۔''

نیا میاں کو برا لگا۔ یہ بڈھا جو کل تک خیرات کھا رہا تھا، آج حرام حلال بگھار رہا ہے۔ کون ہوتا ہے یہ دخل در معقولات کرنے والا۔ اُس نے کہا، ''جاؤ جاؤ بکواس مت کرو۔''

جمعدار صاحب نے کہا، ''ہم نہیں لے جانے دیں گے۔ اور لے جاؤ گے تو ہم صاحب سے کہہ دیں گے۔'' نیا میاں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''اچھا'' کہہ کے کھسیایا ہوا الگ جا بیٹھا۔

جمعدار صاحب تھوڑی دیر سوچتے رہے، پھر اس کے پاس جا کے بولے، ''حرام مال

کھانے سے تم نہ رکے۔ مجید صاحب کے ڈر سے رک گئے۔ تم اللہ سے زیادہ مجید صاحب سے ڈرتے ہو۔ کیسے مسلمان ہو۔'' نیا میاں اور غصے اور کھسیاہٹ کے عالم میں جمعدار صاحب کی بات نہ سن رہا تھا نہ سمجھ رہا تھا۔ اس کے کان میں جمعدار صاحب کی آواز خالی جھائیں جھائیں کر رہی تھی۔ اس نے کہا، ''جاؤ بک بک مت کرو۔''

۱۰

ایک دن خان صاحب مولوی پنیر الاسلام والنٹیر وں کے دستے کو ساتھ لے کے مجید صاحب سے ملنے آئے۔ ایک ہاتھ کی مٹھی کو دوسرے ہاتھ سے ملتے ہوئے بڑی مسکینی سے کہنے لگے، ''سر ہم ورک ہاؤس جا کے دیکھا ہماری تو آنکھ کھل گئی، اور سر یہ نئے نئے اسپتال اور یتیم خانے جو جگہ جگہ سر نے قائم کیے ہیں ایسے تو کسی ضلع میں نہیں۔ دوسرے لوگ سر کی نقل کرنا چاہتے ہیں، مگر کہاں سر اور کہاں وہ لوگ۔ سر تو غریبوں کے ماں باپ ہیں۔ سر کے کہنے سے ان مسلم لیگ والنٹیر وں نے بھی بڑا کام کیا ہے۔''

''سر'' کے لیے یہ کوئی نیا تجربہ نہ تھا۔ خان صاحب پنیر الاسلام اور ان کے دوسرے بھائی اکثر اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ''آمدم برسر مطلب'' کے انتظار میں سنتے رہے۔ خان صاحب آدھے گھنٹے تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے، پھر بغیر کوئی بات کہے رخصت ہو کے جانے لگے۔ دروازے تک جا کے پلٹے اور کہنے لگے، ''ہاں سر ایک بات کہنا تو بھول ہی گیا۔'' سر پہلے ہی سے جانتے تھے کہ جو بات وہ بھول ہی گئے تھے وہی انھیں سب سے زیادہ یاد تھی اور اسی کے کہنے کے لیے ساری تمہیدیں باندھی گئی تھیں۔ خان صاحب نے فرمایا، ''سر مسلم لیگ والنٹیر وں کو ان کے کام کا کچھ انعام ملنا چاہیے۔ سر انھیں ایک راشن کی دکان دے دیں۔'' سر سوچ رہے تھے کہ پنیر میاں کیا کہیں گے، مگر ان کے خیال کی رسائی یہاں تک نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے انھیں یکا یک دھکیل دیا۔ اپنے اندر کسی ابھرتے ہوئے جذبے کو روکتے ہوئے بولے، ''مسلم لیگ کے

والنٹیر راشن کی دکان چاہتے ہیں؟''

پنیر میاں، ''جی سر۔''

''اس کام کے عوض میں جو انھوں نے قحط میں کیا ہے؟''

''جی سر۔''

''یہ کام ان لوگوں نے اسی نیت سے کیا تھا؟''

''جی سر — (صاحب کا چہرہ دیکھ کے) نہیں اس نیت سے تو نہیں مگر —''

''تو بعد میں نیت بدل گئی؟''

''سر کچھ تو انعام چاہیے۔''

''ضرور۔''

''ہاں سر۔''

''کمیونسٹ بھی تو کام کررہے ہیں۔ آپ کے گاؤں ہی میں کچھ ہیں، جلودھر وغیرہ — انھیں بھی کچھ انعام ملنا چاہیے؟''

''سر مگر وہ سب تو مسلم لیگ کے نہیں ہیں، بڑے بدمعاش ہیں۔''

''اور انھوں نے کسی انعام کی خواہش بھی نہیں ظاہر کی؟''

''وہ تو کام ہی لوگوں کو ورغلانے کے لیے کرتے ہیں، گورنمنٹ سے کسی انعام کے لیے نہیں کرتے۔''

''اور مسلم لیگ کے والنٹیر انعام کے لیے کرتے ہیں؟''

''جی سر۔''

''اگر راشن شاپ کی امید نہ ہوتی تو نہ کرتے؟''

''جی سر — نہیں سر، کرتے کیوں نہیں — مگر''

صاحب لڑکوں کی طرف مخاطب ہوئے، ''تم لوگ خود کیوں نہیں کچھ کہتے۔ تم بھی یہی کہنا

چاہتے ہو جو خاں صاحب کہہ رہے ہیں؟"

لڑکے سٹ پٹائے۔ "نہیں سر یہ بات تو نہیں، کھان صاحب نے راشن شاپ دلانے کو کہا تھا۔ ہم بھی راضی ہو گئے۔"

"کب کہا تھا؟"

"جب سر نے والنٹیر مانگے تھے۔"

"خان صاحب نے جو ایسی لالچ دلائی تو تمھیں برا نہیں لگا؟"

"برا تو لگا سر مگر۔"

"مگر کیا؟ جاؤ یہاں سے، تمھاری بات سن کے ہمیں بڑی شرم آ رہی ہے، تمھیں کیسے نہیں آئی۔"

لڑکے شرما کے بھاگے، کچھ آداب کر کے، کچھ بغیر آداب کیے۔ خان صاحب بنیر الاسلام ابھی موجود ہی تھے کہ مجید صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

بنیر میاں نے باہر نکل کر کہا، "دیکھا حد ہوگئی۔ والنٹیر وں کی اگر اس طرح حوصلہ افزائی نہ کی جائے گی تو پھر وہ کس امید پر کام کریں گے۔ موزیدشاب بڑا مسلم لیگ بنتا ہے۔ اگر مسلم لیگ کا خیال ہوتا تو ضرور مدد کرتا۔ چھپا کانگریسی ہے۔"

لڑکے احساسِ شرم سے کٹے جا رہے تھے۔ خاں صاحب مولوی بنیر الاسلام کی بات پر دھیان دیے بغیر چل دیے۔

۱۳

گھوڑ امارا اپنے سپوت خان صاحب مولوی بنیر الاسلام بی، اے، بی، ایل، ایم ایل اے، کے دھوم دھامی استقبال کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گھوڑ امارا میں ان سے پہلے کسی کو کوئی خطاب نہ ملا تھا۔

نگن بابو، سرت ساہا اور سلطان میاں ان تیاریوں میں پیش پیش تھے۔ اب پھول محمد تو تھا نہیں جو کسی قسم کی گڑبڑ سڑبڑ پیدا کرتا۔ تیاریاں اطمینان سے ہو رہی تھیں۔ ان میں جوش سے زیادہ خروش تھا۔ گھوڑا مارا میں نئی قسم کی چہل پہل تھی۔ نوحۂ غم کی نہیں، نغمۂ شادی کی۔

پنیر میاں کے اسکول میں استقبالیہ جلسہ ہوا، جلسے میں سلطان میاں نے بھی تقریر کی۔ نگن بابو نے بھی اور شرما حضور میں جلوہ دھرنے بھی۔ ''کھان صاحب'' کی پبلک خدمات سراہی گئیں۔ 'کھان صاحب' کی خدمت میں مبارک باد پیش کی گئی اور گورنمنٹ کی خدمت میں بھی کہ اس نے ایسے جوہرِ قابل کو پرکھا اور چمکایا۔ تقریروں کے بعد کچھ گانا ہوا۔ کچھ مزاحیہ نقلیں کی گئیں اور کچھ جادو کے کھیل دکھائے گئے۔ آخر میں حاصل جلسہ کاروائی شروع ہوئی، یعنی چائے پانی۔ یہاں پانی سے مراد وہ پانی نہ تھا جو چائے اور دودھ میں پڑا تھا، بلکہ مطلب مٹھائی اور سموسوں وغیرہ سے تھا جو چائے کے لوازمات میں سے تھے اور جنھیں تکلفاً یا محاورتاً پانی کہا جاتا تھا، جلسے میں زمیندار بابو بھی پدھارے تھے۔ ان کی موجودگی سے جلسے کی اہمیت بڑھ گئی تھی، مگر انھوں نے تقریر کے وقت منہ کھولا، نہ چائے پانی کے وقت۔ پنیر میاں کے اعزاز میں ان کا کھڑے ہو کے تقریر کرنا ان کے شایانِ شان نہ تھا۔ رہا چائے پانی کا سوال تو معلوم نہیں اس میں کس کس کا ہاتھ لگ چکا ہوگا۔ زمیندار بابو کیسے کھا سکتے تھے۔ پنیر میاں نے جلدی سے کیلے منگوائے جو علیحدہ رکھے ہوئے تھے۔ نگن بابو دوڑ کے لائے۔ وہ کیلے جن کے کوزے میں امرت کا سمندر بند تھا اور جنھیں امرت ساگر کہا جاتا تھا۔ نگن بابو نے احتیاطاً انھیں اپنے ہاتھ سے دھولیا، زمیندار بابو کو جب ان کی پاکی کا اطمینان ہوگیا تو انھوں نے خاندانی بڑے آدمیوں کی طرح ان سے آہستہ آہستہ شغل فرمانا شروع کیا۔ پنیر میاں ان کی بغل بیٹھے تھے، بابو جی بری شفقت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوئے، فرمایا، ''تمھاری — آپ کی وجہ سے ہمارے گاؤں کی ہماری زمینداری کی عزت بڑھ گئی۔ ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔'' پنیر میاں نے آداب کیا جیسے کہہ رہے ہوں ''میں کس قابل ہوں۔''

پنیر میاں نے رازدارانہ انداز میں اپنی کرسی زمیندار بابو کے قریب کرلی، کہنے لگے، ''کمشنر صاحب بہادر کا مبارک باد کا خط آیا تھا۔ ہم نے شکریہ کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ اگر لڑائی میں کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں ہر طرح حاضر ہوں، صاحب نے بڑی خوشی کا خط لکھا ہے، اب تو جرمن ہار ہی رہے ہیں۔ اس وقت مدد کرنے میں بڑا فائدہ ہوگا۔'' زمیندار بابو نے کہا،''میں تو حال ہی میں دس ہزار کے وار بانڈ خرید چکا ہوں، دو ہزار چندہ بھی دے چکا ہوں۔'' پنیر میاں کو بہت افسوس ہوا کہ زمیندار بابو نے یہ روپے ان کے ذریعے سے کیوں نہ دیے۔ قیس محمد کھڑا سن رہا تھا، اسے جلودھر نے اسکول میں دفتری کرا دیا۔ وہ جلسے کے سامان درست کرانے میں مدد کر رہا تھا۔ اب جو خبروں پر تبصرہ شروع ہوا۔ تو حسبِ عادت کھڑا ہو کر سننے لگا، سلطان میاں تو زمیندار بابو اور پنیر میاں کے خیال سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، مگر جلودھر اور مخلص ذرا زور سے زور سے بول رہے تھے۔ وہ نگن بابو اور سلطان میاں پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ درحقیقت اشتراکی جمہوریت کے مقابلے میں فاشزم کی استبدادیت کو شکست کھانی ہی تھی اور کھا رہی ہے۔ نگن بابو اپنی دانست میں ہز ماسٹرز وائس بنے ہوئے ان لوگوں سے الجھ پڑے، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی آواز ان کے مالک کے کانوں تک پہنچ جائے اور یہ بھی کہ بے ادبی سرزد نہ ہو۔ چنانچہ خاص خاص باتیں ذرا زور سے کر دیتے اور باقی آہستہ آہستہ ''آریہ جاتی''۔ ''ہندو دھرم۔'' ''ہٹلر ہار نہیں سکتا۔'' آخر میں جیت کر رہے گا۔'' قسم کے فقرے زمیندار بابو کے کان تک پہنچنے لگے۔ ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ نگن بابو کنکھیوں سے اپنے مالک کو دیکھتے جاتے تھے، ان کو متوجہ دیکھ کے اور زیادہ جوش سے بحث کرنے لگے۔

زمیندار بابو کی آواز آئی، ''نگن۔''

نگن بابو، ''آ گیاں'' کہہ کے دوڑے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو، بلاؤ ان لوگوں کو۔''

''آ گیاں۔''

بحث کرنے والے آ گئے، سلطان میاں نے بحث کا خلاصہ بتایا۔ زمیندار بابو نے ارشاد

فرمایا، ''سب غلط بات ہے، یہ واہیات خیالات تم لوگ کیوں پھیلا رہے ہو۔ روس کے باپ کی ہمت نہ تھی کہ جرمنوں کو ہرا دیتا، امریکا اور برطانیہ کو دعا دے جنھوں نے اس کی مدد کی اور اسے بچالیا۔ جمہوریت میں بڑی طاقت ہے، روس میں جمہوریت کہاں۔''

نگن بابو حیرت سے اپنے مالک کو دیکھنے لگے، انھیں اپنا وہ زمانہ یاد آ گیا جب یادش بخیر وہ جمہوریت کے علم بردار بنے پھرتے تھے۔ انھیں ایک ہی جست لگا کے وہاں واپس پہنچ جانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی اور وہ ازسرِ نو جمہوریت پسند کانگریسی ہو گئے۔ پنیر میاں چکر میں پڑ گئے۔ ''بابو جی کا حافظہ کیا اتنا کمزور ہو گیا ہے کہ پہلے کی کہی ہوئی باتیں بھول جاتے ہیں۔ آخر خاندانی امیرزادے ٹھہرے، مسلسل عیش پرستی کا اثر حافظے پر ضرور پڑتا ہے، یا شاید حالات نے بابو جی کے خیالات اتنے بدل دیے ہیں کہ وہ اپنے پرانے خیالات کو نظر انداز کر چکے ہیں۔'' جلودھر اصولاً تو زمینداری اور زمینداروں کے خلاف تھا، مگر زمیندار کا اب بھی گاؤں میں بڑا رعب تھا اور جلودھر بھی اس سے مرعوب تھا۔ اس نے دبی زبان سے کہا، ''سر آپ کو شاید کسی نے غلط بتایا ہے کہ روس میں جمہوریت نہیں ہے۔'' زمیندار بابو نے ذرا درشت لہجے میں کہا، ''ہم کو کون بتائے گا، ہم نے خود پڑھا ہے۔ یہ بڑا بے ادب آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کون ہے؟''

پنیر میاں نے کہا، ''حضور کا پرجا ہے، پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔''

زمیندار بابو کو خیال آیا کہ جلودھر کی طرح شاید اوروں کے بھی غلط خیالات ہوں، ان کی اصلاح ضروری ہے۔ فرمایا، ''یہ نہ سمجھو کہ ہم انگریزی راج کو اچھا سمجھتے ہیں ہم تو خود سوراج مانگتے چلے آئے ہیں، اور اس لیے سوراج مانگتے ہین کہ ہمارے یہاں بھی جمہوریت قائم ہو، مٹھی بھر انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت کریں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔''

مخلص نے کچھ کہنا چاہا، نگن بابو نے کہا، ''چپ رہو، بابو جی بول رہے ہیں۔'' وہ چپ ہو گیا۔ بابو جی نے نگن بابو سے پوچھا، ''یہ کون ہے؟'' جب انھوں نے مکلیشور میاں سنا تو لفظ ''میاں'' سمجھے کہ مسلمان ہے اور شاید ہندو مسلمان کا سوال اٹھانا چاہتا ہے، بولے، ''سوراج کے معاملے میں

ہندو مسلمان کا سوال نہیں، ہم تو کہہ ہی چکے ہیں کہ ہمارے دیس میں بھی جمہوریت ہونی چاہیے۔ سب کی رائے سے راج چلے۔ جو زیادہ لوگوں کی رائے ہو چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان وہی مانی جائے۔" پنیر میاں کہنا چاہتے تھے کہ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ سارے مل میں چونکہ ہندو زیادہ ہیں اس لیے انھی کا راج ہو، مگر زمیندار بابو کے لہجے میں زور بھی تھا اور تحکم بھی، اس لیے کچھ کہہ نہ سکے۔

جب جلسہ برخاست ہوا تو قیص نے جلودھر سے کہا، "بابو جی کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے کچھ کہا نہیں؟"

"نہیں ابھی موقع نہیں۔"

"پھر؟"

"ہمیں موقعے کی تیاری کرنی چاہیے، اس وقت ہم توپ کے منہ سے بات کریں گے۔ اس کا جواب بابو جی کے باپ بھی نہ دیں سکیں گے۔ ابھی جو اُن کا جی چاہے کہہ لیں۔"

☯......☯......☯

تیرھواں باب

بنگال کی فضا غزل تو اب بھی بنی ہوئی تھی، مگر اب میر کی غزل کی جگہ حافظ کی غزل لے رہی تھی۔ ساقی مائل بہ کرم تھا۔ شراب وشاہد کا دور دورہ تھا، کاگ اڑ رہے تھے۔ شراب بوتلوں سے اچھل رہی تھی۔ ہنستی گاتی، قہقہے لگاتی۔ لوگ بھی ہنس رہے تھے، گا رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ سیم تنوں پر کاغذ کی شکل میں چاندی برسائی جا رہی تھی۔ سیم تن بھی نقرئی تبسم کی بارش کر رہے تھے۔ دونوں طرف سخاوت کا جوش تھا۔ یہ کہنا مشکل ہوا جا رہا تھا کہ کون زیادہ سخی ہیں، پینے والے یا پلانے والے، بنگال کی رنگین فضا کو یہ رنگ رلیاں اور بھی زیادہ رنگین بنائے دے رہی تھیں۔ بات یہ تھی کہ جگہ جگہ فوجیں آ گئی تھیں، فوجوں کے کیمپ کیا تھے بڑے بڑے عشرت کدے تھے۔ رات کو یہ عشرت کدے رقص گاہوں میں بدل جاتے۔ وہ رقص گاہیں جہاں جلوت میں خلوت اور خلوت میں جلوت کا لطف آتا، اور رقص بھی کیسے رقص؟ تازہ بہ تازہ، نو بہ نو۔ وہ رقص جا کا ذکر لسان الغیب پہلے ہی ان الفاظ میں کر چکے تھے کہ۔

رقص بر شعر تر و نالۂ نے خوش باشد
خاصہ رقصے کہ دراں دست نگارے گیرند

جسے دیکھیے دستِ نگار ہاتھ میں لیے رقص کر رہا ہے۔ ان رقص کرنے والوں میں سفید فام بھی تھے اور سیاہ فام بھی۔ سفید فاموں کی بھی کئی قسمیں تھیں اور سیاہ فاموں کی بھی۔ قسم اوّل کے سفید فام امریکی تھے اور قسم اوّل کے سیاہ فام ہندوستانی، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو کالے کی بجائے بھورا کہتے، اگر کوئی انھیں کالا کہتا تو برا مانتے۔ کالے کہے جانے کے مستحق تو صرف حبشی تھے۔ بھیڑی جیسے بال، دونالی بندوق جیسی ناک۔ تارکول جیسے رنگ والے حبشی، بھلا اچھے خاصے بھورے اونچی ناک

والے ہندوستانیوں کو ان کالوں سے کیا نسبت؟ ان بھوروں کی بھی تین قسمیں تھیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، تینوں اپنے اپنے کو ایکدوسرے سے اونچا سمجھتے تھے۔ ہندوؤں کی نسل اونچی تھی، مسلمانوں کی بہادری کا کیا کہنا، آخر سترہ آدمیوں سے سارا بنگال فتح کر چکے تھے کہ نہیں۔ رہے سکھ تو وہ اپنے کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھتے تھے۔ یہ ان کی عقل ہی تو تھی جس کی بدولت وہ نہ محض فوج پر چھائے جا رہے تھے، بلکہ زندگی کے دوسروں شعبوں پر بھی ان بھوروں میں جس کا رنگ ذرا صاف ہوتا وہ اپنے آپ کو امریکن تو نہیں، مگر انگریز ضرور سمجھتا اور دوسرے بھوروں سے ذرا کم ملتا جلتا—امریکی انگریزوں کو حقیر سمجھتے انگریز ہندوستانیوں کو۔ ہندوستانیوں میں ہندو مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کو اپنے سے کم تر سمجھتے۔ امریکا کے حبشی انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو اپنے سے کم رتبہ خیال کرتے، گورے، کالے، بھورے، افسروں کے لیے رقص گاہوں کا سامان موجود ہی رہتا، غریبوں سپاہیوں کی تفریح کے لیے بھی اربابِ نشاط کا انتظام کیا گیا۔ شاعری بھی آخر نشاط روح کی چیز تھی۔ پھر شاعروں کو اربابِ نشاط میں کیوں نہ شامل کیا جاتا۔ چنانچہ شاعروں کی سرکردگی میں اربابِ نشاط کی ٹولیاں ترتیب دی گئیں۔ اربابِ نشاط کی اس انجمن کا نام "دل کوش سبھا" تجویز کیا گیا۔ جیسا نام دل خوش کن تھا ویسا ہی کام بھی تھا، گانے مجرے اس معیار کے ہوتے کہ سپاہیوں کا دل واقعی خوش ہو جاتا، پورا مجمع تالی بجا بجا کے سر دھنتا۔ کبھی جوش میں آ کے طرح طرح کی آوازیں نکالتا، کبھی کوئی بہادر بے اختیار ہو کے گانے، تھرکنے اور بھاؤ بتانے لگتا۔ اس دل خوشی میں سرخوشی بھی رنگ لاتی، آپس میں پر لطف چپقلش بھی ہوتیں۔ رقص میں کون کس کے ساتھ ناچے، سینما میں کون کس کے ساتھ بیٹھے ان اہم مسائل پر جھگڑا ہوتا اور بعض وقت جوتم بیزار تک کی نوبت آ جاتی، الغرض بنگال میں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ پہلے تو صرف جاپانیوں ہی سے مقابلے کی تیاریاں ہو رہی تھی۔ اب قحط سے بھی جنگ کرنے کا حکم ملا۔ بنگال میں قحط اور برما میں جاپانی زیادہ عرصے تک بیک وقت ٹکے نہ رہ سکتے تھے۔ بنگال سے اگر قحط نہ گیا تو جاپانیوں کے آنے کا خطرہ تھا، اس لیے قحط سے جنگ جاپانیوں سے جنگ ہی کا دوسرا رخ تھی۔

۲

فوجیوں کا یوں ہی بہت جی چاہ رہا تھا کہ غریبوں خاص طور سے غریب عورتوں کی مدد کریں اور خفیہ خفیہ کچھ کرتے بھی رہتے تھے، مگر اب تو قحط سے لڑنے کا حکم ہی ہو گیا تھا۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا۔ فوجی کیمپ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لنگر خانے بنے جا رہے ہیں۔ عام طور سے بچا کھچا کھانا بیرکوں کے باہر ہی غریبوں کو دیا جاتا، لیکن ایسے دردمند دل رکھنے والوں کی بھی کمی نہ تھی جنھیں عورتوں کو اس طرح کھانا دینا اچھا نہ لگتا۔ وہ انھیں بیرکوں کے اندر لے آتے، ان کے آنسو پونچھتے، ان کی دل جوئی کرتے۔ کھانا تو خیر کھلاتے ہی اور کھانا بھی کیسا، جھوٹا بچا کھچا نہیں، بلکہ مکھن توس وغیرہ اور سب فی سبیل اللہ۔

۳

بڑے بڑے فوجی افسر جنرل سے لے کر کپتان تک قحط کے انتظام کے سلسلے سے جگہ جگہ گھوم رہے تھے۔ ریل گاڑیوں، ٹرکوں، دخانی کشتیوں کا ایک بڑا حصہ فوجی سامان کی بجائے غلہ اور دوائیں جگہ جگہ پہنچانے میں لگا دیا گیا تھا۔ فوجی ڈاکٹر مع دواؤں کے قحط کے اسپتالوں میں پہنچ گئے تھے۔ ایک جنرل صاحب اس ورکس ہاؤس کو بھی دیکھنے آئے جس میں جمعدار صاحب تھے، ان کے آنے سے پہلے ان کے آنے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جمعدار صاحب نے جو سنا کہ فوج کے جنرل آنے والے ہیں تو چونکے، جنرل صاحب یہاں آئیں گے؟ کیوں؟ بھرتی کرنے تو نہیں؟ جمعدار صاحب کچھ کھو سے گئے۔ انھیں پرانی باتیں یاد آنے لگیں، وہ پھر لڑائی پر چلے جائیں کیا؟ اب یہاں رہ کر کیا کریں گے، پھول محمد بھی نہیں رہا، چھانو بھی نہیں، بی بی جان بھی نہیں، جو انھیں جانے سے روکتی تھیں، مگر وہ تو روکتی تھیں؟ ـــ اگر اب جمعدار صاحب چلے گئے تو اُن کی روح کو تکلیف نہ ہوگی؟ نہیں، نہیں وہ نہیں جائیں گے۔ وہ یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ جنرل صاحب آ گئے۔ دو تین فوجی افسروں اور مجید صاحب کے ساتھ، نیا میاں نے بڑے ادب سے جھک کے سلام کیا۔ اتنے فوجی افسروں کو دیکھے

کے جمعدار صاحب پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی۔ وہ جھٹ سے اٹنشن ہوگئے، کڑک کے سلیوٹ کیا۔ مجید صاحب دیکھ کے مسکرا دیے۔ جنرل صاحب نے پوچھا، یہ کون آدمی ہے، مجید صاحب نے بتایا، جمعدار صاحب نے بڑے غور سے سننے کی کوشش کی، مگر بات خالص انگریزی میں ہو رہی تھی اس لیے ایک لفظ ''جمعدار'' کے علاوہ کچھ اُن کے پلے نہ پڑا۔ اتنا سمجھ گئے کہ میرا ہی ذکر ہو رہا ہے اور ان کی خوشی کے لیے یہی کافی تھا۔

جنرل صاحب یتیم خانے بھی گئے۔ وہاں بچے حسبِ معمول دوڑ دوڑ کے آئے۔ ''موزید شاب جندہ باد، موزید شاب جندہ باد'' چیختے ہوئے، ان کے کپڑے صاف تھے۔ سب کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا، مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چہرے کچھ تیل سے کچھ خوشی سے چمک رہے تھے۔ مینا نے حسب معمول مجید صاحب کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ انھوں نے لیمن چوس نکال کے دیا۔ وہ کُر کُر کھانے لگی۔ دوسرے بچے بھی لیمن چوس لے لے کے بھاگے۔ جنرل صاحب کو یہ منظر بڑا بھلا معلوم ہوا۔ وہ افسوس کرنے لگے کہ وہ خود اپنے ساتھ کچھ لیمن چوس کیوں نہ لائے۔ اچھا پھر جب آئیں گے تب سہی۔

۴

دوسرے دن جب مجید صاحب آئے تو جمعدار صاحب کچھ چپ چاپ سے دکھائی دیے۔ صاحب نے پوچھا، ''کیا بات ہے جمعدار صاحب؟''

''کچھ نہیں۔ سار۔''

''کچھ تو۔''

''سار، میں سوچ رہے ہیں میں بھی پھر بھرتی ہو جائیں کیا؟''

صاحب نے جمعدار صاحب کو تعجب سے دیکھا اور پوچھا، ''کیوں؟''

''جنرل صاحب جو بھرتی کرنے آئے ہیں۔''

''جنرل صاحب بھرتی کرنے آئے ہیں؟''

''جی سار۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''پھر کاہے کو آئے ہیں۔''

''قحط میں کام کرنے۔''

''ملٹری تو خالی بدمعاشی کرتا ہے، ہاجرہ سے بدمعاشی کرنا چاہتا تھا اور گولی چلاتا ہے، لوگ کو مارتا ہے.... پھول محمد کو مار دیا۔''

''پھول محمد کو مار دیا؟ ملٹری نے پھول محمد کو مار دیا؟ کب؟''

''او سار بھول گیا، عمدہ میاں کو مارا— ہمارے دماغ میں پھول محمد گھوما کرتا ہے اسی سے اس کا نام ہمارے منہ سے نکل گیا۔''

مجید صاحب پھول محمد کے ذکر پر عالمِ خیال میں کچھ کھو سے گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے پھول محمد کی لاش گھومنے لگی۔ پیڑ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھی ہوئی، جمعدار صاحب کی طرف تکتی ہوئی، جمعدار صاحب بھی تھوڑی دیر کھوئے کھوئے سے رہے، جیسے بھول گئے ہوں کہ کیا بات کر رہے تھے۔ مجید صاحب نے محسوس کیا کہ پھول محمد کے اس یکایک ذکر سے جمعدار صاحب کا دبا ہوا غم کہیں ابھر نہ آئے۔ انھوں نے بات کا رخ بدلنے کے لیے کہا، ''ہاں تو آپ کیا کہہ رہے تھے۔''

''حضور میں بھول گئے۔''

''آپ فوج میں بھرتی کا ذکر کر رہے تھے، جنرل صاحب کا، آپ کیا سمجھتے ہیں کہ جنرل صاحب خود فوج میں بھرتی کرتے ہیں؟''

جمعدار صاحب کو بات یاد آ گئی، کہنے لگے، ''جی سار پہلے — پہلے تو چھوٹا لوگ بھرتی کرتا تھا، میں سمجھے شاید لڑائی بیشی ہو گیا ہے تو جنرل صاحب خود بھرتی کرنے آیا ہے۔'' ساحب ہنس دیے،

پھر انھوں نے پوچھا، ''تو آپ لڑائی پر جانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں سار سوچتے ہیں چلے ہی جائیں، ہمارا کون رہ گیا یہاں؟''

''مگر آپ تو کہتے تھے ملٹری خالی بدمعاشی کرتا ہے، گولی چلاتا ہے۔''

''میں جا کے ٹھیک کرنے کی کوشش کریں گے۔ بی بی جان لڑائی پر جانے سے غصہ ہوتا تھا، مگر شاید چھانو کی خاطر، اپنی خاطر، اب تو وہ لوگ نہیں پھول محمد بھی نہیں۔''

''اور گیدوا اور مینا ہیں؟''

جمعدار صاحب چونکے، ''میں مارے افسوس کے بھول گئے تھے، ان کا تو ہم پر حق ہے، نہیں سار، میں نہیں جائیں گے — اچھا سار اب تو میں کمانے لگے ہیں۔ انھیں یتیم خانے میں کیسے رکھیں، میں انھیں لے آئیں؟''

جمعدار صاحب کے دل سے نکلی ہوئی سیدھی سادھی باتوں سے مجید صاحب بہت متأثر ہوئے، انھیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ جمعدار صاحب بحیثیت انسان کے ان سے بہت بہتر ہیں، صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے، جمعدار صاحب نے پھر پوچھا، ''سار؟''

صاحب نے کہا، ''نہیں ابھی رہنے دیجیے، آپ اور اچھے ہو جائیں تو لے آیئے گا۔''

۵

مجید صاحب کے خلاف فردِ قراردادِ جرم بڑی لمبی چوڑی تھی، ان کے خلاف کتنی گم نام درخواستیں آ چکی تھیں، ان درخواستوں کے علاوہ چند مسلمہ واقعات بھی تھے۔ نگن بابو جیسے معزز آدمی کے گھر میں ڈاکا ڈالنے کے سلسلے سے جو لوگ ماخوذ تھے انھیں چھڑوا دیا تھا اور الٹے نگن بابو پر مقدمہ قائم کر دیا تھا۔ ان چھوڑے جانے والوں میں ایک پکا کمیونسٹ تھا۔ دوسرا چھٹا ہوا بدمعاش، انھوں نے پولیس کے اقتدار کو بھی بڑا دھکا لگایا تھا، جب حاکم ضلع خود ایسا رویہ اختیار کرے تو اچھا انتظام کیسے قائم رہ سکتا ہے، ابنیاش بابو سینٹری انسپکٹر کے خلاف انھوں نے تادیبی کارروائی کی تھی اور کب؟ جب ابنیاش

بابو مجید صاحب کی دیانت کے خلاف بیان دے چکے تھے۔ ایمناش بابو کے بیان میں اصلیت ہو یا نہ ہو، مگر شبہے کی گنجائش ضرور تھی اور کم سے کم یہ تو ظاہر ہی ہوتا تھا کہ مجید صاحب بڑے کینہ کپٹ کا آدمی ہے، پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جناب مولوی پنیر الاسلام صاحب ایم ایل اے جیسے معزز اور معتبر آدمی کے پیچھے مجید صاحب پڑے ہوئے تھے۔ ہر بات میں ان کی مخالفت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے داماد پر بھی جو گریجویٹ تھے اور ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک سنگین مقدمہ قائم کردیا تھا، ایم ایل اے صاحب کی بات کو کیسے رد کیا جاسکتا تھا۔ الغرض یہ ظاہر تھا کہ اتنی شکایتوں کے بعد مجید صاحب کو ضلع میں رکھا نہ جاسکتا تھا، کب تک مجید صاحب قحط کے انتظامات کے بل پر چلتے اور اب تو قحط بھی کم ہو رہا تھا۔ ان کا تبادلہ کیوں زیادہ دن تک ملتوی رکھا جائے، خصوصاً جب جناب خان صاحب مولوی پنیر الاسلام صاحب ایم ایل اے اس پر مصر تھے، ان کے خلاف تو تادیبی کارروائی کرنی چاہیے تھی، مگر حکومت نے بڑی چشم پوشی سے کام لیا اور خالی تبادلے کے احکام صادر فرمانے پر اکتفا کی۔

مجید صاحب کو الوداع کہنے کے لیے لوگوں نے بڑے بڑے جلسے کرنے چاہے، لیکن انھوں نے شرکت سے انکار کردیا، حتیٰ کہ جناب خان صاحب مولوی پنیر الاسلام صاحب بی اے بی ایل، ایم ایل اے بھی دو دو وفد کے رکن بن کے ائے۔ ایک وفد وکیلوں کا تھا دوسرا ضلع کی مسلم لیگ کا، دعوت دینے میں خان صاحب نے حسب معمول بڑی رطب اللسانی کی، مجید صاحب کا کہنا یہ تھا کہ الوداعی جلسے تو رسمی چیزیں ہیں، قریب قریب ہر چھوٹے بڑے افسر کے اعزاز میں کیے جاتے ہیں، اگر یہ جلسے ان کے لیے بھی ہوئے تو ان میں اور دوسرے افسروں میں فرق ہی کیا رہے گا، اُن کی یہی امتیازی شان رہے کہ اُن کے لیے کوئی الوداعی جلسہ نہ ہو۔

دوسرے اراکین وفد کے ساتھ پنیر میاں نے اس بات کے یقین دلانے کی بڑی کوشش کی کہ موزید شاب کے اعزاز میں جو الوداعی جلسے ہوں گے اُن کی امتیازی شان اس خلوص میں ہوگی جو لوگوں کی بھیگی ہوئی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز سے ظاہر ہوگا۔ موزید شاب، لوگوں کی باتیں خصوصاً

پنیر میاں کی تقریر کچھ اس طرح سن رہے تھے جیسے سن نہیں رہے ہیں، انھوں نے وہی جواب دیا جو دوسرے وفدوں کو دے چکے تھے۔ درحقیقت 'موزید شاب' کی یہ بڑی کمزوری تھی کہ وہ ان بھیگی ہوئی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آوازوں سے گھبراتے تھے۔ وہ ڈرتے تھے کہ جذبات کی طغیانی کہیں لوگوں کو بہا نہ لے جائے۔ وہ خود اپنے اندر اس طغیانی کے آثار پا رہے تھے۔ ایک طغیانی کہیں دوسری طغیانی پیدا نہ کر دے۔ وہ ایسے موقعوں سے بچنا چاہتے تھے۔ الغرض خاموشی سے بغیر کسی دھوم دھڑکے کے رخصت ہو گئے۔ ان کا جی تو بہت چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے وہ ایک دفعہ یتیم خانے، ورک ہاؤس اور قحط زدوں کے اسپتال دیکھ آئیں، مگر — نہ گئے۔ ان کا نہ جانا اچھا ہی ہوا، ورک ہاؤس میں جمعدار صاحب اور نیا میاں کا جھگڑا ہو گیا تھا، نیا میاں نے جب صاحب کے تبادلے کا ذکر کیا تو جمعدار صاحب نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا، بہت دنوں کے بعد ان کے منہ سے ڈانٹ نکلی۔ بھلا صاحب ان لوگوں کو کہیں چھوڑ سکتے تھے۔ سب جھوٹی بات۔ کسی بدمعاش نے پھیلائی ہوگی۔ ورک ہاؤس میں جتنے غریب لوگ رہتے تھے سب جمعدار صاحب کے ہم خیال ہو گئے، صرف وہی لوگ نہیں، بلکہ اور سب غریب بھی۔ اتنے دنوں سے 'موزید شاب'، 'موزید شاب' سنتے آئے تھے۔ کہ موزید شاب کو اپنے ہی طرح اس ضلع کا مستقبل باشندہ سمجھنے لگے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ ہی رہیں گے۔ نیا میاں کا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ موزید شاب نہ جائیں، مگر اس نے خبر معتبر سنی تھی۔ بالآخر اُس نے یہ کہہ کے جمعدار صاحب سے پیچھا چھڑایا کہ "اچھا صاحب آئیں گے تو پوچھ لینا۔"

۶

جب صاحب کچھ دن تک نہ آئے تو جمعدار صاحب پہلے تو سمجھے کہ شاید صاحب دورے پر گئے ہوں گے، ایسا اکثر ہوا کرتا تھا، مگر نیا میاں کی بات بالآخر ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ وہ صاحب کی کوٹھی پر گئے۔ ان سے ڈر کے مارے صاحب کے تبادلے کی خبر پوچھتے نہ بنا۔ انھوں نے ڈرتے ڈرتے چپراسی سے پوچھا، "صاحب ہیں؟"

چپراسی نے کہا، ''ہاں۔''

جمعدار صاحب کا کھلایا ہوا دل کھل گیا۔ آخر ان کی بات سچ نکلی کہ نہیں؟ بھلا غلط ہو سکتی تھی؟ نیا میاں بڑا جھوٹا نکلا، بدمعاش کہیں کا، انھوں نے پوچھا، ''صاحب اکیلے ہیں؟'' چپراسی نے کہا، ''ہاں۔'' جمعدار صاحب فوراً کمرے میں جانے لگے۔ چپراسی نے روکا، جمعدار صاحب نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ اپنے 'موزید شاب' سے ملنے جا رہے تھے۔ چپراسی کون ہوتا تھا روکنے والا۔ جمعدار صاحب کمرے میں گھس گئے۔ دیکھا تو کمرے میں بجائے 'موزید شاب' کے ایک بڑے صاحب قسم کا آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ جمعدار صاحب ٹھٹک گئے۔ صاحب نے جمعدار صاحب کو تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا، ''تم کون؟— کوئی ہے؟''

چپراسی، ''جی حضور'' کہتا ہوا آیا۔

صاحب نے پوچھا، ''یہ کون آدمی ہے؟ کیسے بغیر اجازت اندر آیا؟'

''حضور ہم منع کیا نہیں مانا۔ موزید شاب کے ٹائم میں آیا کرتا تھا۔''

''اوہ مجید نے سب کو بے ادب بنا دیا ہے، نکال دو اس کو۔''

جمعدار صاحب کا ہاتھ پکڑ کے چپراسی باہر لے گیا۔ باہر جب اس نے جمعدار صاحب کا ہاتھ چھوڑا تو وہ ایک دم سے گر پڑے۔ چپراسی نے دیکھا جمعدار صاحب کے بے تحاشا پسینہ چھوٹ رہا ہے اور بے ہوش ہوئے جا رہے ہیں، صاحب کی آواز آئی، ''کوئی ہے؟'' چپراسی جمعدار صاحب کو اسی حالت میں چھوڑ کے دوڑتا ہوا آیا، ''جی حضور۔''

''کرانی بابو۔''

چپراسی کرانی بابو کو بلا لایا۔ مارے ڈر کے جمعدار صاحب کی حالت کا ذکر نہ کر سکا۔ صاحب نے کرانی بابو کو حکم دیا، ''باہر لکھ کے لگا دو ہمارے ملنے کا ٹائم ٹن ٹو ٹویلو'' (دس سے بارہ تک)۔

''ڈیلی سر؟'' (روز جناب؟)

''نو منڈے۔ وینسڈے۔ فرائی ڈے۔'' (نہیں پیر، بدھ اور جمعہ)

''سر فرائی ڈے کو ژمہ پریر ہوتا ہے۔'' (جناب، جمعہ کو تو جمعہ نماز ہوتی ہے)

''اوڈیم۔''

''سیٹر ڈے سر؟'' (سنیچر جناب؟)

''نو، رہنے دو اچھا بات ہے، کم لوگ آئے گا ملنے۔''

۷

یہ نئے صاحب جاز ایلی صاحب تھے۔ صاحب بہادر بننے کے بعد سے وہ اپنے نام کا تلفظ یوں ہی کرتے تھے۔ ان کے والد مرحوم جو پہلے ابا سے ابا جان ہوئے تھے پھر ابا جان سے فادر اور فادر سے ڈیڈ انھوں نے تو اپنے صاحب زادے کا نام سیدھا سادھا اعجاز علی رکھا تھا اور اسی نام سے وہ آئی سی ایس میں آئے تھے، لیکن صاحب بننے کے بعد انھوں نے اپنے نام کو صاحبی شان دینی ضروری سمجھی۔ علی کو بجائے 'اے' کے 'ای' سے لکھنے لگے، اور تلفظ جاز ایلی کر دیا۔

جاز ایلی صاحب کے متعلق طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ کوئی کہتا، ''بڑا صاحب آدمی ہے۔ پانی کو 'پینی' کہتا ہے۔'' کوئی کہتا، ''لوگ عید ملنے گئے تو بولا، 'ویل کیا بات ہے؟' لوگوں نے کہا، 'سار ہمارا تہوار ہے جیسا صاحب لوگوں کا کرمس ہوتا ہے۔' بولا، 'اچھا ایسا بات ہے۔'' کوئی اس میں اتنا اضافہ اور کر دیتا کہ صاحب ''اچھا ایسا بات ہے'' کہنے کے بعد ''گڈ'' بھی بولا تھا، کوئی کہتا، ''صاحب کا بڑا بھائی ایک دفعہ آیا۔ اس کا نوکری اس سے بہت چھوٹا تھا، صاحب کو وہ اپنے آنے کی خبر تار سے دیا تھا، مگر صاحب اس کا کیسے نوٹس لیتا۔ بڑا بھائی ٹیکسی میں صاحب کے گھر آیا۔ صاحب دیکھ کے انگریزی میں بولا، 'اچھا تو ہے؟ کہاں ٹھہرا ہے؟ کل ہمارے ساتھ لنچ کھاؤ۔' بڑا بھائی کا سامان ٹیکسی میں تھا، سمجھا تھا کہ چھوٹا بھائی کے ساتھ ٹھہرے گے۔ صاحب تو اپنے خیال میں اخلاق کا بات کیا تھا، مگر اس کا بڑا بھائی غصہ ہو گیا۔ بغیر کچھ کہے چلا گیا۔ صاحب غصے کی وجہ سمجھ نہیں سکا۔ خالی اتنا سمجھ سکا کہ اس کا بھائی بہت نیٹو ہے۔ اور صاحب اس بات کا بہت افسوس کیا، افسوس دور کرنے

کے لیے صاحب اپنا قد بڑے آئینے میں دیکھنے لگا، تھوڑا دیر اپنا ٹائی ٹھیک کرتا رہا، پھر سیٹی بجانے لگا۔"

یہ تو پتا نہ چل سکا کہ یہ اور اس قسم کے بہت سے قصے کہاں تک سچ تھے، ممکن ہے لوگوں نے اپنی طرف سے گھڑے ہوں یا نمک مرچ لگائی ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ مسٹر جاز ایلی تھا بڑا صاحب آدمی۔

جاز ایلی صاحب شروع شروع میں نہ محض وضع قطع بات چیت سے اپنے آپ کو پکا صاحب ثابت کرنے کی کوشش کرتے، بلکہ اندازِ فکر میں بھی، مثلاً ہندو مسلمان میں تمیز ان کے لیے بالکل نیٹو قسم کی بات تھی، مانا کہ اگر آئی سی ایس کے امتحان کے وقت بھی ان کا نام بجائے اعجاز علی کے جاز ایلی ہوتا تو وہ آج آئی سی ایس نہ ہوتے، مگر اب تو وہ ہو گئے تھے۔ ہندو مسلمان میں تمیز کرنا آئی سی ایس کی شاندار غیر جانبدارانہ روایات کے خلاف تھا اور ان سب روایات کو ہر طرح قائم رکھنا ان کی زندگی کا بڑا مقصد تھا۔ چنانچہ جب مسلم لیگ کا چرچا شروع ہوا تو انھوں نے اُسے بھی بری نظر سے دیکھا۔ اسی نظر سے جس سے کانگریس کو دیکھتے تھے، لیکن جب انھوں نے یہ دیکھا کہ حکام بالا اس بات کو برا نہیں سمجھتے کہ کانگریس کا زور کم کرنے کے لیے مسلم لیگ تھوڑا بہت زور پکڑے تو انھوں نے انگریزوں کی طرح کبھی چشم پوشی اور کبھی نیم نگاہی سے کام لینا شروع کیا، مگر اصل مقصد مسلم لیگ کو تقویت پہنچانا نہ تھا، بلکہ حکومت انگریزی کو جس کی ملازمت عظمیٰ کے وہ جلیل القدر اور وفادار رکن تھے، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ مسلم لیگ نے سچ مچ زور پکڑنا شروع کر دیا اور وہ بھی آزادی کا مطالبہ کرنے لگی۔ مسلمانوں کی آزادی کا۔ اس کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے وزارت پر قبضہ کر لیا۔ اب جاز ایلی صاحب بقول شخصے مشکل میں گھر گئے۔ اب وہ مسلم لیگ سے وفاداری کریں یا انگریزوں سے۔ پہلی بات تھی تو بڑی نیٹو قسم کی اور اس کے خیال سے انھیں بڑی کوفت بھی ہو رہی تھی، مگر کیا کیا جائے۔ انگریزوں کی عقل ماری گئی تھی۔ انھوں نے اپنی عقل مندی سے نیٹو وزیروں کو بہت کچھ اختیارات تفویض کر دیے تھے۔ حتیٰ کہ اراکین ملازمت عظمیٰ کے مستقبل کو بنانے بگاڑنے میں بھی ایک حد تک دخل در معقولات

کرنے کا انھیں حق دے دیا تھا۔ جاز ایلی صاحب کو یہ مستقبل سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اگر وہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو خالی انگریزوں ہی کو خوش رکھنے سے کام نہ چلے گا، بلکہ ان مسلم لیگیوں کو بھی خوش رکھنا پڑے گا۔ لہٰذا مصلحت وقت کا تقاضا یہ تھا کہ کچھ کچھ ظاہرداری برتی جائے۔ آخر انگریز اس قسم کی ظاہرداری برت ہی رہے تھے۔ اب جاز ایلی صاحب کو بادلِ ناخواستہ اپنی بلند سطح سے اترنا پڑا۔ ان کی زبان پر وقت بے وقت 'مسلمان، مسلم لیگ' کے الفاظ آنے لگے۔ ایک شیروانی بھی انھوں نے بنوالی۔ انگریزی لب و لہجے میں اردو بولنا بھی رفتہ رفتہ کم کردیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے دیوانِ غالب کا مطالعہ بھی شروع کردیا۔ ان کا اردو کا ذوق اتنا بڑھا کہ وہ غالب کو اور شیکسپیئر، (ہمارا شیکسپیئر) کہنے لگے۔

جاز ایلی صاحب اور مجید صاحب تھے تو ایک ہی ملازمت کے ارا کین، لیکن ایک آگ تھا تو دوسرا پانی، پانی کے چھینٹوں سے اگر آگ چھن سے ہوجائے تو اس میں قصور پانی کا ہے آگ کا نہیں۔ چنانچہ قصور مجید صاحب ہی کا تھا، جاز ایلی صاحب تو ملازمتِ عظمیٰ کی سچی نمائندگی کررہے تھے، یہ مجید صاحب ہی تھے کہ اس میں گڑبڑ پیدا کیا کرتے تھے۔ جاز ایلی صاحب جب مجید صاحب کی جگہ مقرر ہو کے آئے تو انھیں اس بات کی تو تکلیف ہوئی کہ وہ مجید صاحب جیسے گھٹیا افسر کی جگہ آئے تھے، مگر خوشی اس بات کی تھی کہ اب انھیں مجید کو اچھی طرح رگڑ دینے کا خوب موقع ملے گا۔ انھوں نے مجید صاحب کے کام کو اسی نظر سے دیکھا جس سے انھیں دیکھنا چاہیے تھا۔ وہ پہلے ہی سے سمجھے تھے کہ مجید نے ضرور گڑبڑ کی ہوگی۔ پہنچتے ہی اس کی تصدیق ہوئی۔ کیا فضول اسپتال، ورک ہاؤس اور یتیم خانوں کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ اتنی تعداد تو کسی ضلع میں نہ تھی۔ یہ فضول خرچی تھی۔ اسے بند نہیں تو کم ضرور کرنا چاہیے۔ انھوں نے اپنی پہلی ہی رپورٹ میں مجید صاحب کی بدانتظامیوں اور فضول خرچیوں کا تفصیلی ذکر کیا اور یہ بھی لکھا کہ لوگ بڑے بے ادب ہوگئے ہیں۔ مخدومِ ضلع سے خادم بننے کی امید کیا کرتے ہیں۔ ایک عجیب جمہوری لغویت پھیلی ہوئی ہے۔ انھیں ان سب کا قلع قمع کرنے میں ایک مدت لگے گی۔

۸

جازایلی صاحب نے رپورٹ تو بھیج دی تھی، مگر اب تک اسپتالوں، ورک ہاؤسوں اور یتیم خانوں کا معائنہ نہ کیا تھا۔ انھیں دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ گھر بیٹھے ہی خیال کر سکتے تھے کہ کس قسم کی گندگی اور بدنظمی پھیلی ہوئی ہوگی، مگر جنرل صاحب ایک دفعہ پھر دورے پر آئے اور جازایلی صاحب سے ان اداروں کے حسن انتظام کی بڑی تعریف کرنے لگے۔ نہ صرف یہ ادارے سب سے پہلے اس ضلع میں شروع ہوئے تھے، بلکہ ان کا انتظام بھی سب ضلعوں سے اچھا تھا۔ جنرل صاحب نے کہا، ''میں نے تو گورنمنٹ سے سفارش کی ہے کہ دوسرے ضلعوں کے کلکٹروں کو یہاں کا انتظام دیکھنے کے لیے بھیجا جائے۔'' جازایلی صاحب کو مجید صاحب کی یہ تعریف اور وہ بھی ایک انگریز جنرل کے منہ سے بہت بری لگی۔ انھوں نے ہنس کے کہا، ''تو آپ بھی مجید کے پروپیگنڈے کے شکار ہو گئے؟''

جنرل صاحب نے کہا، ''نہیں یہ بات نہیں ہے، مجھ سے پہلے یہی کہا گیا تھا اور میں نے بہت سی جگہوں کا اچانک معائنہ بھی کیا، لیکن ہر جگہ انتظام دوسرے ضلعوں سے بہت اچھا پایا۔''

''میں تو سمجھتا ہوں مجید نے گورنمنٹ کا قیمتی روپیا ضائع کیا۔ اب آپ ایسا کہتے ہیں تو خیر چلیے دیکھیں۔''

''آپ نے کیا اب تک نہیں دیکھا۔''

جازایلی صاحب ذرا سٹپٹائے، ''نہیں دیکھا کیوں نہیں، اب آپ کے ساتھ پھر سہی۔''

جنرل صاحب اور جازایلی صاحب یتیم خانے پہنچے۔ یہ سن کے کہ کلکٹر صاحب آئے ہیں بچے بھر بھر دوڑے ''موزید شاب جندہ باد''، ''موزید شاب جندہ باد'' چیختے ہوئے۔ گیدڈ اور مینا بھی بڑے شوق سے لڑھکتے چلے آرہے تھے۔ جازایلی صاحب ''موزید شاب جندہ باد''، ''موزید شاب جندہ باد'' پر ذرا چونکے۔ یتیم خانے کے سپرنٹنڈنٹ نے کہا، ''ارے موزید شاب نہیں'' (انھیں نئے صاحب کا نام معلوم نہ تھا)، ''خالی بڑا صاحب جندہ باد کہو۔'' مگر بچوں کی زبان پر موزید شاب کا نام چڑھا ہوا تھا۔

شروع جو کیا تو پھر موز ید شاب سے، سپر نٹنڈنٹ کے ڈانٹے پر 'خالی بڑا شاب' کر دیا۔ جنرل صاحب نے کہا، کیا بولتا ہے۔ سپر نٹنڈنٹ نے کہا، ''سار، بڑا شاب کو زندہ باد بولتا ہے۔''

جازایلی صاحب نے دیکھا بچوں کی بڑی خستہ حالت ہے، کچھ تو بالکل ننگے دھڑ نگے ہیں، کچھ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہیں اور میلے کچیلے سب کے سب ہیں۔ انھوں نے جنرل صاحب سے کہا، ''دیکھا آپ نے؟ میں نہیں کہتا تھا؟ سرکاری یتیم خانوں میں بچوں کو اس طرح رہنا چاہیے؟''

جنرل صاحب نے کہا، ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے یہاں کے انتظام میں۔''

''پہلے مجید آپ لوگوں کے دکھانے کے لیے لیپ پوت کر دیا کرتا تھا۔ میں نے آنے کی کوئی اطلاع نہ دی اور نہ لیپ پوت کا حکم ہی دیا تا کہ اصلی حالت معلوم ہو۔''

''آپ نے پہلے بھی یہی دیکھا تھا؟''

ہچکچا کے، ''جی ہاں۔''

''پھر آپ نے تادیبی کاروائی نہیں کی؟''

جازایلی صاحب پھر ٹپٹا گئے، بولے، ''مجید نے انتظام اتنا خراب کر دیا ہے کہ اسے درست کرنے میں وقت لگے گا۔''

سب بچے مع گیدوا اور مینا کے دیکھ رہے تھے۔ ان سے کس نے کہہ دیا تھا کہ یہاں کلکٹر صاحب آئے ہیں؟ کلکٹر صاحب تو یہاں نہیں، معلوم نہیں کون ہے، گیدوا اور مینا گھبرا کے رونے لگے۔ جنرل صاحب گزشتہ دفعہ کا نقشہ دیکھ کے اپنے ساتھ لیمن چوس لائے تھے۔ انھوں نے بڑھ کر گیدوا اور مینا کو دینا چاہا، گیدوا اور مینا مارے ڈر کے گر پڑے۔ سپر نٹنڈنٹ صاحب چیخے، ''ڈرومت، صاحب لیمن چوس دے رہے ہیں۔''

لیمن چوس کے نام پر بچے ذرا چونکے۔ ہوش حواس مجتمع ہوئے۔ جنرل صاحب نے لیمن چوس سپر نٹنڈنٹ صاحب کو دے دیا۔ انھوں نے بچوں کو دیا۔ بچے کرر کرر کھانے لگے۔

ورک ہاؤس میں بھی 'موزید شاب جندہ باڈ' کے نعروں سے جنرل صاحب اور جاز ایلی صاحب کا استقبال کیا گیا۔ نیا میاں نے اصلاح کی کوشش کی، مگر جمعدار صاحب اَڑ گئے۔ انھوں نے مجید صاحب کا نعرہ خود بھی لگایا اور دوسروں سے بھی لگوایا، اور خوب زور زور سے۔ جاز ایلی صاحب کو بہت برا لگا۔ یہاں نعرے اتنے صاف لگ رہے تھے کہ جنرل صاحب بھی سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے کہا، ''مجید واقعی بڑا ہر دل عزیز تھا۔'' جاز ایلی صاحب نے جواب دیا، ''سستی قسم کی ہر دل عزیزی بڑی آسان چیز ہے۔''

جنرل صاحب نے کہا، ''یہاں ایک سپروائزر تھا جو پہلی جنگ عظیم میں ہو آیا تھا، کہاں ہے۔''

جاز ایلی صاحب کو خبر نہ تھی۔ پوچھا، جمعدار صاحب پیش کیے گئے۔ انھوں نے جنرل صاحب کو سلیوٹ کیا۔ جاز ایلی صاحب کا کوئی نوٹس نہ لیا۔

جنرل صاحب نے پوچھا، ''آپ کیسا ہے؟ اچھا ہے؟''

جمعدار صاحب، ''نہیں سار۔ جب سے ہمارا 'موزید شاب' گیا ہے ہم لوگ تو مر گیا۔''
(فرطِ جذبات سے بجائے مجید صاحب کے منہ سے موزید شاب نکلا۔)

۹

جنرل صاحب کے جانے کے بعد جاز ایلی صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ جمعدار صاحب کو برخاست کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ مجید صاحب نے جن لوگوں پر مظالم ڈھائے تھے ان کے ساتھ بھی جاز ایلی صاحب نے انصاف کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو نگن بابو پر جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا وہ خارج ہوا۔ ابیناش بابو کے خلاف جو تادیبی کارروائی شروع کی گئی تھی وہ منسوخ کی گئی۔ سلطان میاں پر جو مقدمہ چل رہا تھا وہ اٹھا لیا گیا۔ اس کے علاوہ اسپتال، ورک ہاؤس اور یتیم خانے آدھے سے زیادہ بند کر دیے گئے۔ الغرض ضلع میں پہلا سا امن چین پھر ہو گیا، اور ہاں مسلم لیگ والنٹیروں کو راشن کی دکان بھی مل گئی، جس سے ثابت ہو گیا کہ جاز ایلی صاحب پکا صاحب بہادر ہونے کے باوجود دل میں مسلمانوں اور مسلم لیگ کا سچا درد رکھتا ہے۔ پہلے پہل صاحب کے کانوں میں دل خوش کن

آواز آئی، ''جاز ایلی صاحب جندہ باد'' خان صاحب مولوی پنیر الاسلام بی اے بی ایل، ایم ایل اے مع اپنے رفقا کے کوٹھی کے باہر یہ نعرہ لگاتے جا رہے تھے۔ جاز ایلی صاحب نے رپورٹ بھیجی کہ اس ضلع میں سب سے معزز سب سے اچھے اور کام کے آدمی خان صاحب مولوی پنیر الاسلام ایم ایل اے ہیں جنھیں خان بہادر ہونا چاہیے۔

۱۰

مسلم لیگ کی روش کچھ کچھ مشکوک ہونے لگی تھی۔ اس بات کا احتمال پیدا ہو چلا تھا کہ حکومت برطانیہ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت نہ کر بیٹھے۔ قابل اعتماد افسروں کی ایک کانفرنس کلکتہ میں بصیغۂ راز منعقد کی گئی۔ جس میں اس امر پر غور کیا گیا کہ اگر مسلم لیگ نے بھی کانگریس کی روش اختیار کی تو کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے گا۔ جاز ایلی صاحب کو مسلمان افسروں کی واحد نمائندگی کا شرف حاصل ہوا، ان کی طرف امید افزا نگاہوں سے دیکھا گیا۔ یہ نگاہیں ان کے دل پار ہو گئیں۔

انھوں نے کہا، ''اصولی بات تو یہ ہے کہ اگر مسلم لیگ بھی کانگریس کی سی ہو جائے تو اسے بھی اسی طرح کچل دینا چاہیے۔''

''مگر بنگال میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے، ان پر مسلم لیگ کا اثر بھی ہے، وہ کس حد تک گڑبڑ پیدا کر سکتے ہیں؟''

''زیادہ نہیں بشرطیکہ تحریک کو آہنی ہاتھوں سے کچلا جائے۔''

''آہنی ہاتھ'' کہتے وقت جاز ایلی صاحب نے اپنی آہنی مٹھی زور سے میز پر ماری۔ جاز ایلی صاحب حکومت کے آہنی ڈھانچے کی آہنی روایات برقرار رکھنے کے لیے واقعی سب سے زیادہ موزوں تھے۔

جاز ایلی صاحب نے کلکتہ سے واپسی پر خان صاحب مولوی پنیر الاسلام ایم ایل اے کا عندیہ لیا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ ان کی وفاداری تمام و کمال حکومت وقت خاص طور سے حاکم ضلع

کے ساتھ ہے۔ اس وقت چونکہ حکومت مسلم لیگ کی ہے اس لیے وہ مسلم لیگی ہیں اگر مسلم لیگ کی حکومت نہ رہی تو جس کی حکومت رہے گی وہ اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ انھیں درحقیقت حکومت کی پارٹی کا ممبر سمجھنا چاہیے اور تاجِ برطانیہ کی وفادار رعایا۔

جاز ایلی صاحب نے پوچھا، ''آپ کے خیال میں کتنے لوگ اس خیال کے ہوں گے؟''

''حضور کے اقبال سے قریب قریب سارا ضلع — ہاں دو ایک بدمعاش قسم کے لوگ جیسے ذلیل الدی البتہ کچھ گڑبڑ پیدا کر سکتے ہیں۔''

''کون ذلیل الدی۔''

''ایک ڈاکو ہے وہی نگن بابو کے مقدمہ والا، موز ید شاب نے اسے سر پر چڑھا لیا تھا۔''

''اوہ مجید نے تو ناک میں دم کر دیا، خیر کوئی پروا نہیں۔ اسے کچل دیا جائے گا۔''

خان صاحب مولوی پنیر الاسلام خوش خوش گھر گئے۔ جاز ایلی صاحب بھی خوش تھے کہ انھوں نے کانفرنس میں جو رائے دی تھی وہ کتنی صحیح نکلی۔

پنیر میاں نے عقلمندی سے کام لیا اور لڑکوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہا۔ لڑکے بہت بگڑے۔ انھوں نے کہا، اگر مسلم لیگ پر ہاتھ ڈالا گیا تو سارے بنگال کے دریاؤں میں بجائے پانی کے خون بہنے لگا اور جو لوگ انگریزوں کا ساتھ دیں مع پنیر میاں کے انھیں پہلے ذبح کیا جائے گا۔ پنیر میاں گھبرا گئے۔ ان کا حلق سوکھنے لگا۔ بالآخر انھوں نے کہا، ''شاباش! شاباش! میں تو تم لوگوں کا امتحان لے رہا تھا۔ میں خود سب سے پہلے مسلم لیگ کے لیے اپنا خون بہاؤں گا۔'' یہ کہتے کہتے خان صاحب مولوی پنیر الاسلام ایم ایل اے جوش میں آ گئے۔ انھوں نے ایک دھواں دھار تقریر کر ڈالی، اور آخر میں پھر وہی سب سے پہلے اپنا خون بہانے والی بات کہی۔ لڑکوں نے نعرہ لگایا، ''مولوی پنیر الاسلام ایم ایل اے جندہ باد۔''

☯......☯......☯

چودھواں باب

بنگال کا جادو شباب پر تھا۔ آسمان کے سر پر چڑھ کے بول رہا تھا۔ زمین کے سر پر چڑھ کے بول رہا تھا۔ گھٹاؤں کے بھیس میں پریاں قطار اندر قطار آ رہی تھیں۔ رنگ برنگ کی ساریاں پہنے، طرح طرح کے ڈوپٹے اوڑھے، گوٹے لچکے سے آراستہ پیراستہ، کسی رنگین مزاج نے پوری قوس و قزح ہی اٹھا کے زیب تن کر لی تھی۔ کسی چنچل نے لپک کے بیچ بیچ کی تڑپتی ہوئی بجلیاں اپنے آنچل میں ٹانک لی تھی۔ اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے، پیرہن والی آب و رنگ و نور کی پریوں کی مسکراہٹ پھواری کی صورت میں رم جھم رم جھم برستی، کبھی کالے کالے دیوؤں کی ڈل بادل پہاڑ کے پہاڑ اینڈتے ہوئے، گرجتے ہوئے چھا جاتے ہیں۔ جب یہ قہقہے لگاتے تو موسلا دھار بارش ہونے لگتی۔ اُدھر آسمان کی یہ کیفیت تھی ادھر زمین پر سبزہ لوٹ رہا تھا۔ درخت جھوم رہے تھے۔ پھول پتیاں جھولا جھول رہی تھیں۔ چڑیاں محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھیں۔ چہکتی ہوئی، گاتی ہوئی۔ سب چھوٹے بڑے دریا موجیں مار رہے تھے۔ کشتیاں بادباد اُڑاتی اُڑی چلی جا رہی تھیں۔ باد باد بادمراد سے بھرتے ہوئے تھے اور بادمراد بھٹیالی کے راگ سے، قبروں پر سبز مکمل کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ مخمل جس سے پھول خود بخود پھوٹ نکل کے رہے تھے۔ چھانو کی قبر پر، بی بی جان کی قبر پر، پھول محمد کی قبر پر، اور ہاں ایسی قبروں پر بھی جن میں سونے والوں کا نام کسی کو معلوم نہ تھا۔

قدرت واقعی بڑی فیاض اور فراخ دل واقع ہوئی تھی۔

۲

ایک کشتی بہت سے مسافروں سے لدی پھندی چلی جا رہی تھی۔ مسافر جگہ جگہ چڑھ اُتر رہے تھے۔ مسافروں میں جمعدار صاحب بھی تھے اور گیدوا ور مینا بھی۔ کشتی دھان کے کھیتوں پر سے

گزر رہی تھی۔ جمعدار صاحب ایک طرف بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ کشتی جب دھان کے پودوں پر سے گزر جاتی تو پودے پھر سے سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے۔ اس منظر میں کچھ عجیب جادو تھا۔ جمعدار صاحب کچھ اس طرح دیکھتے رہے جیسے کسی نے انھیں جادو کر دیا ہو۔ آہستہ آہستہ ان کے دماغ میں یہ خیال انگڑائی لینے لگا کہ انسان ان دھان کے پودوں سے گئے گزرے تو نہیں۔ ان پودوں کے سروں پر سے جب کشتی گزرتی ہوگی تو ان کا بھی وہی حال ہوتا ہوگا جو انسان کا جنگ و قحط کی بلاؤں کے گزرنے سے ہوتا ہے، لیکن اب تو بلائیں گزر چکی تھیں۔ اب انھیں بھی سر اٹھانا چاہیے۔ انھیں جیگل کی بنی ہوئی اس میز کا خیال آیا جس میں از سرِ نو کونپلیں پھوٹ نکلی تھیں۔ جمعدار صاحب خود بھی ان پودوں کی طرح انگڑائیاں لینے لگے اور کشتی میں سر اونچا کر کے کھڑے ہوئے۔ ان کے پاس ورک ہاؤس کی کمائی کے دو سو روپے تھے۔ اتنے روپے ان کے پاس بیک وقت کم آئے تھے۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے اور وہ بھی فقیرانہ شان سے یہ روپے بہت کافی تھے۔ کشتی گھوڑا مارا کے ٹلوں کے پاس سے گزر رہی تھی، مگر گھوڑا مار کچھ بدلا بدلا سا نظر آ رہا تھا۔ کئی نئے نئے پکی دیواروں اور ٹین کی چھت والے مکان نظر آ رہے تھے۔ کشتی سرت ساہا کی دکان والے ٹیلے کے پاس رکی۔ مسافر اترنے چڑھنے لگے۔ سرت ساہا کنارے کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے جمعدار صاحب کو نمسکار کیا، جمعدار صاحب نے بڑی طمانیت سے جواب دیا۔ سرت ساہا نے سنا تھا کہ جمعدار صاحب ورک ہاؤس میں سپروائزر ہو گئے ہیں اور اچھا خاصا کما رہے ہیں۔ اُس نے کہا، ''کاکا آئے گئے؟ بڑا اچھا کیا۔''

جمعدار صاحب ایک پکی دیواروں اور ٹین کی چھت والے مکان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پوچھا، ''یہ کس کا ہے۔''

سرت، ''کاکا یہ آپ ہی کی دکان ہے۔''

''اچھا۔''

''آپ تب نہیں تھے کیا۔ ہاں آپ کے جانے کے بعد بنی، آ کے دیکھیے گا۔ بھگوان کی کرپا

سے اب اس میں بہت سی چیزیں ہیں (گیدوا اور مینا کی طرف دیکھ کے) اور لیمن چوس بھی بہت طرح کے ہیں۔ گھوڑا مارا پر لکشمی جی کی بڑی دیا رہی۔ بہت سے نئے نئے مکان بن گئے ہیں۔ پنیر میاں کے مکان کی دیوار بھی پکی ہوگئی ہے اور نگن بابو کے مکان کی بھی اور ابھے بابو ڈاکٹر کے مکان کی بھی ـــــ اور ہاں پنیر میاں کا اسکول بھی پکا بن رہا ہے۔''

جمعدار صاحب کچھ کھوے گئے، جیسے کسی سوچ میں پڑ گئے ہوں۔ پھر انھیں خیال آیا کہ اگر رات نہ ہوتو دن کی کیا قدر، اور پھر کون جانے رات کے اندھیرے میں کیسے کیسے سانپ بچھو چھپے ہوں، اور یہ بات بھی تو ہے کہ رات کا اندھیرا جب تک اپنی انتہا کو نہیں پہنچتا سحر کی ابتدا نہیں ہوتی۔

اتنے میں جلودھر آ گیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے جمعدار صاحب کا خیر مقدم کیا اور ذرا مسکرا کر کہا، ''کاکا، دیکھیے، بغیر آپ کی مدد کے بھی روس نے جرمن کو ہرا دیا۔ آپ تو خالی منہ توڑتے، روس نے ہڈی پسلی توڑ ڈالی۔''

سرت، ''تو بھیا کیا لڑائی سچ مچ ختم ہوگئی؟''

جلودھر، ''ہاں، جرمنی نے ہتھیار ڈال دیے۔''

سرت، ''ہائے رام! اب کیا ہوگا؟ بازار تو مندا نہ پڑے گا؟''

جلودھر، ''اب یہ چنتا جانے دو، اب یہ چنتا کرو کہ تم لوگوں کا کیا ہوگا، روس کی جیت کا مطلب یہ ہے کہ اب دنیا بھر میں غریبوں کا راج ہو جائے گا اور دھنی لوگوں کو گولی ماردی جائے گی۔ ہماری بات مانو تو ہمارے ساتھ ہو جاؤ، تب شاید جان بچ جائے۔''

سرت، ''اور دھن؟''

جلودھر ہنس پڑا۔ جمعدار صاحب کے ہونٹوں تک بھی مسکراہٹ آ گئی۔

جلودھر نے جمعدار صاحب سے کہا، ''کاکا، اب کیا ارادہ ہے، اب تو آپ کی آنکھ کھل گئی ہوگی، آپ نے دیکھا یہ دنیا کتنی بری ہے، آیئے ہم لوگ مل کے اس کا نقشہ بدل دیں۔''

جمعدار صاحب خاموش رہے۔ جلودھر نے پھر کہا، ''کاکا؟'' جمعدار صاحب نے کہا،

''ہاں ٹھیک ہے۔ پہلے تم اپنی زندگی تو بدلو، جب تک خود نہ بدلو گے تب تک دنیا کو کیسے بدل سکتے ہو۔''

''کاکا ہم بھی تو یہی کہتے ہیں ہم نے تو اپنی زندگی بدل دی، آپ بھی بدلیے۔''

''تم سمجھ نہیں رہے ہو، ہماری زندگی بھی بدل گئی ہے، مگر تمھاری طرح نہیں، ہم چاہتے ہیں کہ تمھاری زندگی بھی ہماری طرح بدل جائے۔''

''جب ایک ہی ہونا ہے تو چاہے آپ کی زندگی ہماری طرح بدلے چاہے ہماری آپ کی طرح، بات ایک ہی ہے۔''

''نہیں ایک ہی بات نہیں ہے، اچھا پھر بات کریں گے، قمیص کہاں ہے؟''

''آپ دیکھیے گا تو کہیے گا۔ بڑا اچھا کام کرنے والا نکل رہا ہے۔''

''اور مخلص میاں؟''

''کون؟ مکلیشور؟ اسے تو آج کل مذہبی جنون ہو گیا ہے۔ ایک دن نماز پڑھتے پکڑا گیا۔ اسے پارٹی سے نکال دیا گیا ہے۔''

جمعدار صاحب کا چہرہ سے خوشی سے چمک اٹھا اور ان کے منہ سے بے اختیار ''الحمدللہ'' نکل گیا۔

کشتی روانہ ہوئی۔ جمعدار صاحب کے ٹیلے کے پاس پہنچی۔ جمعدار صاحب اُتر پڑے۔ ٹیلہ ویران پڑا تھا۔ صرف مولوی نورالابصار کے گھر سے خوش حالی ٹپک رہی تھی اور مکان پر ٹین کی چھت پڑ گئی تھی۔ باہر دو دو گائیں بندھی کھا رہی تھیں۔ ایک گائے موتی سے ملتی جلتی تھی۔ بچے ہمک ہمک کے دودھ پی رہے تھے۔ جمعدار صاحب اس گائے کو جا کر تھپتھپانے لگے جو موتی کی طرح تھی۔ اتنے میں مولوی نورالابصار نکل آئے۔ بڑے جوش سے بغل گیر ہوئے۔ جمعدار صاحب نے پوچھا،

''آپ یہ گائے کہاں سے لیا؟''

''میلے سے۔''

''کتنا دودھ دیتا ہے؟''

''سیر ڈیڑھ سیر۔''

''ہمارا موتی ڈیڑھ دو سیر دیتا تھا۔''

''اپ کا گھر تو اُجڑ گیا۔ کچھ دن ہمارے ساتھ رہیے۔''

''نہیں شکریہ۔ میں اب اسے پھر سے ٹھیک کریں گے۔''

جمعدار صاحب کے مکان میں بہار آئی ہوئی تھی، در و دیوار سے سبزہ اُگ رہا تھا۔ صحن میں اونچی اونچی گھاس لہرا رہی تھی۔ جنگلی پھول کھل رہے تھے۔ بی بی جان اور چھانو کی قبریں اس کی آغوش میں چھپی ہوئی تھیں۔ دونوں دھنس گئی تھیں۔ جمعدار صاحب کے والد صاحب کی پکی قبر بھی ٹوٹی پھوٹی پڑی تھی۔ اس کی بہت سی اینٹیں غائب تھیں۔ جمعدار صاحب نے پہلے فاتحہ پڑھی۔ پھر اپنے ہاتھ سے قبر کی گھاس اکھاڑی اور درخت سے کچھ پھول توڑ کے تینوں قبروں پر چڑھائے۔ انھیں پھول محمد کا خیال بھی آ گیا۔ اس کے نام سے بھی انھوں نے ایک پھول توڑ کے چھانو کے سرہانے رکھ دیا۔ گھر کے ویرانے میں کوئی ایسی نہ ملی جہاں جمعدار صاحب مع گیدو اور مینا کے رات گزار سکتے۔ اپنی مسجد جا کے دیکھی، اس کا دروازہ بھی چوری ہو گیا تھا، مگر در و دیوار سلامت تھے۔ جمعدار صاحب نے اپنے ہاتھ سے جھاڑو دی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ انھوں نے بآواز بلند اذان دی۔ آواز میں بڑی جان تھی، تڑپ تھی، سوز تھا، عزم تھا، ولولہ تھا، جیسے کوئی مجاہد اذان دے رہا ہو۔ رات کو جمعدار صاحب وہیں سو رہے، گیدو اور مینا کے ساتھ۔

صبح تڑکے جمعدار صاحب ایک دھان کے اونچے کھیت میں پرانے معمول کے مطابق بیٹھے ہوئے تھے۔ نسیم سحر کا دامن دھان کی بالوں سے رگڑ کھاتا ہوا اُڑ رہا تھا۔ دھان کی بالوں میں شبنم کے موتی پروئے ہوئے تھے۔ پھل سنگنیاں اُڑ اُڑ کے ان شبنمی موتیوں کو چن رہی تھیں۔ چنتی تھیں چہکتی تھیں اور پھر سے اُڑ جاتی تھیں۔ ایک چوہیا ایک پودے پر چڑھی دھان چرا رہی تھی۔ جمعدار صاحب جب فراغت کے بعد کھڑے ہوئے تو ان کی نظر چوہیا پر پڑی۔ ان کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بدھنا تھا۔

چوہیا پر نظر پڑتے ہی بدھنا انگلی سے پھسانے لگا۔ جمعدار صاحب کی نظر چوہیا پر دوبارہ پڑی۔ وہ دھان سے اپنا چھوٹا سا منہ بھرے لے رہے تھی۔ جمعدار صاحب دیکھ کے مسکرانے لگے۔ بدھنے کو انھوں نے پھینکنے کے انداز میں اٹھایا— زور سے پھینکا— مگر دور، چوہیا سے بہت دور۔ جمعدار صاحب کو ایسا محسوس ہوا جیسے پھول محمد مسکرا رہا ہے، بی بی جان مسکرا رہی ہیں۔ ساری کائنات مسکرا رہی ہے۔ کارکنان قضاوقدر مسکرا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ خالق کائنات بھی مسکرا رہا ہے۔ یہ مسکراہٹ جمعدار صاحب کی رگ رگ میں سما گئی اور دل سے گنگناہٹ بن کر ہونٹوں تک آ گئی۔ مدتوں کا بھولا ہوا نغمہ دل کی گہرائیوں سے پھر اُبھر آیا۔ جمعدار صاحب گنگانے لگے، ''بلبل کا چین چین میں آواز مرحبا ہے۔''

چوہیا نے جو یہ آواز سنی تو وہ گھبرا کر جھٹ سے بل میں جا چھپی۔

☯......☯......☯
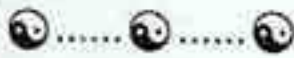
بارے ناول کا کچھ بیاں ہو جائے

(فضلی احمد کریم فضلی)

عمر گزراں کے نہایت قیمتی بیس بنگال میں گزرے۔ اس دوران میں یہاں کے بیشتر اضلاع میں جانے کا اتفاق ہوا اور اس کاروان حیات کو جو یہاں گرم سفر تھا، بہت قریب سے دیکھنے کے موقعے ملے۔ یہ گریز پا کارواں گزرنے کو تو گزرتا جاتا تھا، لیکن دل و دماغ اس کے فرش پا انداز تھے جس پر اس کے نقشِ پا چپکے چپکے ثبت ہوتے جاتے تھے۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ در نظر گزرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گزرد

سب سے گہرے نقوش زندگی کے اس گرتے، پڑتے، دم توڑتے کارواں نے چھوڑے جو قحط کا مارا ہوا تھا۔ زندگی کیا موت، اس کارواں کی حالت ضلع فرید پور میں سب سے زیادہ خستہ و زار تھی جہاں مصنف اس زمانے میں تعینات ہوا۔ جو مناظر نظر سے گزرے وہ ایسے نہ تھے کہ دل و دماغ کی بنیادوں کو ہلائے بغیر گزر جاتے۔ مصنف کی کچھ ایسی کیفیت ہوئی کہ قلم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ لکھنے کو تو کئی صفحے لکھ گیا، لیکن یہ محسوس کرنے لگا کہ لہجہ ایسا تند و تیز، تلخ و درشت، بلکہ کرخت ہوتا جا رہا ہے کہ بارگاہِ ادب میں بے ادبی کے مترادف ہے اور اندازِ بیاں میں وہ فنکارانہ حسن، وہ تحمل و تجمل، وہ رچاؤ اور گھلاوٹ نہیں جو روح و روانِ خوش ادبی ہیں۔ اس احساس نے مصنف کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔

کئی سال تک قحط کے تأثرات تحت الشعور و لاشعور میں ڈوبتے ابھرتے رہے اور غیر محسوس طریقے پر ان کی کاٹ چھانٹ، تہذیب و ترتیب کا سلسلہ جاری رہا۔ ۴۶ء میں قتل و غارت کی وبا ملک میں پھیلنے لگی۔ مگر وہ محض تلخیِ کام و دہن کی آزمائش نکلی۔ رگ و پے میں زہر غم اس وقت اترنے

لگا جب پنجاب میں قیامت آئی۔ اس کے بعد تو یہ زہر روح کی گہرائیوں میں بھی اترتا چلا گیا۔ اس زہر کے اثرات قحط کے تأثرات سے خلط ملط ہونے لگے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ قحط کے تأثرات سپردِ قلم کر دیے جائیں۔ چنانچہ ''خونِ جگر ہونے تک'' پیشِ خدمت ہے۔

اس ناول کی ابتدا دوسری جنگ عظیم سے ہوتی ہے اور اس کا اختتام جنگ کے خاتمے پر۔ دوسرا ناول ''سحر ہونے تک'' ۴۵ء سے ۴۷ء کے انقلاب آفریں عہد سے متعلق ہوگا اور تیسرا ''سحر ہونے کے بعد'' نشاطِ صبح گاہی اور اس کے ردِعمل سے، آخرالذکر بہ وجوہ ظاہر اسی وقت منظرِ عام پر آ سکے گا جب مصنف قیدِ ملازمت یا قیدِ حیات سے آزاد ہو چکا ہوگا۔

اس ناول کے کرداروں کا وجود مصنف کے عالمِ خیال کے علاوہ کہیں اور نہیں۔ نام البتہ سب کے سب اصلی ہیں۔ افراد کے بھی مقامات کے بھی، لیکن یہ افراد و مقامات صرف فرید پور ہی سے نہیں، بلکہ تمام بنگال سے لیے گئے ہیں، مثلاً مستنصر باللہ نواکھالی سے، بجیر باپ مومن شاہی (میمن سنگھ) سے، قیس محمد رنگ پور سے اور پنیر الاسلام شمالی اضلاع سے۔ یہی حال واقعات کا بھی ہے۔ وہ بھی بڑی حد تک اصلی ہیں اور اکثر فرید پور سے متعلق ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو مختلف اضلاع میں مصنف کے علم میں آئے، مثلاً نگن بابو کے گھر میں ڈاکے کا واقعہ ضلع ٹپرا کا ہے اور لانچ کی دوڑ کی جزئیات جیسور، فرید پور اور ڈھاکے سے لی گئی ہیں۔

مصنف نے بنگال کی دیہاتی زندگی کو دیانت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق کی دلچسپ آویزشوں کو جنھیں لازمۂ ناول نگاری سمجھا جاتا ہے اور جن سے مصنف کو بھی غزل گو کی حیثیت سے فطری لگاؤ ہے نظر انداز کرنا پڑا، کیونکہ بنگال کے مسلمانوں میں عموماً عاشقی قیدِ شریعت کے اندر رہا کرتی ہے، باہر نہیں۔ عموماً داستان حسن و عشق ناولوں میں اس لیے رکھی جاتی ہے کہ یہ خود اپنی جگہ بڑی دلچسپ چیز ہے اور اس کے ذریعے سے قصے کو دلچسپ بنانے میں زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ اس کی مدد کے بغیر ناول کو دل آویز بنانا گویا جوئے شیر لانا ہے۔ فرہاد کا انجام معلوم، لیکن اگر کوہکنی کے علاوہ چارہ ہی نہ رہ جائے تو پھر تیشہ اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ ویسے تو اس ناول میں بھی حسن و عشق کے بہت سے مظاہر ملیں گے۔ حسن آخر حسن صورت ہی تک تو محدود نہیں، کردار میں بھی

حسن ہوتا ہے، مناظر میں بھی، حتیٰ کہ بلاؤں میں بھی۔ اسی طرح عشق میں بھی صرف عشق زلیخا ہی نہیں، بلکہ عشق یعقوب بھی ہے۔ جنسی کشش کے علاوہ عشق کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ''خون جگر ہونے تک'' میں حسن و عشق کی ان ہی گونا گوں رعنائیوں اور تابانیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کی گئی ہیں۔ اگر ناول پڑھتے وقت جنسی کشش کی کمی محسوس نہ گئی تو افسانوی ادب کے حق میں یہ ایک فال نیک ہوگی۔

مذہب کا موضوع خشک بھی ہے اور اس زمانے میں صدائے بے ہنگام بھی، لیکن کیا کیا جائے کہ بنگال کے مسلمانوں کی زندگی میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اشتراکیت بھی نوجوان طبقے میں پھیل رہی ہے اور گاؤں کی زندگی پر اثر انداز ہونے لگی ہے۔ مذہب سے بھی اس کی جھڑپیں شروع ہوگئی ہیں۔ اشتراکیت کی اصل نوعیت کیا ہے وہ کیوں اور کس طرح پھیل رہی ہے، لوگوں پر کیا اثر ہو رہا ہے، وہ اپنی اپنی فہم و فراست کے مطابق کیا سمجھ رہے ہیں، کیا سوچ رہے ہیں، کیا جواب دے رہے ہیں، یہ سوالات دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ نہ محض گھوڑا مارا کے لیے، بلکہ تمام وملت کے لیے بھی۔ سیاسی و مذہبی مباحث سے بھی لوگوں کو بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ گاؤں گاؤں بلکہ گھر گھر ذرا سی بات پر مباحثے اور مناظرے ہوا کرتے ہیں۔ مسلم لیگ بھی اس زمانے میں لوگون کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور سماجی زندگی میں اس کا بڑا عمل دخل تھا۔ ان مسائل سے چشم پوشی حقائق سے فرار کے مترادف ہوتی اور تصویر نامکمل رہ جاتی۔ مصنف کی یہ کوشش رہی ہے کہ جس طرح یہ مسائل بیان کی زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں (یا تھے) اسی طرح وہ اس ناول کے بھی بن جائیں۔ جہاں تک مکالموں کا تعلق ہے جو اردو میں ہوئے وہ مقامی روزمرہ میں لکھے گئے ہیں اور جو بنگلہ میں ہوئے انھیں عموماً صحیح اردو میں لکھا گیا ہے۔ البتہ جس طبقے کا کوئی کردار ہے اسی طبقے کی مناسبت سے اردو روزمرہ استعمال کیا گیا ہے۔

قحط بنگال میں دبے پاؤں آیا، اس طرح کہ پتا ہی نہ چلا۔ زندگی کی چہل پہل، لہر بہر جاری رہی، مگر رفتہ رفتہ قہقہوں میں کھوکھلا پن پیدا ہونے لگا۔ خوشی کے آنسو غم کے آنسو بننے لگے۔ زندگی کا بازار سرد پڑنے لگا۔ موت کا بازار گرم ہونے لگا۔ قحط، قحط کی بھیانک صدائیں کانوں میں

آنے لگیں۔ کانوں میں تیل ڈالنے کی کوشش کی گئی، لیکن یہ تیل بھی لودینے لگا۔ بالآخر ماننا پڑا کہ بنگال میں واقعی قحط پڑا ہے۔ ''خون جگر ہونے تک'' میں یہی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی جو کارکنانِ قضاوقدر نے خود استعمال کی تھی۔

ضلع کے انتظامی امور میں کلکٹر کو جو اہمیت حاصل ہے، قحط کے انتظامات میں اس کی مرکزی حیثیت تھی۔ قصے کی تشکیل جس طرح ہوئی تھی اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ مجید صاحب کو ایک بڑے فرض شناس اور دل سوز افسر کی حیثیت سے پیش کیا جائے، لیکن پرانے آئی سی ایس افسروں کا جو نقشہ عام طور سے ذہن میں ہے وہ مجید صاحب کے کردار سے مختلف ہے لہٰذا مسٹر جازایلی اس طبقے کے مغرب زدہ حصے کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں اور قصے میں ایک خاص قسم کا تنوع پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں کلکٹر قصے کے اہم اجزا ہیں۔ وہ نہ محض قصے کو آگے بڑھاتے ہیں، بلکہ مختلف کرداروں (خاص طور سے جمعدار صاحب اور پنیر میاں) کو اجاگر کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔

مصنف کو غزل خاص طور سے محبوب ہے، اتنی کہ اس نے ناول میں بھی غزل کی تکنیک استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں متداولہ شرح و بست کو نظر انداز کر کے غزل کے ایجاز، اختصار، اشاریت اور ایمائیت سے کام لیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی جو بیان کیے گئے ہیں، ان کا قصے سے گہرا تعلق رکھا گیا ہے۔ اکثر جزئیات کی تفصیل پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ اسی لیے شاید اس ناول میں بھی غزل کے اشعار کی طرح معنی کی تہیں نظر آئیں۔ اگر مصنف یہ طریقہ کار اختیار نہ کرتا تو ناول کی ضخامت دُگنی تگنی ہو جاتی۔

مصنف کو بنگال اور بنگال کے لوگوں سے جو محبت ہے اس کے احترام کے طور پر اس نے ان کی زندگی پیش کرتے وقت اپنے غبار سے حتیٰ الامکان اس کے دامن کو ملوث ہونے نہیں دیا

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مصنف نے قصے کی ترتیب، تکنیک، اسلوب، زبان و بیاں میں چند نئے تجربے کیے ہیں۔

حسن بیاں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب معانی الفاظ میں نئی جان ڈال دیں۔ یعنی جب معانی کے انفاس گرم میں وہ حدت ہو کہ الفاظ لو دینے لگیں، جب چراغاں کا عالم ہو جائے۔ لیکن اس سے بھی بلند مقام وہ ہے کہ الفاظ معانی میں جان ڈال دیں۔ چراغ کی روشنی سے روغن بھی روشن ہو جائے۔ جب اس کی روشنی صرف نگاہوں ہی کو خیرہ نہ کرے، بلکہ دل و دماغ میں بھی چراغاں کر دے۔ ایسا چراغاں جو قلب کو گرمائے جو روح کو تڑپائے، بقول حضرت اکبر۔

ڈال دے جان معانی میں وہ اردو یہ ہے
کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے

مصنف کے پیش نظر یہی معیار رہا ہے۔ ''خون جگر ہونے تک'' کس حد تک اس معیار پر پورا اترا ہے، اس کا فیصلہ اہلِ نظر کے ہاتھ ہے۔

شکریہ۔ سب سے پہلے اس کا جس نے مصنف سے یہ ناول لکھوا۔ **علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم.** اس کے بعد لطیف مرحوم (سابق ڈی پی آئی سرحد) کا جنھوں نے اس ناول کو بین الاقوامی ادب میں بار پانے کا مستحق سمجھا اور کسیلنس جیسے صف اوّل کے ناشر سے اس کی اشاعت کا انتظام کرایا۔ اردو ادب کی نشر و اشاعت میں یہ اقدام دور رس اہمیت کا حامل ہے۔ شکریہ نسیم الظفر صاحب کا جنھوں نے نہ محض مسودے کو بڑی توجہ سے پڑھا، بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی مصنف کو مستفید کیا۔ یوسف ظفر صاحب نے جس خلوص، محبت اور محنت سے مسودے کو بار بار پڑھا اور اس کی کتابت اور تصحیح کا انتظام اپنی ذاتی نگرانی میں کیا اس کا مصنف شکریہ ادا ہی نہیں کر سکتا۔

جلال الدین احمد صاحب نے کتابت شدہ اوراق پر آخری بار نظر ڈالنے کی زحمت اٹھائی جس کی وجہ سے باقی ماندہ غلطیوں کی بھی تصحیح ہو سکی۔ مصنف ان کا بھی بہت شکر گزار ہے۔

☯......☯

راشد اشرف کی کتابوں کی تفصیل

نمبر شمار	کتاب کا نام	ناشر	قیمت
1	ابن صفی۔ شخصیت اور فن	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	790
2	حیرت کدہ، جلد اول (خودنوشتوں سے ماورائے عقل واقعات)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
3	گلدستۂ شاہد احمد دہلوی (خاکے، مضامین)	فضلی سنز، کراچی	600
4	دل ہی تو ہے (خودنوشتوں سے رومانی واقعات)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	590
5.	اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے (جلد اول)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	790
6	اردو کے نادر و کمیاب شخصی خاکے (جلد دوم)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	790
7	مختصر سفرنامے اور رپورتاژ (رسائل و جرائد سے)	فضلی سنز، کراچی	600
8	مولانا عبدالسلام نیازی۔ یادیں اور باتیں	فضلی سنز، کراچی	400
9	ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا (خاکے)	فضلی سنز، کراچی	500
10	طرز بیاں اور (خودنوشتوں پر تبصرے، مقالے)	فضلی سنز، کراچی	500
11	چراغ حسن حسرت: ہم تم کو نہیں بھولے (خاکے)	فضلی سنز، کراچی	400
12	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں۔ جلد اول	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
13	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد دوم	فضلی سنز، کراچی	500
14	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد سوم	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
15	شکاریات کی ناقابل فراموش داستانیں، جلد چہارم	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690
16	ماضی کے جھروکوں سے (تقسیم سے قبل تا سنہ ساٹھ کی دہائی کے رسائل و جرائد سے دلچسپ تحریروں کا مجموعہ)	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	500
17	حیرت کدہ (جلد دوم)، ماورائے عقل واقعات	اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی	690

زندہ کتابیں سلسلہ

نمبر	کتاب کا نام	قیمت
1	بزمِ داغ (داغ دہلوی سے متعلق یادداشتیں)، احسن مارہروی ورفیق مارہروی	300
2اور3	لندن سے آداب عرض/ دیس سے باہر، آغا محمد اشرف، (ایک جلد میں)	400
4	موسیقارِ اعظم نوشاد کی از حد دلچسپ خودنوشت	480
5	یارانِ نجد (شخصی خاکے)، مقبول جہانگیر	380
6	کیا قافلہ جاتا ہے (شخصی خاکے)، نصراللہ خاں، تیسرا ایڈیشن	500
7	بھوپت ڈاکو کی سوانح عمری	400
8	ملا واحدی معاصرین کی نظر میں (غیر مطبوعہ خاکے ومتفرقات)	400
9	چراغ حسن حسرت: ہم تم کو نہیں بھولے (تیسرا ایڈیشن)، راشد اشرف	400
10	ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا (تیسرا ایڈیشن)، راشد اشرف	500
11.	طرز بیاں اور (خودنوشتوں پر تبصرے، مقالے)، راشد اشرف، تیسرا ایڈیشن	500
12	سفر امریکہ کی ڈائری، اختر حمید خان	380
13	یادوں کا سفر (خودنوشت)، اخلاق احمد دہلوی	640
14	کوچہ قاتل (خودنوشت)، رام لعل	500
15	چاند چہرے (فلمی مضامین)، علی سفیان آفاقی	550
16	سنگ دوست (یادگار شخصی خاکے)، اے حمید	720
17اور 18	یادیں اور خاکے/ ان کہی کہانیاں، عام انسانوں کے دلدوز شخصی خاکے، سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ (ایک جلد میں)	400
19اور 20	دھندلے سائے/ اک بستی بستی روشن تھی، ناقابل فراموش خاکے اور یادداشتیں، ایم اے عثمانی۔ (ایک جلد میں)	500
21	مشاہدات (خودنوشت)، نواب ہوش یار جنگ (نظام دکن کے مصاحب)	600
22	پیر سابرمتی (گاندھی کی سوانح عمری)، اندولال کنہیالال یاجنک، (مترجم: ظفر احمد انصاری)، اشاعت ثانی۔	500

23اور 24 یہ پری چہرہ لوگ/ دلیپ کمار کے رومان (ایک جلد میں)، شوکت ہاشمی رجعفر منصور۔ 500

25 سحر ہونے تک (خودنوشت)، آغا جانی کاشمیری (انڈین فلم اسٹوری رائیٹر) 450

26 سفرنامۂ ہند (تاریخی ومعلوماتی سفرنامہ)، پروفیسر محمد اسلم 400

27اور 28 ترقی پسند تحریک اور بمبئی/ انگارے: ایک جائزہ، مرتبہ: پروفیسر صاحب علی/ شبانہ محمود، (ایک جلد میں)۔ 600

29اور 30 یادوں کے گلاب/ ڈربے، (سوانحی مضامین رسوانحی ناول)، اے حمید، (ایک جلد میں) 600

31 دریچوں میں رکھے چراغ (خاکے)، رام لعل 500

32 گورنر جنرل ہاؤس سے آرمی ہاؤس تک (یادداشتیں)، فخر عالم زبیری 450

33 اور 34 بھولی ہوئی کہانیاں/ ہفت محفل (یادداشتیں)، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، (ایک جلد میں) 400

35 ٹنڈوآدم سے کراچی (آپ بیتی)، ڈاکٹر رضوان اللہ خان 450

36 یادوں کی دستک (آپ بیتی)، صوفیہ انجم تاج 500

37 اور 38 آدمی غنیمت ہے/ آدمی آدمی انتر (شخصی خاکے وتذکرے)، انیس شاہ جیلانی (ایک جلد میں) 500

40،39 اور 41 اور پھر بیاں اپنا، پھر وہی بیاں اپنا، میرا بیان (خاکے)، اخلاق احمد دہلوی، (ایک جلد میں) 500

42 آہنگ بازگشت (خودنوشت)، مولوی محمد سعید (پاکستان ٹائمز) 500

43 جالب جالب (یادداشت)، مجاہد بریلوی 300

44 امرتسر کی یادیں (یادداشت)، اے حمید 580

46،45 اور 47 یادیں کچھ کرداروں کی/ یہ باتیں ہیں جب کی/ سبزۂ بیگانہ... (یادداشت ریادداشت رسوانحی مضامین)، (ایک جلد میں) 500

48 کارپٹ صاحب (جم کوربٹ کی سوانح عمری)، ترجمہ نگار: مسز رابعہ سلیم 690

49 شکار اور آسیب (شکاریات کی کہانیوں کے تراجم)، سید حشمت سہیل 300

The Original Development of Persian Ghaza

507/3, Temple Road, Urdu Bazar, Karachi
Ph: 009221-32633887-Email: fazleebook@gmail.com
fazleebooks/?ref=bookmarks
www.fazleebooks.com